لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا
منہجِ انقلابِ نبویؐ
سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اجمالی مطالعہ
فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے
ڈاکٹر اسرار احمد

مِنہجِ انقلابِ نبویؐ

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اجمالی مطالعہ
فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

●

ڈاکٹر اسرار احمد
کے دس خطباتِ جمعہ

— مرتبہ —

شیخ جمیل الرحمٰن

67 اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور فون 6316638-6366638
فیکس: 6271241، ای میل markaz@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ (برطبع ہشتم)

"منہج انقلابِ نبویؐ" کا یہ تازہ ایڈیشن بہت سی امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ جدید کمپیوٹر کمپوزنگ اور دیدہ زیب رنگین سرورق کے اضافے سے جہاں اس کے حسن ظاہری میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے وہاں بعض اعتبارات سے اس کے معنوی حسن میں اضافے کی بھی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

یہ کتاب چونکہ اصلاً امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے کم و بیش گیارہ خطابات کا مجموعہ ہے اور محترم ڈاکٹر صاحب کا معمول یہ ہے کہ وہ ہر خطاب کے آغاز میں مضمون کے تسلسل اور ربط کو قائم کرنے کی خاطر سابقہ خطابات کے مضامین کا اجمالاً اعادہ بھی بیان فرماتے ہیں' چنانچہ اس تکرار کے نتیجے میں خطاب کی طوالت بڑھ جاتی ہے۔ کتاب کے سابقہ ایڈیشنز میں ان خطابات کو تکرار و اعادہ سمیت شائع کیا جاتا رہا ہے جس کا ذکر صاحب کتاب نے اپنے "مقدمہ" میں بھی فرمایا ہے ___ کتاب کے زیر نظر ایڈیشن میں ان خطابات کی از سر نو ایڈیٹنگ کرتے ہوئے ان مکررات اور زوائد کو حتی الامکان حذف کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو تقریر کا تو شاید حسن شمار ہوتے ہوں لیکن تحریر میں ان کی موجودگی قارئین کی طبیعت کو مکدر کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کرتے کہ اب اس پہلو سے یہ کتاب خامیوں سے مکمل طور پر پاک ہو چکی ہے' لیکن یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ پہلے کے مقابلے میں اب یقیناً یہ بہتر صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

حافظ عاکف سعید
ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن
۱۹/ مارچ ۱۹۹۹ء

نام کتاب ___ منہج انقلابِ نبوی ﷺ
طبع اوّل (مارچ 2008ء) ___ 1100
ناشر ___ شعبہ تنظیم اسلامی پاکستان
مطبع ___ آئیڈیل پرنٹنگ پریس' لاہور
مقامِ اشاعت ___ 67 ۔ اے' علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو لاہور

طبع اول

○

پیشِ نظر کتاب نہ باضابطہ تصنیف ہے نہ تالیف۔
بلکہ دس تقریروں کا مجموعہ ہے جو کیسٹ کی رِیل سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے تقریباً جُوں کی تُوں اوّلاً ماہنامہ 'میثاق' میں شائع ہوئیں اور اب کتابی صورت میں پیشِ خدمت ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تحریر کی زبان اور ہوتی ہے اور تقریر کی اور!
اور تحریر کا اسلوب جُدا ہوتا ہے اور تقریر کا جُدا۔
پھر یہ تقریریں بھی اجتماعاتِ جمعہ میں کی گئی تھیں:
جن میں ایک ہفتہ کا فصل تو لازماً ہوتا ہی ہے ـــــ بعض اوقات دوسرے فوری اہمیت کے حامل موضوعات کے باعث یہ وقفہ زیادہ بھی ہوتا رہا۔
پھر اجتماعِ جمعہ میں ع "بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی!" کے مطابق ہر ذہنی سطح اور نہایت مختلف و متفاوت استعدادات کے حامل لوگ موجود ہوتے ہیں۔
مزید برآں، ہر جمعہ میں کچھ نہ کچھ سامعین بالکل نئے بھی ہوتے ہیں۔
لہٰذا، ان تقریروں میں تکرار و اعادہ بے حد ہے ـــــ جو ایک باذوق قاری پر لازماً بہت گراں گزرے گا!
اِن اسباب کی بنا پر اس کتاب میں نہ تصنیفی حسن نظر آسکتا ہے نہ حُسنِ ترتیب۔

○

البتہ ع "ربطِ محکم اسی بے ربطیٔ تقریر میں ہے!" کے مصداق ان تقاریر میں ایک مقصدی ربط بھی موجود ہے، اور معنوی تسلسل بھی!

اور اگر اس کتاب میں افادیت کا کوئی پہلو موجود ہے ـــــ تو ان شاء اللہ اس کے متذکرہ بالا نقائص ہی کی بنا پر اس کے افادہ کا حلقہ عوامی سطح پر وسیع تر ہو جائے گا! ـــــــــــــ واللہ اعلم!!

○

پہلی تقریر میں یہ ذکر موجود ہے کہ ان تقاریر سے متصلاً قبل ان ہی اجتماعاتِ جمعہ میں انقلابِ ایران پر تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔
اور یہ بھی کہ خود اس سلسلۂ تقاریر میں گفتگو کو تین حصوں میں مکمل ہونا تھا:
ایک[1]: سیرت النبیؐ سے ماخوذ لیکن تجریدی اور عمومی انداز میں مراحلِ انقلاب کی تعیین۔
دوسرے[2]: سیرت النبیؐ کا مختصر بیان ان مراحلِ انقلاب کی توضیح و تفصیل کے نقطۂ نظر سے، اور
تیسرے[3]: موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کے ضمن میں ضروری اجتہاد!
پیش نظر کتاب میں صرف پہلے دو حصوں کی حد تک گفتگو مکمل ہو سکی ہے۔
تیسرا حصہ ان تقاریر کے بعد چار خطاباتِ جمعہ میں بیان ہوا تھا[1]
اللہ نے چاہا تو وہ بھی جلد ہی ہدیۂ قارئین کر دیا جائے گا۔

فاللّٰہ ھو الموفق والمستعان!

"پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا، اور کیسے؟" کے عنوان سے ایک باضابطہ تالیف کا ارادہ بھی کافی عرصے سے ہے۔ اس کا پہلا باب ضبط تحریر میں آ کر روزنامہ "جنگ" اور ماہنامہ 'میثاق' میں شائع بھی ہو چکا ہے! ـ
قارئین سے استدعا ہے کہ دعا فرمائیں کہ اللہ اس کام کو جلد مکمل کرا دے۔

خاکسار
اسرار احمد عفی عنہ

لاھور ۸ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ

(ا) ان میں سے دو خطابات کی تلخیص طبع دوم میں بطور ضمیمہ شامل کی جا رہی ہے۔

فہرست

خطابِ اوّل

جمعہ ۵ ر اکتوبر ۸۴ء

✸

تمہیدی مباحث

★

انقلابی جدّوجہد کے لوازم و مراحل

✸

انقلابِ نبویؐ کے پہلے دو مرحلے:

دعوت اور تنظیم

- چار تمہیدی باتیں
- بحث و تمحیص کے تین مرحلے
- انقلابی جدّوجہد کے لوازم و مراحل
  - پہلا مرحلہ : انقلابی نظریہ اور اس کی اشاعت
  - دوسرا مرحلہ : انقلابی جماعت کی تشکیل و تنظیم
  - تیسرا مرحلہ : ٹریننگ اور تربیت
- انقلابی عمل کا جزو لاینفک : تصادم
  - چوتھا مرحلہ : تشدّد و تعذیب کے جواب میں صبر محض
  - پانچواں مرحلہ : اقدام اور چیلنج
  - چھٹا مرحلہ : مسلّح تصادم
- انقلاب کی توسیع و تصدیر
- کامل انقلاب کی واحد مثال : انقلابِ محمدیؐ
- انقلابِ نبویؐ کا اساسی نظریہ : توحید
  - انسانی حاکمیت کی بجائے خلافت
  - ملکیت کی بجائے امانت
  - کامل معاشرتی مساوات
- اسلامی انقلابی تنظیم کی اساس اور اس کا مزاج

خطبۂ مسنونہ ' تلاوتِ آیاتِ قرآنی ' احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

دُنیا کے دوسرے انقلابات سے انقلابِ محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوۃ والسلام) اس اعتبار سے بنیادی طور پر مختلف ہے کہ دوسرے دُنیوی انقلابات کے نظریات انسانوں کے ذہن کی پیداوار تھے ـــــ بالشویک یعنی اشتراکی انقلاب کا فلسفہ کارل مارکس کے ذہن کی اختراع تھا۔ اسی طرح انقلابِ فرانس کا فلسفہ والٹیر' روسو اور بہت سے مفکرین کے ذہنوں کی پیداوار تھا۔ مگر اسلامی انقلاب کا فلسفہ اللہ تعالیٰ کا ودیعت کردہ ہے جو وحی کے ذریعہ سے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوا۔ لہٰذا اس نظریہ کی نشر واشاعت کے معنی ہیں قرآن حکیم کی نشرواشاعت ' اس کی تبلیغ' اس کے ذریعہ سے دعوت ' اس کے ذریعہ سے تبشیر وانذار اور اس کے ذریعہ سے تذکیرو نصیحت۔ گویا نبی اکرم ﷺ کا آلۂ انقلاب اور ذریعۂ انقلاب قرآنِ حکیم تھا۔ علاوہ ازیں قرآن انسان کے لئے جو ہدایت لے کر آیا ہے اس میں یقیناً انفرادی زندگی کے لئے بھی راہنمائی ہے اور اجتماعی زندگی کے لئے بھی۔ قرآن کے موضوعات انفرادی اعمال و افعال کو بھی محیط ہیں اور اجتماعی اقدار کو بھی۔ لیکن انقلابی عمل کے لئے قرآن کے اس حصہ کو نمایاں کرنا ہو گا جس کا تعلق اجتماعی نظام کے ساتھ ہے۔

پاکستان میں اسلامی انقلاب کی ضرورت واہمیت اور طریق کار

پاکستان میں اسلامی انقلاب کے ذکر سے پہلے چند تمہیدی باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ کہ پاکستان کی بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے۔ ہمارے پاس اسلام کے سوا اس ملک کی بقا اور استحکام کے لئے کوئی اور بنیاد

سرے سے موجود نہیں ہے ــــ اب یہ بات خود ایک مستقل موضوع ہے کہ تحریک پاکستان کا پس منظر کیا تھا! یہ ملک بنا کیوں تھا! اس کے محرکات اور عوامل کیا تھے! اس کی اساسات کیا ہیں! ــــ پھر یہ کہ مختلف ممالک کے استحکام اور بقا کے لئے کون کون سے عوامل سہارا دیتے ہیں اور اس کی تقویت کا باعث بنتے ہیں! ان میں سے ایک ایک عامل کا جائزہ لے کر یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ دُنیا کے عام ممالک کو اپنے استحکام اور بقا کے لئے جو سہارے دستیاب ہوتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو واحد سہارا ہے وہ ہمارا دین ہے۔ ہمارے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ؏ کافر نتوانی شُد ناچار مسلماں شو۔ ہم کافر ہو ہی نہیں سکتے، ہمیں تو لامحالہ مسلمان ہونا پڑے گا۔[1]

دوسری بات بھی، جو اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے، یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام نہ انتخابی طریق سے آسکتا ہے اور نہ اس "ضیائی طریق" سے آسکتا ہے جو سوا سات سال سے ہمارے ملک میں چل رہا ہے[2] اس کیلئے واحد راستہ انقلاب کا راستہ ہے۔ اب اس کیلئے بھی دلائل و شواہد چاہئیں۔ انتخابات میں بھی بعض لوگ اسلامی نظام کے قیام کیلئے نیک نیتی سے حصہ لیتے ہیں کہ اس طریق سے اسلام کی سربلندی کے لئے کام کریں۔ انتخابات میں حصہ لینے والوں میں یقیناً ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی اصل غرض حصولِ اقتدار ہو گی، لیکن یقیناً ایسے لوگ بھی ہوں گے جو نہایت خلوص کے ساتھ اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی انتخابی طریق کار پر عمل پیرا رہے ہیں اور رہیں گے۔ لیکن مجھے قوی اور مستحکم دلائل کی بنیاد پر اس سے شدید اختلاف ہے۔ میرے نزدیک پاکستان میں اسلام اگر آ سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف انقلابی عمل کے ذریعے سے ہی آسکتا ہے۔

---

(۱) الحمدللہ کہ اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی مفصل تصنیف "استحکامِ پاکستان" کے عنوان سے موجود ہے۔ (مرتب)

(۲) واضح رہے کہ یہ تقریر ۵/ اکتوبر ۸۴ء کو کی گئی تھی۔

تیسری بات یہ کہ جب پاکستان کی غالب آبادی سُنّی ہے تو ظاہر بات ہے کہ یہاں جو بھی انقلاب آئے گا اور اس کے نتیجہ میں یہاں جو بھی نظام قائم ہو گا وہ سنی تصورِ خلافتِ عامّہ پر مبنی ہو گا نہ کہ شیعی تصورِ امامتِ معصومہ پر ــــ یہ دونوں تصورات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان کو باہم دگر کسی طور پر بھی ملایا نہیں جا سکتا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ وہ انقلاب اگر آئے گا تو خالصتاً اس نہج پر آئے گا کہ جس نہج پر محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے انقلاب بپا کیا تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہے کہ : "لَا یَصْلُحُ آخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا" یعنی "اس اُمت کے آخری حصہ کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر صرف اس طریق پر کہ جس پر اس کے پہلے حصہ کی اصلاح ہوئی تھی" ــــ اس قول کے متعلق میرا تأثر اتنا یقینی ہے جتنا اس پر کہ کل سورج طلوع ہو گا۔ پھر یہ کہ اس کارگاہِ عالم کی زندگی کا آخری دور شروع ہو چکا ہے۔ حالات اس رخ پر جا رہے ہیں جن کی خبر نبی اکرم ﷺ نے دی تھی۔

پانچویں بات یہ کہ آخری دور میں اسلام کے عالمی غلبہ کی جو خبر الصادق و المصدوق ﷺ نے دی تھی' اس کا بھی عمل یقیناً شروع ہو گا۔ البتہ یہ کہاں سے شروع ہو گا اور کس خِطۂ ارضی کو یہ سعادت نصیب ہو گی! یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مکہ سے مایوس ہو کر نبی اکرم ﷺ نے اپنے طور پر طائف کا انتخاب فرمایا تھا' لیکن طائف میں جو کچھ حضور ﷺ کے ساتھ ہوا وہ کون نہیں جانتا۔ یومِ طائف کو نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ کا سخت ترین دن قرار دیا تھا۔ وہاں سے آپؐ کو ناکام واپس آنا پڑا ــــ لیکن اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا مدینہ منورہ کا۔ حضور ﷺ کے قدم مبارک وہاں پہنچے بھی نہیں کہ وہاں انقلاب آ گیا۔ تمہید اً چھ افراد حج کے موقع پر ایمان لائے۔ اگلے سال ان میں سے پانچ اور سات دوسرے افراد یعنی کُل بارہ افراد حاضر خدمت ہو گئے۔ انہوںؓ نے نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ــــ جسے کتبِ سیرتِ مطہّرہ میں بیعتِ عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے

—— اور درخواست کی کہ ہمیں اپنا کوئی جان نثار شاگرد دیجئے جو ہمیں قرآن پڑھائے اور یثرب میں (جو مدینہ منورہ کا پہلا نام ہے) دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے۔ لہٰذا حضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ حضرت مصعبؓ کی ایک سال کی تعلیم قرآن اور دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں اگلے سال بہتر (۷۲) مرد اور تین خواتین کل پچھتر (۷۵) افراد نے آکر نبی اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور یہ بیعت ہجرت کی تمہید بن گئی۔ اسے بیعتِ عقبہ ثانیہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان پچھتر انصار رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ حضور ﷺ آپؐ ہمارے یہاں تشریف لائیے۔ اگر قریش یثرب پر حملہ آور ہوں گے تو ہم آپؐ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔ بعدہ جب حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں استقبال کی تیاریاں تھیں۔ کئی دن سے لوگ روزانہ شہر سے باہر آکر آپؐ کی تشریف آوری کے منتظر رہتے تھے۔ یہاں مکہ میں قریش خون کے پیاسے ہیں جہاں تیرہ برس حضور ﷺ نے بنفسِ نفیس دعوت دی۔ یہاں تو نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تین دن رات غارِ ثور میں روپوش رہنا پڑا۔ پھر یہ کہ تعاقب ہو رہا تھا۔ سراقہ بن مالک جو بعد میں دولتِ ایمان سے بہرہ مند ہو گئے دو مرتبہ قریب پہنچ گئے اور اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر حفاظت فرمائی۔ مکہ کا حال تو یہ ہے اور اہل مدینہ سراپا انتظار آپؐ کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں اور آپؐ کا وہاں ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے داخلہ ہو رہا ہے۔

تو یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرت میں ہے کہ وہ کس جگہ کو سعادت عطا فرمائے، کون سے مقام کو چن لے۔ یہ اسی کا انتخاب ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور عالمی سطح پر دین حق کے غلبہ کا آغاز کس ملک سے ہوگا! لیکن یہ بات پورے یقین و وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آخری دور کے بارے میں جن واقعات و حالات کی خبریں احادیثِ صحیحہ میں دی گئی ہیں، وہ دور آچکا ہے، اس کا آغاز ہو گیا ہے۔ کسی نہ کسی خطۂ ارضی کو یہ سعادت حاصل ہو کر رہے گی کہ اسے اللہ تعالیٰ

صحیح اسلامی انقلاب کے لئے منتخب فرمالے ـــــ اور یہ انقلاب بالکل اسی نہج پر آئے گا جس نہج پر برپا فرمایا تھا محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں اسی نہج پر انقلاب آئے گا جو عالمی سطح پر غلبۂ دین کی تمہید بنے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ پاکستان کا یہ خطۂ ارضی' جو حقیقت کے اعتبار سے مملکت خداداد ہے' یہ ہمارے قوتِ بازو اور ہماری جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہے' اسے اللہ تعالیٰ اس سعادت کے لئے قبول فرمالے۔ بظاہر احوال تو مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیرے سامنے آتے ہیں' پھر اُمید بندھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے۔ اس کی شانِ والاتبار یہ ہے: ﴿ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ﴾ اسے ہر شے پر قدرت حاصل ہے' وہ شر سے خیر برآمد کرتا ہے جس کا کہیں سان گمان تک نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل اور قدرت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم معروضی طور پر (objectively) غور کریں اور سمجھیں کہ انقلاب کا "محمدیؐ طریق" ہے کیا؟

بحث و تمحیص کے تین حصے

ایک بات تو بالکل آغاز ہی میں سیرتُ النّبی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کے واقعات و حالات کے حوالوں اور references کے بغیر اصولی طور پر جان لینی چاہئے کہ انقلاب کسی بھی نوع کا ہو اس کے لئے چھ مراحل طے کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ بات سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعے سے حددرجہ واضح ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ سیرتِ مطہرہ کے دوران جو حالات و واقعات پیش آئے انہیں خاص سے عام کر کے یعنی generalize کر کے جو اصول و مبادی مستنبط ہوتے ہیں ان کی روشنی میں انقلابی عمل کے مراحل و مدارج اور لوازم طے کئے جائیں گے۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ اس مستنبط خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے ہمیں

سیرتِ مبارکہ ؐ سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ کیا ہے؟

اور تیسری بات جو عملی اعتبار سے بہت ضروری ہے' یہ ہوگی کہ ہمارے حالات اور نبی اکرم ﷺ کے دورِ سعید کے حالات میں بہرحال چودہ سو برس سے کچھ زیادہ ہی مدت کا فصل ہے۔ اس دوران حالات میں بہت کچھ تغیّر و تبدّل ہوا ہے اور انسان کے تمدنی و عمرانی تصورات میں بہت کچھ ارتقاء ہوا ہے۔ پھر ایک نمایاں ترین فرق یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا پورا انقلابی عمل ایک خالص مشرکانہ و کافرانہ ماحول میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا جبکہ ہمیں اسلامی انقلاب کے لئے جو کام کرنا ہے وہ مسلمانوں میں کرنا ہے' کافروں میں نہیں۔ لہٰذا ان حالات کی بنا پر ہمیں غور کرنا ہوگا کہ جو طریق کار ہمیں سیرت النبی ﷺ میں ملتا ہے آیا بعینہٖ وہی اختیار کرنا لازم ہے یا اس طریق کار میں ہمیں درپیش حالات کے فرق و تفاوت کی وجہ سے کہیں کچھ اجتہاد کرنا ہوگا!

انقلابی عمل کے لوازم و مراحل

موجودہ دَور میں انسانی زندگی کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے' ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی ـــــ مذہب کا تعلق انفرادی زندگی سے سمجھا جاتا ہے اور اجتماعیت کے لئے بنیاد ہے سیکولرازم (Secularism) یعنی لادینیت ـــــ لامذہبیت نہیں۔ اس لئے کہ سیکولرازم مذہب کو تسلیم کرتا ہے لیکن اسے صرف انفرادی زندگی میں محدود قرار دیتا ہے۔ اس انفرادی مذہبی زندگی کے بھی تین حصے ہیں : عقیدہ (Dogma)' عبادات (Rituals)' اور چند سماجی رسوم (Social Customs) ـــــ ادھر اجتماعی زندگی کے بھی تین حصے ہیں۔ معاشرتی نظام' معاشی نظام اور سیاسی نظام۔ گویا تین گوشے انفرادی زندگی کے اور تین گوشے اجتماعی زندگی کے ملا کر کل "چھ" گوشے ہو گئے۔ اسی طرح انقلابی عمل کو بھی چھ مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔

۱) انقلابی نظریہ اور اس کی اشاعت

انقلابی عمل کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کوئی انقلابی نظریہ' کوئی انقلابی فکر' کوئی انقلابی فلسفہ موجود ہو جس کی خوب نشرواشاعت کی جائے۔ ظاہربات ہے کہ انقلاب کسی انقلابی نظریہ کی بنیاد پر آتا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز (Starting Point) یہ ہے کہ اس نظریہ کی نشرواشاعت کی جائے' اسے پھیلایا جائے' اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور لوگوں کو اس نظریہ کی افادیت کا دلائل سے قائل بنایا جائے۔ اس میں اہم بات یہ ہے کہ انقلاب تب ہی آئے گا جب انقلابی نظریہ اجتماعی زندگی کے ان تین گوشوں میں سے کسی ایک سے لازماً متعلق ہو جن کا اوپر ذکر ہوا ـــــ اگر مذہبی اصلاح کا کام ہو رہا ہو' عقائد کی تصحیح ہو رہی ہو' عبادات کی ادائیگی کی ترغیب و تشویق ہو رہی ہو اور اس کے نتیجہ میں ان کی ترویج ہو رہی ہو تو یہ مذہبی کام ہیں یا بالفاظِ دیگر روحانیت اور اخلاقی اصلاح کے کام ہیں' لیکن انقلابی عمل کا آغاز تو کسی ایسے نظریہ کی بنیاد پر ہو گا جس کا تعلق انسان کی معاشرتی' معاشی اور سیاسی زندگی سے ہو۔ اس لئے کہ درحقیقت انقلاب کا محل' مقام اور میدان اجتماعی زندگی کا دائرہ ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا نظریہ' کوئی ایسا فلسفہ' کوئی ایسا فکر ہو جو انسان کی اجتماعی زندگی کے کسی گوشے کے بارے میں انقلابی تبدیلی کا علمبردار ہو اور وہاں جو نظام قائم ہے وہ اس کی جڑوں پر تیشہ بن کر گرے۔ اسی سے انقلابی عمل کا آغاز ہو گا۔

۲) انقلابی جماعت کی تشکیل و تنظیم

انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ یہ ہو گا کہ جو لوگ اس انقلابی نظریہ کو ذہناً قبول کر لیں ان کو منظم کیا جائے۔ اس طرح ایک انقلابی جماعت وجود میں آئے۔ اس جماعت کے لئے دو چیزیں لازمی ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ اس کے Cadres' اس کی درجہ بندی بالکل نئی ہونی چاہئے۔ پرانے نظام کے تحت لوگوں کی جو درجہ بندی ہے

اگر وہی درجہ بندی اس جماعت کے اندر بھی رہے تو پھر وہ انقلابی جماعت نہیں ہوگی۔ یہاں تو بالکل نئی درجہ بندی ہوگی کہ کون کس قدر گہری وابستگی (Commitment) اس انقلابی نظریہ سے رکھتا ہے! کس نے اس انقلابی نظریہ کے تقاضوں کو خود اپنے آپ پر لازم کیا ہے! اور کون اس انقلابی نظریہ کے لئے کتنی قربانی دے چکا ہے اور کتنی مزید دینے کو تیار ہے! جس نے جتنی پیش قدمی کی ہے اتنا ہی وہ آگے چلا جائے گا چاہے سابقہ نظام میں وہ شودروں اور اچھوتوں میں شمار ہوتا ہو اور سب سے گھٹیا اور نیچ سمجھا جاتا ہو' اس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ لیکن اگر اس نے اس انقلابی نظریہ کو خلوص و اخلاص اور گہرائی کے ساتھ قبول کیا ہے' اس کے ساتھ اس کی مکمل ذہنی اور عملی وابستگی (Commitment) ہے' اس کے لئے وہ قربانیاں دے رہا ہے تو وہ توقیر و تکریم اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے پیدائشی برہمنوں سے کہیں آگے نکل جائے گا۔ اگر یہ بات نہیں ہوگی تو وہ جماعت انقلابی جماعت نہیں ہے۔

دوسری چیز یہ کہ اس پارٹی کا نظم (Discipline) اگر آرمی ڈسپلن جیسا نہ ہو تو یہ پارٹی انقلاب نہیں لا سکتی۔ کوئی ڈھیلی ڈھالی ایسوسی ایشن' کوئی انجمن ٹائپ کی شے' کوئی چار آنے کی ممبری والی جماعت یا کوئی ایسی ہیئتِ اجتماعیہ انقلاب نہیں لا سکتی۔ ہر اجتماعی کام کی نوعیت اور مقصد کے اعتبار سے اسی نوع کی انجمن یا ادارہ یا جماعت کی ضرورت ہے۔ کوئی اصلاحی کام کرنا ہے تو کوئی انجمن بنا لیجئے۔ کوئی تعلیمی کام کرنا ہے تو کوئی ادارہ قائم کر دیجئے۔ مذہبی دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ہے تو کوئی جمعیت بنا لیجئے۔ انتخابی سیاست کا کام کرنا ہے تو ممبری کی کوئی فیس مقرر کر کے بڑے پیمانے پر اپنے ہم خیال افراد کی ممبر سازی کر لیجئے ـــــــ ایک سیاسی جماعت بنا لیجئے۔ لیکن اگر انقلاب لانا ہے تو اس کے لئے ایسی "پارٹی" درکار ہوگی جس کے ایک تو Cadres بالکل نئے ہوں اور دوسرے اس کا ڈسپلن مضبوط ہو کہ جو حکم ملے مانا جائے۔ یہ نہیں ہوگا تو انقلاب نہیں آ سکتا۔ اس لئے کہ ایک جمے ہوئے نظام کو

اُکھاڑ پھینکنا ہے۔ ایک مضبوط طاقت کے ساتھ ٹکراؤ کا مرحلہ آتا ہے۔ اس میں ڈھیلی ڈھالی انجمن ٹائپ ایسو سی ایشن کام نہیں دے سکتی۔

۳) ٹریننگ اور تربیت

انقلابی عمل میں تیسرا مرحلہ ٹریننگ یعنی تربیت کا ہے ـــــ جو ہر انقلابی عمل کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر انقلابی کارکنوں کی تربیت نہ ہو تو وہ خام ہیں' کچے ہیں۔ تربیت ہو گی تو وہ پختہ ہوں گے' بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

تُو خاک میں مِل اور آگ میں جل جب خِشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

کچے اور خام لوگوں کو جمع کر لیں گے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگلے مرحلہ میں جا کر جواب دے جائیں گے۔ وہ خالی کارتوس ثابت ہوں گے اور پھُس ہو کر رہ جائیں گے۔ یہاں ضرورت ہے کہ ہر کارکن پختہ ہو۔ اس بات کو علامہ اقبال نے اپنے انداز میں خوب بیان کیا ہے ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو

یہی وجہ ہے کہ ہر انقلابی پارٹی کے Training Camps ہوتے ہیں۔

تاہم یہ بات اہم ہے کہ یہ تربیت انقلاب کے نظریہ اور فکر کی مناسبت سے ہو گی۔ اگر انقلاب خالص مادی اقدار والا ہے تو ان کارکنوں کی روحانی تربیت کرنا بیکار ہے۔ لیکن اگر پیش نظر ایسا انقلاب ہے جس کے اہم ترین اَبعاد (Dimensions) اخلاقی اور روحانی ہیں تو تربیت میں ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ چیزیں انقلابی کارکنوں میں نہیں ہوں گی تو انقلاب کے کامیاب ہونے کے نتیجہ میں کہاں سے آ جائیں گی؟ ـــــ لہٰذا ایسے انقلاب کے کارکنوں کے لئے اخلاقی و روحانی تربیت بھی لازمی ہو گی بلکہ اس کو اَقدمیت و اوّلیت کا درجہ

حاصل ہو گا۔

پس یہ ابتدائی تین مرحلے ہیں۔ ان تینوں کا حاصل یہ ہے کہ تربیت یافتہ کارکنوں پر مشتمل ایک انقلابی جماعت وجود میں آجائے جو ایک طاقت اور ایک قوت بن جائے!!

انقلابی عمل کا جزوِ لاینفک : تصادم

انقلابی عمل کے اگلے تین مرحلوں کا جامع عنوان ہے "تصادم" ــــ لفظ تصادم اگرچہ ناپسندیدہ ہے' اچھا نہیں لگتا اور امن پسند لوگ اس سے ناگواری محسوس کریں گے لیکن یہ بات طے ہے کہ انقلاب تصادم کے بغیر نہیں آتا۔ ؏ "جس کو ہو دین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟" مذہبی اصلاح کا کام کرنا ہو تو کسی تصادم کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف عام نوعیت کی روحانی تربیت گاہیں کھولنی ہوں اور خانقاہی نظام بنانا ہو تب بھی کسی تصادم کی ضرورت نہیں ہے' خانقاہ میں کوئی مربّی' کوئی شیخ بیٹھے ہیں' جو وہاں خود چل کر آئے گا اسے وہ اپنے تربیتی پروگرام میں شامل کرلیں گے' کوئی تصادم نہیں ہو گا۔ لیکن اگر نظام بدلنا مقصود و مطلوب ہو اور پھر تصادم سے بھی گریز ہو تو یہ ممکن نہیں۔ یہ تو بالکل ایسی بات ہے جیسے دو متضاد چیزوں کو جمع کرنے کی خواہش ہو ــــ یہ خواہش اپنی جگہ کتنی ہی اچھی ہو لیکن یہ محالِ مطلق ہے۔ تصادم تو انقلاب کے لوازم میں سے ہے۔

پھر یہ ایک بدیہی امر ہے کہ تصادم کا آغاز اصل میں انقلابی جماعت کرتی ہے۔ اس لئے کہ ایک جگہ ایک نظام قائم ہے۔ جیسا بھی ہے' وہ چل رہا ہے۔ اگر ظالمانہ' استبدادی اور استحصالی ہے تو مظلوم طبقات اس نظام کو برداشت اور تسلیم (Reconcile) کئے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں ایک جماعت ابھرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ نظام غلط ہے' ہم اس کو بدل کر رہیں گے' تو درحقیقت تصادم کا آغاز اس جماعت نے کیا۔ اس نے اس نظام کو غلط قرار دے کر اس کو بدلنے کے عزم کا اظہار

کیا جو وہاں ایک طویل عرصہ سے چلا آ رہا ہے' جس کے ساتھ لوگوں کی اقدار اور مفادات وابستہ ہیں' جو ان کے یہاں قابل احترام روایات کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ انقلابی جماعت کہتی ہے کہ یہ غلط نظام ہے۔ گویا کہ تصادم کا آغاز اصلاً انقلابی جماعت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اب اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے اس کے تین مدارج (Phases)ہیں۔

۴) تشدّد و تعذیب کے جواب میں صبرِ محض

تصادم کے عمل میں پہلا درجہ Passive Resistance یعنی صبرِ محض کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انقلابی جماعت اس نظام کو غلط و فاسد قرار دیتی ہے تو لوگ اس جماعت کو آزاد تو نہیں چھوڑ دیں گے! پہلے وہ اس کے انقلابی فکر اور نظریہ کو چٹکیوں میں اڑائیں گے۔ استہزاء و تمسخر کریں گے' فقرے چست کریں گے' مذاق اڑائیں گے' کہیں گے کہ ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے' دیوانے اور مجنون ہیں۔ لیکن اگر اس انقلابی جماعت کا قائد اور اس کے معدودے چند ساتھی اس وار کو جھیل جاتے ہیں اور نظریہ کی نشرواشاعت کا عمل جاری رہتا ہے اور لوگ اس کو قبول کر کے جماعت میں شامل ہو رہے ہیں تو مخالفین کو محسوس ہو گا کہ یہ ہوا کا کوئی معمولی جھونکا نہیں ہے' اس میں تو ایک زبردست آندھی اور طوفان کے آثار پوشیدہ ہیں' جو ہمارے تمام مفادات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائیں گے۔ لہٰذا اب وہ تشدد (Persecution) پر اتر آئیں گے اور عقوبت و ایذارسانی کی کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ یہ معاملہ پیش آنا لازمی ہے۔ لیکن اس دور کے لئے اس انقلابی جماعت کا پہلا مرحلہ یہ ہو گا کہ ماریں کھاؤ' لیکن نہ اپنے موقف سے ہٹو اور نہ ہی ہاتھ اُٹھاؤ۔ اس لئے کہ اگر اس جماعت نے بھی retaliate کیا یعنی بدلہ میں اس نے بھی ہاتھ اُٹھالیا اور وہ جماعت بھی violent ہو گئی' تو جو جما جمایا نظام ہے اسے اس جماعت کو کچلنے اور نیست و نابود کرنے کا قانونی و اخلاقی جواز مل جائے گا۔ چنانچہ

ان کو یہ جواز نہ دیا جائے۔ بے جواز ماریں اور پیٹیں' ایذا رسانی کرتے رہیں۔ لیکن ان کو یہ الزام لگانے کا موقع ہرگز نہیں ملنا چاہئے کہ یہ جماعت خود بھی متشدد ہے اور عوام الناس کو بھی تشدد اور بدامنی کے لئے ابھار رہی ہے۔

اس عدم تشدد کی پالیسی پر کاربند رہنے سے وہ لوگ ایذا رسانی اور مار پیٹ سے تو باز نہیں آئیں گے لیکن اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلے گا کہ اس معاشرہ کی خاموش اکثریت (Silent Majority) اس جماعت کے حق میں ہموار ہوتی چلی جائے گی۔ قدرتی طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال ہیجان پیدا کردے گا کہ آخر یہ لوگ کیوں پیٹے جا رہے ہیں! ان کو ایذائیں کیوں دی جا رہی ہیں! آخر ان کا جرم کیا ہے! کیا انہوں نے چوری کی ہے یا ڈاکہ ڈالا ہے یا کسی غیر اخلاقی حرکت کا ارتکاب کیا ہے؟ ___ یہ اکثریت ہمیشہ خاموش (Silent) ہوتی ہے لیکن اندھی اور بہری تو نہیں ہوتی! وہ دیکھتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے! اور اس کے قلوب و اذہان میں اس انقلابی جماعت کے لئے ہمدردی کے جذبات اور احساسات غیر محسوس طریق پر پروان چڑھتے رہتے ہیں ___ اور یہ چیز بھی درحقیقت اس انقلابی نظریہ اور فکر کے پھیلنے میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے لئے بڑا پیارا مصرع ہے کہ ؏ "جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ" ___ اندر اندر دل تو مفتوح ہو رہے ہیں' چاہے زبانیں خاموش ہیں' لوگوں میں جرأت نہیں کہ وہ سامنے آجائیں۔ لیکن وہ انقلابی نظریہ اور فکر لوگوں کے ذہن و قلب میں راسخ ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کے علمبرداروں کے لئے دلوں میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

۵) اِقدام اور چیلنج

اس کے بعد جب طاقت اتنی فراہم ہو جائے کہ وہ انقلابی جماعت یہ محسوس کرے کہ اب ہم کھلم کھلا اور برملا اس غلط نظام کو چیلنج کرسکتے ہیں اور اس نظام کا مقابلہ کرسکتے ہیں تو اس مرحلہ پر یہ صبرِ محض (Passive Resistance) اپنے

اگلے مرحلے یعنی اقدام (Active Resistance) میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب حکمتِ عملی تبدیل ہو گی۔ یعنی یہ کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ ان کے تشدد کا جواب بھرپور طریقہ پر دو یا اس نظام کی کسی دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑو ــــــ آگے چل کر ان تمام باتوں کی تشریح ہو جائے گی۔

۶) مسلح تصادم

اس چیلنج کے نتیجہ میں چھٹا اور آخری مرحلہ شروع ہو گا اور وہ ہے مسلح تصادم۔ جب تک وہ انقلابی جماعت اقدام نہیں کر رہی تھی یعنی ماریں کھا رہی تھی اور ہاتھ نہیں اُٹھا رہی تھی تب تک اور بات تھی۔ اب اگر اس جماعت نے بھی ہاتھ اُٹھالیا تو وہ نظام اس پر پوری طاقت اور قوت کے ساتھ حملہ آور ہو گا۔ اور یہ ہے وہ آخری مرحلہ (Final Phase) جس کے اندر جسمانی ٹکراؤ (Physical Collision) ہو کر رہتا ہے۔ اسی کے لئے اصطلاح ہے مسلح تصادم یعنی Armed Conflict۔

ظاہر بات ہے کہ جب یہ چھٹا مرحلہ شروع ہو جائے تو اَب فریقین کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔ اب تو تاریخ بتائے گی' حالات فیصلہ کریں گے اور دو میں سے ایک نتیجہ بہرحال نکلنا ہے اور وہ ہے تخت یا تختہ۔ تیسرا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر پہلے پانچ مراحل صحیح طور پر طے ہوئے ہیں' انقلابی عمل مستحکم ہوتے ہوئے اور consolidate کرتے ہوئے آگے بڑھا ہے' صحیح تربیت ہوئی ہے' صحیح تنظیم ہوئی ہے اور خاص طور پر یہ کہ پہلے پانچوں مراحل کو طے کرنے کا صحیح حق ادا کیا گیا ہے تو انقلابی جماعت کامیاب ہو جائے گی' انقلاب وقوع پذیر ہو جائے گا اور اس انقلابی نظریہ کے مطابق نظام یکسر تبدیل ہو جائے گا۔ ورنہ اسے کچل کر رکھ دیا جائے گا۔

انقلابی عمل کے یہ چھ مراحل (Phases) ہیں' یعنی تین تین کے دو گروپ۔ پہلے تین مراحل کا حاصل ہے : کسی انقلابی نظریہ' فکر' فلسفہ کو قبول کرنے والوں کا

ایک تربیت یافتہ اور منظم جماعت کی شکل میں وجود میں آجانا۔

دوسرے حصہ کے بھی تین مراحل ہیں اور وہ ہیں : صبرِ محض (Passive Resistance)' اقدام (Active Resistace) اور مسلح تصادم(Armed Conflict) ــــــ اور اس کا نتیجہ تخت یا تختہ۔

انقلاب کی توسیع و تصدیر

اب اگر انقلاب کامیاب ہو جائے تو ایک ساتواں مرحلہ مزید شروع ہو گا۔ ان چھ مراحل سے تو کسی ایک ملک میں انقلاب کی تکمیل ہوتی ہے' جبکہ ساتواں مرحلہ اس انقلاب کی توسیع کا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایک نظریاتی انقلاب کا یہ خاصہ ہے کہ وہ جغرافیائی اور قومی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ ایک فکر' ایک فلسفہ' ایک نظریہ کی بنیاد پر آتا ہے اور نظریہ وہ شے ہے جس کے لئے نہ پاسپورٹ کی ضرورت ہے' نہ ویزا کی حاجت۔ نظریہ کے لئے سرحدیں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ نظریہ تو امریکہ جیسے دور دراز ملک سے چلتا ہے اور پاکستان پہنچتا ہے۔ نظریہ کے بڑے مضبوط پر ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ اڑتا ہوا سرحدوں کے تمام موانعات(Barriers) کو عبور کرتا ہے۔ اگر اس نظریہ میں جان ہے تو وہ دوسرے ممالک میں اپنی جڑیں قائم کرے گا' جس کے نتیجہ میں انقلاب کی توسیع ہو گی اور وہ پھیلے گا۔ جیسے انقلابِ فرانس' فرانس تک محدود نہیں رہا اور بالشویک یعنی اشتراکی انقلاب صرف روس تک محدود نہیں رہا۔ انقلاب کا یہ خاصہ ہے کہ پہلے کسی ایک ملک' کسی ایک علاقے(Territory) میں آتا ہے' وہاں اس کے ثمرات کا ظہور ہوتا ہے' پھر اس کی بین الاقوامی سطح پر توسیع کا عمل شروع ہوتا ہے۔

کامل انقلاب کی واحد مثال : انقلابِ محمدیؐ

انقلاب کے یہ سات مراحل (۳ + ۳ + ۱) میں نے سیرتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے اخذ کئے ہیں' اس کے سوا میرے نزدیک ان کا کوئی اور مأخذ

نہیں ہے' کیونکہ کامل اور ہمہ گیر انقلاب کا منہاج اور نقشہ صرف سیرت محمدیؐ سے ہی مل سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں کامل انقلاب (Total Revolution) صرف اور صرف حضرت محمدِ عربی ﷺ نے برپا کیا ہے۔ باقی دنیا کے جو انقلابات مشہور ہیں وہ جزوی انقلاب تھے۔ فرانس کے انقلاب سے صرف سیاسی ڈھانچہ بدلا' معاشی نہیں بدلا' معاشرتی نہیں بدلا' روحانی و اخلاقی نہیں بدلا' عقائد نہیں بدلے۔ روسی انقلاب سے صرف معاشی ڈھانچہ بدلا' سیاسی ڈھانچہ میں ایک جزوی تبدیلی یہ آئی کہ صرف ایک پارٹی کے نمائندوں پر مشتمل حکومت کا نظام قائم ہو گیا ـــــ البتہ انسانی زندگی کے چھ کے چھ گوشوں یعنی عقائد' عبادات اور سماجی رسوم کے علاوہ معاشرتی نظام' معاشی و اقتصادی نظام اور سیاسی نظام کو تاریخ انسانی میں صرف ایک مرتبہ بدلا گیا ہے اور یہ بدلا ہے حضرت محمد ﷺ نے۔ پس جسے کامل' ہمہ گیر' گھمبیر اور Total Revolution کہا جائے تو وہ ہے ہی صرف ایک' اور وہ ہے رسول آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا برپا کیا ہوا انقلاب ـــــ حضور ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب میں ڈھونڈے سے بھی کوئی چیز ایسی نہیں ملے گی جو یکسر تبدیل ہو کر نہ رہ گئی ہو۔ "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" کی جِدّوجہد' سعی و کوشش' محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کے نتیجہ میں لکھو کھا مربع میل زمین کے ایک ملک کے رہنے والوں کی زندگیوں میں ایک ایسا انقلابِ عظیم برپا ہو گیا کہ ان کی سوچ بدل گئی' ان کا فکر بدل گیا' ان کے عقائد بدل گئے' ان کی اقدار بدل گئیں' ان کے عزائم بدل گئے' ان کے مقاصد بدل گئے' ان کی آرزوئیں بدل گئیں' ان کی تمنائیں بدل گئیں' ان کے دن بدل گئے' ان کی راتیں بدل گئیں' ان کی صبحیں بدل گئیں' ان کی شامیں بدل گئیں' ان کی زمین بدل گئی' ان کا آسمان بدل گیا۔ یہاں تک کہ اگر پہلے انہیں زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر ہو گئی۔ جو رہزن تھے وہ رہبر بن گئے۔ جو اُمّی محض تھے وہ متعدد علوم و فنون کے مُوجد بن گئے۔ جو بے شمار رذائم اخلاق میں مبتلا تھے وہ مکارمِ اخلاق کے معلم و داعی بن گئے۔ جو زانی

اور نفس پرست تھے' وہ عصمت و عفت کے محافظ بن گئے۔ جو بے قید حصولِ معاش کے عادی اور اسراف و تبذیر کے خوگر تھے وہ مال و دولت کے امین بن گئے ـــــ یہ تھی گھمبیرتا' ہمہ گیری اور برکت اُس انقلاب کی جو مُحمّدِ عربی ﷺ نے برپا فرمایا۔

پھر صرف یہی بات قابلِ ذکر نہیں ہے کہ کسی ایک انسانی زندگی میں انقلابی عمل کی تکمیل دُنیا میں صرف ایک بار ہی ہوئی ہے' بلکہ سب سے زیادہ اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انقلابی عمل کے یہ تمام کے تمام سات مراحل آپ کو ایک فردِ واحد کی زندگی میں نظر آجائیں' یہ ممکن ہی نہیں۔ اس کی کوئی نظیر ہی نہیں سوائے خاتم النبیّین سیّد المرسلین جناب مُحمّد ﷺ کے۔ ایک فردِ واحد ۶۱۰ عیسوی میں ایک انقلابی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور ۶۳۰ء میں یعنی کل بیس برس میں عرب میں انقلاب تکمیل پا جاتا ہے۔ باقی دو سال اس انقلاب کی توسیع کے عمل میں گزرے ہیں ـــــ ۰۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد مختلف سربراہانِ مملکت کو دعوتی خطوط ارسال کئے گئے تھے اور سفارتیں بھیجی گئی تھیں۔ ۰۸ھ میں مکّہ فتح ہو گیا۔ اس کے بعد کے دو سال کے عرصہ میں جنگِ مُوتہ ہوئی جس میں سلطنتِ روما جیسی وقت کی سپر طاقت کے ساتھ مسلح تصادم ہوا۔ اس کے بعد ۰۹ھ میں خود نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں سفرِ تبوک ہوا۔ اس موقع پر تیس ہزار جان نثار حضور ﷺ کے جلو میں تھے۔ ـــــ پھر یہ کہ حضورؐ نے وفات سے چند دن قبل حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سربراہی میں شام کی ایک مہم کے لئے لشکر ترتیب فرمایا۔ وہ لشکر ابھی روانہ نہیں ہوا تھا کہ مرض نے شدّت اختیار کی اور ربیع الاول ۱۱ھ میں نبی اکرم ﷺ نے "اَلرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی" کی طرف مراجعت فرمائی۔

اندازہ کیجئے کہ اکیس بائیس برس کے لگ بھگ مختصر ترین عرصہ میں نبی اکرم ﷺ نے ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہتی انقلاب کی از ابتداء تا انتہاء بنفسِ نفیس تکمیل فرما دی' جس کی دُنیا میں کوئی نظیر نہ پہلے موجود تھی نہ تا قیامِ قیامت ملے گی۔ دُنیا کے دوسرے دو انقلابات مشہور ہیں یعنی انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس۔ ایک

طرف تو یہ انقلابات جزوی تھے اور دوسری طرف قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان انقلابات کا فکر دینے والے کوئی اور تھے اور انقلاب برپا کرنے والے کوئی اور ـــــ پھر انقلابی فکر پیش ہونے اور اس کے نتیجہ میں عملاً انقلاب بپا ہونے میں اچھا خاصا زمانی فصل ہے۔ انقلابِ فرانس اُس فکر کے نتیجہ میں رونما ہوا جو والٹیر اور روسو جیسے بے شمار مصنفوں کی کتابوں کے ذریعے کافی عرصہ تک پھیلتا رہا ـــــ اسی طرح انقلابِ روس کی اساس کارل مارکس کی کتاب "داس کیپیٹل" پر قائم ہوئی لیکن خود مارکس کی زندگی میں ایک گاؤں میں بھی انقلاب کے عملاً برپا ہونے کا امکان تک پیدا نہ ہو سکا۔ مارکس جرمنی کا رہنے والا تھا لیکن انقلاب روس میں آیا اور اس کی موت کے قریباً پچاس سال بعد لینن جیسی فعال شخصیت کے ہاتھوں آیا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ روس کے داخلی معاملات اس حد تک بگڑ گئے تھے کہ وہ بالشویک انقلاب کے لئے سازگار ہو گئے تھے۔ مگر اکیس بائیس برس کے لگ بھگ ایک مختصر سے عرصہ میں ایک عالمگیر انقلاب کی تکمیل جس میں انقلاب کے جملہ مراحل کی تکمیل دُنیا کی تاریخ میں صرف ایک بار ہوئی وہ حضرت محمد ﷺ کے دستِ مبارک سے ہوئی ہے۔ بعد میں رونما ہونے والے انقلابات میں اصل راہنمائی سیرتِ مطہرہ سے ہی لی گئی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

هر کجا بینی جهانِ رنگ و بُو
آنکه از خاکش بروید آرزو!
یا زنورِ مصطفیٰؐ او را بهاست!!
یا هنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

یعنی نبی اکرم ﷺ کے سعید و مبارک دَور کے بعد دُنیا نے جو کچھ سیکھا ہے وہ حضورؐ سے ہی سیکھا ہے۔ یا پھر انسان ٹھوکریں کھا کھا کر چار و ناچار اسی منزل کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے کہ جس منزل پر پہنچایا تھا محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے ـــــ لہٰذا یاد رہے کہ انقلابی عمل کے مراحل کے استنباط کے ملئے میرا ماخذ صرف اور صرف سیرتِ

النّبی ہے۔ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

انقلابِ نبویؐ کا اساسی نظریہ : توحید

اب ہم سیرتُ النّبی ﷺ کا جائزہ لیتے ہیں کہ وہاں یہ چھ قدم کس ترتیب سے اُٹھائے گئے۔ پہلا قدم ہوتا ہے ایک انقلابی نظریہ' فکر اور فلسفہ سے متعلق۔ انقلابِ محمدیؐ اور دوسرے انقلابات کے مابین اس اعتبار سے فرق کیا ہے؟ یہ کہ دُنیا کے دونوں مشہور و معروف انقلابات کے لئے نظریہ' فکر اور فلسفہ انسانی ذہنوں کی پیداوار تھا' جبکہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو وہ نظریہ' فکر اور فلسفہ وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ پہلا عظیم ترین فرق تو یہ ہے کہ یہ نظریہ ہے "توحید"۔ کامل ترین اور خالص ترین توحید' جس کی بنیاد ہے قرآن حکیم۔ اس قرآن کے ذریعہ سے یہ انقلابی نظریہ لوگوں کے سامنے آنا شروع ہوا۔ اس حقیقت کو نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں مولانا حالی نے بیان کیا ہے ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

اور نہایت پُرشکوہ الفاظ میں بیان کیا علامہ اقبال نے ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

انقلابی نظریۂ توحید کی بنیاد قرآن ہے ـــــ یعنی دعوت قرآن کی' تبلیغ قرآن کی' انذار قرآن سے' تبشیر قرآن سے' تذکیر قرآن سے' حتیٰ کہ تزکیہ یعنی تربیت بھی قرآن سے ـــــ حاصل کلام یہ کہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت کا مرکز و محور اور منبع و سرچشمہ ہے قرآنِ مجید' فرقانِ حمید!!

دوسری بات ایک بہت اہم نکتہ ہے جسے لوگ بالعموم سمجھ نہیں پاتے۔ وہ یہ کہ حضور ﷺ کی دعوت کو جہاں تک "نظریہ" کہا جائے گا تو اس انقلابی نظریہ کے تین حصے شمار کئے جائیں گے : ۱۔ توحید ۲۔ رسالت ۳۔ معاد یا آخرت۔ ان میں سے جہاں تک "نظام" کا تعلق ہے وہ در حقیقت نظریۂ توحید پر ایمان لانے سے ہے۔ آخرت پر ایمان انسان کی سیرت و کردار کی تربیت اور صحیح تعمیر کی بنیاد بنتا ہے۔ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ اصل میں اسی تربیتی مراحل کی چیزیں ہیں۔ اشخاص کی سیرت و کردار کو اس خاص سانچہ میں ڈھالنا کہ جس سانچہ کے ڈھلے ہوئے کارکنوں کے ذریعہ سے اسلامی انقلاب آ سکے' اس تربیت کا پروگرام ان چیزوں پر مشتمل ہے۔ دل میں چھپے ہوئے اَمراض اور روگوں کا مداوا اور علاج بھی قرآن اور اس تربیتی پروگرام ہی سے ہوتا ہے' جس کے لئے دینی اصطلاح تزکیہ ہے۔ الغرض ایمان بالآخرت انسان کے جذبۂ عمل کو متحرک (motivate) کرنے کا نہایت مؤثر عامل ہے ـــــ جبکہ رسالت پر ایمان کا تعلق قانون سے ہے۔ حضور ﷺ کو دل و جان سے رسول تسلیم کرنے اور آپؐ کی دی ہوئی تمام خبروں کی تصدیق کا نام ہی دراصل ایمان ہے۔ اس کے بغیر ہم نہ توحید کو صحیح معنوں میں جان سکتے ہیں' نہ آخرت کو مان سکتے ہیں' اور نہ ہی اعمالِ صالحہ اور افعالِ سیئہ کو صحیح طور پر پہچان سکتے ہیں۔ یہی مطلب و مفہوم اور مقصود ہے نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کا :

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبِعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))

"تم میں سے کوئی شخص مؤمن ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔"

نظریۂ توحید کے متضمنات

جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انقلابی نظریہ یا دعوت لے کر تشریف لائے وہ در حقیقت توحید ہے۔ لہٰذا اس انقلابی فکر اور فلسفہ کے متضمنات

(corollaries) اس کے مضمرات' اس کے مقتضیات' اس کے بدیہی نتائج و عواقب کو سمجھنا ضروری ہے جس کے بغیر توحیدِ کامل اور توحیدِ خالص کے انقلابی پہلو کا صحیح ادراک و شعور مشکل ہے۔

اس پہلو سے تین چیزیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

ا) انسانی حاکمیت کی بجائے خلافت

توحید کے متضمنات میں سب سے پہلی چیز حاکمیت انسانی کی کلی نفی ہے۔ یہ سب سے بڑا' سب سے عظیم انقلابی نظریہ ہے جس تک انسان کا اپنا ذہن رسائی کر ہی نہیں سکتا۔ اس کا علم صرف وحی الٰہی کے ذریعے ہی سے حاصل ہونا ممکن ہے۔ اس بات کو پہلے بھی مشرکین نے مانا ہے اور آج بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کی تکوینی حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ لیکن توحید کا تقاضا یہ ہے کہ دُنیا میں تشریعی حاکمیت مطلقہ بھی صرف اللہ کیلئے ہو : اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ـــــ اور اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ـــــ اور تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ ـــــ اور لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ـــــ گویا

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

اس نظریہ کو نہایت شد و مد سے محکم دلائل و براہین کے ساتھ قرآن مجید ہی نے پیش کیا ہے۔

یہ موضوع اگرچہ تفصیل کا متقاضی ہے' لیکن یہاں چند اشارات ہی پر اکتفا کریں گے۔ غور کیجئے کہ فرانس کے انقلاب نے کیا کیا تھا۔ صرف ایک ہی چیز میں تبدیلی کی تھی کہ حاکمیت کسی خاندان یا فرد کی نہیں ہے بلکہ عوام کی ہے ـــــ گویا حاکمیت ایک خاندان یا فرد کے ہاتھ سے لے کر جمہور کو دے دی گئی۔ صرف یہی تبدیلی رونما ہوئی' اور تو کوئی نہیں۔ اس انقلاب کا لُبِّ لباب یہی ہے کہ :

"حاکمیت (Sovereignty) کسی مخصوص فرد یا کسی شاہی خاندان کے ساتھ متعلق

نہیں ہے' بلکہ فی الحقیقت حاکمیت کا تعلق عوام کے ساتھ ہے"۔

یہی نظریہ ہے جمہوریت کا۔ سارا جھگڑا اور سارا فساد اسی کا ہے کہ حاکمیت کس کی؟ اختیار کس کا؟ قانون بنانے اور دینے کا مجاز کون؟ یہ ہے اصل میں سارے بِس کی گانٹھ۔ اور یہ انقلاب کہ حاکمیت کو افراد اور خاندانوں سے نکال کر عوام میں لے آنا تو اس کے لئے کتنا خون دینا پڑا ہے۔ فرانس کا انقلاب بڑا ہی خونیں انقلاب تھا۔ شیر کے منہ سے نوالہ نکالنا کوئی آسان کام ہے؟ جن لوگوں نے یورپ کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاں Divine Rights of the King کا سکہ جاری تھا۔ یعنی بادشاہوں کو تو خدائی اختیار حاصل ہیں' انہیں کون چیلنج کر سکتا ہے؟[1]

اب آپ سوچئے کہ انسانی سطح پر حاکمیت کی تبدیلی یعنی ایک فرد یا ایک خاندان کی حاکمیت کے بجائے عوام کی حاکمیت لانے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے'

---

(۱) دُنیا میں عام طور پر بادشاہوں کے لئے یہی تصور دیا گیا' جیسے ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان تھے اور مصر میں فرعون تھا۔ راع یعنی سورج کو مصری بھی اپنا سب سے بڑا دیوتا مانتے تھے۔ تو ان خاندانوں کا تعلق نام نہاد دیوتاؤں اور دیویوں سے جوڑا گیا اور ان کے بارے میں یہ طے کر لیا گیا کہ ان کو چھیڑا نہیں جا سکتا' حکومت کرنا ان کا حق ہے اور ان کی بے چون وچرا اطاعت کرنا اور ان کو خراج ادا کرتے چلے جانا عوام کا فرض ہے۔ یہ فلسفے مذہبی سطح پر چلائے گئے۔ نام نہاد مذہب نے ہمیشہ اس تصور کو تحفظ دیا ہے' اس لئے کہ پنڈتوں' پوپ' پجاریوں' پروہتوں' پادریوں اور Priests کے مفادات اسی مشرکانہ تصور سے وابستہ رہے۔ دیوی دیوتاؤں کے نام سے جو بڑے بڑے مندر اور ہیکل تعمیر کئے جاتے رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم صدیقہ کے نام پر جو بڑے بڑے کلیسا' گرجے اور چرچ بنائے جاتے رہے ان پر عوام الناس جو چڑھاوے چڑھاتے رہے ہیں وہ کہاں جاتے رہے! کیا ان بتوں اور مجسموں کے پیٹوں میں؟ نہیں' وہ سب ان لوگوں کے پیٹ میں جاتے رہے ہیں جن کے القاب "پ" سے شروع ہوتے ہیں اور جو میں نے ابھی آپ کو گنوائے ہیں۔ آپ چاہیں تو ایک پ (پیر) کا اور اضافہ کر لیں جو ہمارے یہاں رائج ہے جن کی اکثریت نے اسے پیشہ بنا رکھا ہے اور اس نے حاکمیت مطلقہ کے بجائے شفاعت باطلہ کا تصور جہلاء کے ذہنوں میں بٹھا کر اولیاء اللہ کے مقابر کو استھانوں کا درجہ دے رکھا ہے اور اس طرح آمدنی کا ذریعہ پیدا کر رکھا ہے۔ بقول شاعر ؎ "مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج!"

تو وہ کتنا بڑا انقلاب ہے جو برپا فرمایا جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے ' جسے یوں تعبیر کیا علّامہ اقبال نے کہ ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!

یہ عظیم ترین انقلابی نظریہ ہے : اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ۔ اللہ کے سوا کوئی حاکم مطلق نہیں ہے۔ نہ کوئی فرد' نہ کوئی خاندان' نہ کوئی قوم' نہ پوری نوعِ انسانی۔ انسان کے لئے حاکمیت کی نفیِ مطلق ہے۔ انسان کے لئے تو خلافت ہے۔ اور وہ بھی عوامی خلافت ـــــ یعنی خلیفہ بھی آسمان سے مقرر نہیں ہوتا بلکہ عوام میں سے منتخب ہوتا ہے۔ اہلِ سُنّت اور اہلِ تشیّع کے تصورِ خلافت و امامت میں اساسی و بنیادی فرق و اختلاف یہی ہے کہ اہلِ تشیّع کے نزدیک امامت صرف ایک خاندان کا حق ہے اور ان کے نزدیک امام مامور من اللہ ہوتا ہے' لہٰذا مطاعِ مطلق بھی ہوتا ہے اور معصوم عن الخطاء بھی۔ ہمارا تصور و عقیدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے نزدیک مامور من اللہ ہونا اور معصومیت خاصّۂ نبوت و رسالت ہیں۔ جنابِ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہوئی اور رسالت کی تکمیل ہو گئی۔ لہٰذا معصومیت بھی ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم ہو گئی۔ کوئی خلیفہ یا امام مامور من اللہ نہیں ہے۔ کوئی معصوم نہیں ہے اور نہ تاقیامِ قیامت ہو سکتا ہے۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق مسلمانوں کے لئے خلافت ہے' خلافتِ عامہ ـــــ یعنی عوام الناس اپنی رائے سے جس کو چاہیں خلیفہ چن لیں۔ گویا کہ وہ اپنے حقِ خلافت کو تفویض (delegate) کر رہے ہیں ایک شخص کو کہ وہ ان کا سربراہ ہے۔

خلافتِ راشدہ درحقیقت تتمہ اور ضمیمہ تھی دَورِ نبوت کی ـــــ وہ مشن جو حضور ﷺ کو دیا گیا تھا : ﴿ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ اس کی توسیع اور عالمی سطح پر اس کی تکمیل کے لئے دراصل خلافت کا نظام قائم کیا گیا تھا کہ ایک ملک میں اللہ کے دین کو بنفسِ نفیس نبی اکرم ﷺ

نے غالب اور قائم فرمادیا اور پھر پورے کرۂ ارض پر اسے غالب کرنے کا کام اُمت کے حوالے فرمادیا ـــــ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ مشن دے کر حضورؐ دُنیا سے تشریف لے گئے۔ لہٰذا یہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی۔ اسی لئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ راشد نے اپنے لئے "خلیفۃُ رسولِ اللہ" کا لفظ اختیار کیا۔ لیکن آئندہ مستقل طور پر اسلامی خلافت کا سربراہ خلیفۃ المسلمین یا امیر المؤمنین کہلائے گا۔ یعنی اصل میں تو تمام مسلمان خلافت کے اہل اور حامل ہیں' لیکن وہ جب اپنی رائے سے کسی کو خلافت کی ذمہ داری تفویض کریں گے تو وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہو گا۔ یہ ہے نظریۂ توحید کا سب سے پہلا انقلابی تصور' جس کا تعلق سیاسی ڈھانچے سے ہے۔

۲) ملکیت کی بجائے امانت

اسی نظریۂ توحید کا بدیہی نتیجہ' جسے اس دَور میں پوری طرح کھول کر بیان کرنے اور واضح کرنے کی ضرورت ہے' انسان کی ملکیت مطلقہ کی نفی کامل ہے۔ جیسے کوئی حاکمِ مطلق نہیں ویسے ہی کوئی مالک مطلق نہیں۔ حاکمِ حقیقی بھی اللہ ہے اور مالکِ حقیقی بھی اللہ ہے ـــــ قرآن مجید میں جس طور پر مختلف اسالیب سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کا اثبات فرمایا گیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ملکیتِ مطلقہ کا بھی مختلف اسالیب سے اثبات کیا گیا ہے۔ ﴿ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ﴾ اور ﴿ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ﴾ کے الفاظ اللہ کی اسی ملکیتِ مطلقہ کے اظہار کے لئے قرآن مجید میں متعدد بار آئے ہیں۔ یہاں "لِلّٰہِ" اور "لَہٗ" میں حرفِ جار لام کے متعلق تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ لام تملیک بھی ہے اور لامِ استحقاق بھی ـــــ پھر سورۂ آلِ عمران میں ﴿ وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ اور سورۃ المنافقون میں ﴿ وَلِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ فرما کر مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا گیا کہ جس طرح حاکمِ حقیقی صرف اللہ ہے اسی طرح کائنات کی ہر شے کا مالکِ حقیقی بھی صرف اللہ ہے۔ شیخ سعدیؒ نے اس مفہوم کو بڑے دل نشین اسلوب سے ادا کیا ہے ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالکِ ہر شے خداست

اسی مفہوم کو علامہ اقبال یوں ادا کرتے ہیں ؎

بندۂ مومن امیں' حق مالک است
غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

حاصل کلام یہ ہوا کہ جیسے حاکمیت کے باب میں حاکمیت کے بجائے خلافت ہے' ویسے ہی ملکیت کے ضمن میں ملکیت کے بجائے امانت ہے۔ جو کچھ انسان کے پاس ہے اس کے حصول پر بھی قدغنیں ہوں گی۔ ناجائز طریقہ سے حاصل کرلے گا تو ضبط کر لیا جائے گا اور تأدیب کا سزاوار ٹھہرے گا۔ لیکن انسان جائز طریقہ سے جو کچھ حاصل کرے گا تو وہ اس کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اس میں تصرف بھی صرف جائز طریقہ سے کیا جاسکے گا' ناجائز طریقہ سے تصرف ہوگا تو تصرف کا اختیار بھی ساقط ہو جائے گا ـــــ یہ بھی بہت بڑا انقلابی نظریہ ہے۔ ایک وہ تصور ہے کہ ذاتی ملکیت کا حق بڑا مقدس ہے۔ میری شے ہے' میں جس طرح چاہوں استعمال کروں' میرا اختیار مطلق ہے' میں جو چاہوں کروں۔ ملکیت کا مطلب تو یہی ہے کہ میری بکری ہے' میں جب چاہوں ذبح کردوں' تم کون ہو پوچھنے والے؟ میرا پیسہ ہے' میں جس طرح چاہوں اسے invest کروں' میں نے شراب خانہ کھولا ہے' میں نے کسی کو مجبور نہیں کیا' جو آکر پینا چاہے پئے' نہ پینا چاہے نہ پئے۔ میں نے کسی پر جبر نہیں کیا' میں بھی آزاد ہوں' وہ بھی آزاد ہے۔ میں نے قمار خانہ' قحبہ خانہ' نائٹ کلب اور انہی قبیل کے کاموں میں اپنا سرمایہ لگایا ہے' کوئی ان میں دلچسپی لے یا نہ لے' میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ لیکن یہ تصور اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام میں امانت کا تصور ہے۔ امانت کے مالک نے جس حد تک اور جن پابندیوں کے ساتھ تصرف کا حق دیا ہے' اس حد تک تصرف کرسکتے ہو۔ اس سے تجاوز کرو گے تو مجرم شمار ہو گے۔ غور کیجیے کہ معاشی سطح پر یہ کتنا عظیم انقلاب ہے۔ بقولِ علامہ اقبال ؎

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
مُنعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس عقیدۂ توحید کا جو تیسرا انقلابی پہلو ہے اس کو بیان کرنے سے قبل چند اہم باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ اس توحید کا ایک اعتقادی پہلو ہے۔ یعنی کسی اور کی عبادت اور پرستش نہ ہو سوائے اللہ کے : ﴿ لَا تَعْبُدُوْا اِلَّآ اِیَّاہُ ﴾۔ کسی کو رکوع و سجدہ نہ کیا جائے سوائے اللہ کے۔ کسی سے دعا نہ کی جائے سوائے اللہ کے : ﴿ لَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ○ ﴾ اس کا کوئی ند' اس کی کوئی ضد' اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کا کوئی کفو' اس کا کوئی ہم سر نہیں : ﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا ﴾ ـــــ اور ﴿ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ○ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ○ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ○ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ○ ﴾ اس کے سوا کوئی حاجت روا' دستگیر اور پشت پناہ نہیں ہے : ﴿ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ○ ﴾ نذر و نیاز' قربانی الغرض کوئی بھی تعبدی عمل اس کے سوا کسی اور کے لئے نہیں ہے : ﴿ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾۔ یہ تمام امور یقیناً عقیدۂ توحید کے مظاہر اور اس کے لوازم ہیں ـــــ ان میں ذرا سی اُونچ نیچ اور کمی بیشی ہوئی تو توحید ختم ہوئی اور شرک لازم ہو گیا۔ پھر تو معاملہ وہ ہو جائے گا جس کی طرف سورۂ یوسف کی اس آیت مبارکہ میں توجہ دلائی گئی ہے : ﴿ وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ ○ ﴾ ـــــ الغرض توحید کا پوری انسانی زندگی پر محیط ہونا ایمان کا لازمی تقاضا ہے ـــــ توحید کی چھاپ تو پوری زندگی پر ہونی لابدّ منہ ہے ـــــ لیکن اس وقت کی اور اس دور کی شدید ضرورت ہے کہ عقیدۂ توحید نے اجتماعی زندگی کے ان تین گوشوں یعنی معاشرتی' معاشی اور سیاسی گوشوں میں جو عظیم انقلاب برپا کیا ہے' اسے نہایت وسیع پیمانے پر محکم دلائل کے ساتھ دُنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسی کے ذریعہ سے موجودہ باطل اور مادّہ پرستانہ تمام نظریات اور نظام ہائے زندگی کا ابطال اور اسلام کی حقانیت کا احقاق ہو سکے گا۔

۳) کامل معاشرتی مساوات

انسانی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ جہاں ایک طبقہ خدائی اختیارات (Divine Rights) کا مدعی رہا ہے اور جہاں انسان ملکیتِ مطلقہ کی ضلالت میں مبتلا رہا ہے وہاں وہ اس گمراہی میں بھی ٹھوکریں کھاتا رہا ہے کہ انسانوں میں ذات پات اور اُونچ نیچ کی تقسیم ہے۔ جبکہ توحید کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ دُنیا کے تمام انسان برابر ہیں۔ کوئی اُونچا نہیں' کوئی نیچا نہیں' کوئی اعلیٰ نہیں' کوئی ادنیٰ نہیں۔ یہ برہمن اور شودر کی تقسیم' یہ رنگ و نسل کی بنیاد پر افتخار انسان کے اپنے ذہن کے تراشے ہوئے فلسفے ہیں ـــــ یہ انسان کے تنگ ذہن اور قلب کے تراشیدہ اصنام ہیں۔ معاشرتی سطح پر توحید کا انقلابی تصور یہ ہے :

﴿ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاءً ﴾

(النساء : ۱)

"اے نوعِ انسانی! تقویٰ اختیار کرو اپنے اس مالک اور پروردگار کا جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا' پھر اس (ایک جان) سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر اس جوڑے سے (دُنیا میں) کثیر تعداد میں مَرد و عورت کو پھیلا دیا"۔

یعنی پوری نوعِ انسانی ایک ہی جوڑے (آدم و حوّا) کی اولاد ہے ـــــ بدقسمتی سے توحید کے ماننے والوں میں بھی مرورِ زمانہ اور دوسروں کی دیکھا دیکھی اُونچ نیچ کی تقسیم آ گئی ہے۔ چنانچہ سید زادہ' وہ چاہے واقعی سید زادہ ہو یا بنا ہوا سید ہو' وہ چاہے زانی اور شرابی ہو' اس کے گھٹنے کو احترام کے ساتھ ہاتھ لگایا جائے گا۔ یہی صورت حال اور یہی تقسیم وڈیروں' زمینداروں اور ان کے مزارعین اور پیروں اور ان کے مریدوں کے مابین دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ سب کہاں سے آیا؟ ایک طرف نسلی امتیاز کی نفی اور دوسری طرف نسل پرستی کا یہ عالم! ـــــ اگر کامل سماجی مساوات نہیں ہے تو وہ معاشرہ کسی درجہ میں اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے ۔

یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

یہ ساری تقسیمیں غلط ہی نہیں بلکہ موجب فساد بھی ہیں۔ کوئی اُونچا اور کوئی نیچا نہیں۔ اس لئے کہ سب کا خالق ایک اللہ ہے اور سب ایک انسانی جوڑے آدم اور حوّا کی اولاد ہیں۔ تو کون اُونچا اور کون نیچا! کون اعلیٰ اور کون ادنیٰ! نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اعلانِ عام فرمادیا :

((یٰاَیُّھَا النَّاسُ ' اَلاَ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ ' وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ ' اَلاَ لاَ فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی اَعْجَمِیٍّ وَلاَ لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلاَ لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلاَ لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلاَّ بِالتَّقْوٰی)) (مسند احمد)

"لوگو! آگاہ رہو کہ تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ جان لو کہ نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ ہی کسی کالے کو کسی گورے پر۔ بنائے فضیلت صرف تقویٰ ہے"۔

فضیلت اگر کوئی ہے تو وہ خدا ترسی اور اعلیٰ سیرت و کردار کی بنا پر ہے اور وہ معاملہ آخرت میں ہوگا۔ تمام انسان اس دُنیا میں کامل سماجی مساوات رکھتے ہیں۔

غور کیجئے کہ اس سماجی و معاشرتی مساوات کا تعلق بھی توحید ہی سے ہے۔ چونکہ تمام انسانوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہے لہٰذا سب برابر ہو گئے۔ کوئی چھوٹا خدا کسی ایک کا پیدا کرنے والا ہوتا اور کوئی بڑا خدا کسی دوسرے کا پیدا کرنے والا ہوتا تو اُونچ نیچ ہو جاتی۔ یا جیسے ہندوؤں میں اُونچ نیچ کا یہ تصور ہے کہ برہمن تو اِیشور کے سر سے پیدا ہوا ہے اور شُودر اُس کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ انہوں نے ایک ایشور ہی میں یہ تقسیم کر دی۔ توحید یہ ہے کہ ایک ہی اللہ سب کا پیدا کرنے والا ہے اور سب انسان ایک ہی انسانی جوڑے کی اولاد ہیں :

﴿ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا

وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○ ﴾ (الحجرات : ۱۳)

"لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے (جدا جدا) خاندان' قبیلے (اور قومیں) بنائیں تو باہم شناخت اور تعارف کے لئے (نہ کہ فخر و تکبر کے لئے) بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت دار تو اللہ کے نزدیک وہی ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ (سب کچھ) جاننے والا اور باخبر ہے۔"

الغرض اسلام کا انقلابی نظریہ ہے توحید ـــــ اس کی دعوت پر مشتمل ہے قرآن مجید۔ لہٰذا دعوت' تبلیغ' تذکیر' انذار اور تربیت و تزکیہ' یہ سب کام ہوں گے بذریعہ قرآن ـــــ ان تمام کاموں کے لئے "انذارِ آخرت" نہایت اہم ہے۔ لیکن یہ انذارِ آخرت دراصل انسان کی انفرادی اعلیٰ سیرت کی تعمیر کے لئے بنیادی پتھر ہے' جس پر ایک بندۂ مؤمن کا کردار اور سیرت پروان چڑھے گی۔ آخرت پر یقین' محاسبہ پر یقین' جزا و سزا پر یقین کے بغیر اس سیرت کی تعمیر محال ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے ـــــ اس تعمیرِ سیرت کے پروگرام کی تقویت کے لئے ذرائع کے طور پر نماز ہے' روزہ ہے' حج اور زکوٰۃ ہے' دوامِ ذکرِ الٰہی ہے۔ یہ تمام چیزیں درحقیقت انسان کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے ہیں ـــــ البتہ انقلابی نظریۂ توحید کی یہ تین Corollaries یعنی تین لوازم و نتائج ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔

پس اسلامی انقلاب کے لئے اصل میں ان چیزوں کو emphasize کرنا ہو گا۔ ان کی اہمیت کو واضح' نمایاں اور اُجاگر کرنا ہو گا۔ اگر ان کو نظرانداز کر کے زور ہو جائے محض نماز اور روزے وغیرہ پر تو درحقیقت انقلابی عمل کا آغاز نہیں ہو گا۔ کچھ مذہبی اور اخلاقی اصلاح کا کام ہو جائے گا' کچھ لوگ اچھے مسلمان بن جائیں گے' اور ایسے دوسرے کچھ اچھے کام ہو جائیں گے' اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن انقلابی عمل کا آغاز ہی نہیں ہو سکے گا۔

اسلامی انقلابی تنظیم کی اساس اور اس کا مزاج

انقلابی جِدّوجُہد کے مراحل و لوازم میں سے دوسرا مرحلہ انقلابی جماعت کی تشکیل و تنظیم کا ہے۔ یعنی جو لوگ انقلابی دعوت کے اساسی نظریہ کو ذہناً تسلیم کرلیں اور اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے داعی کے گرد جمع ہو جائیں انہیں ایک جماعت کی صورت میں منظم کرنا۔ اس کے لئے قرآن مجید کی تین اصطلاحات ہیں۔ پہلی قرآنی اصطلاح "بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ" ہے' یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ـــــ جب تک یہ کیفیت نہ ہو تنظیم وجود میں نہیں آسکتی۔ اس کے لئے بنیاد کیا ہے؟ سمع و طاعت! سنو اور اطاعت کرو : "وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا" (Listen and Obey)۔ یہ دوسری قرآنی اصطلاح ہے۔ اب اس میں تیسرا عنصر شامل کریں تو وہ ہے "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" جو لوگ ہم سفر ہیں' ساتھی ہیں' ان کے لئے نہایت مہربان' نہایت نرم' نہایت ہمدرد و دَمساز' لیکن کفار جو مقابل ہیں ان کے لئے نہایت سخت' Uncompromising۔ محسوس ہو جائے کہ ان کے اندر کسی قسم کی لچک کا امکان نہیں ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

تنظیمی اعتبار سے جب تک ایک ایسی مضبوط جماعت موجود نہ ہو انقلاب کا عمل شروع نہیں ہو سکے گا۔

ایسی جماعت کے وجود میں آنے کی اساسات کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ میں ہمیں دو چیزیں نظر آتی ہیں ـــــ اصل بنیاد تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے دعویٰ کیا کہ میں نبی ہوں' رسول ہوں' بالفاظ قرآنی : ﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ﴾ "اے نبی! ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشیر اور نذیر بنا

کرو!" چنانچہ جس نے مان لیا اور جو ایمان لے آیا گویا وہ ہمہ تن' ہمہ وجود مطیع ہو گیا۔ یہ اتنی منطقی بات ہے کہ جب تسلیم کر لیا کہ حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ﴿ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی" تو اس کے بعد کسی مسلمان کا کچھ کہنے اور حضور ﷺ کے فرمان اور رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے دینے کا حق باقی کب رہ گیا۔ اب وہ چون وچرا نہیں کر سکتا۔ دنیا کے کسی اور قائد' کسی اور رہنما اور کسی اور لیڈر کی بات سے اختلاف ممکن ہے' لیکن رسول ﷺ کی کسی بات سے بھی اختلاف ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہاں تو یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ آپؐ کے پاس علم کا وہ ذریعہ ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے والد سے فرمایا تھا : ﴿ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ ﴾ "ابا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا تھا' پس میری پیروی کیجئے' میں آپ کو بتاؤں گا سیدھا راستہ کونسا ہے" ــــــ بظاہر یہ اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے کہ بیٹا باپ سے یہ کہے۔ لیکن دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی الٰہی کے ذریعے سے علم حقائق حاصل ہو رہا ہے جو باپ کو حاصل نہیں ہے۔ باقی رہا تجرباتی علم' وہ والد کو زیادہ ہو تو ہو۔

رسول اور اُمتی کے تعلق کی تفہیم کے لئے اُس مجلسِ مشاورت کی روداد بڑی تابناک مثال ہے جو حضور ﷺ نے غزوۂ بدر سے پہلے مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کی منعقد فرمائی تھی۔ اس موقع پر حضرت سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ رئیسِ خزرج نے اس تعلق کے لُبِّ لباب کو چند جملوں میں بیان کر دیا تھا۔ انہوں نے عرض کیا تھا : "اِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ...." یعنی "حضور ﷺ آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں! آپؐ بھول جائیے کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ میں کیا طے ہوا تھا اور کیا نہیں۔ ہم آپؐ پر ایمان لا چکے' ہم آپؐ کی تصدیق کر چکے' ہم آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے' اب ہمارے پاس کون سا اختیار باقی رہ گیا۔ اللہ کی قسم' آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر

میں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ حکم دیں گے تو ہم برک الغماد تک جا پہنچیں گے چاہے ہماری اونٹنیاں دبلی اور لاغر ہو جائیں یا ختم ہو جائیں۔"

اس تنظیم کے متعلق یوں سمجھئے کہ دنیا میں اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصور کر ہی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ معاملہ ہے رسول اور اُمتی کا۔ لیکن چونکہ یہ کام آگے بھی ہونا تھا' اب تاقیامِ قیامت کسی نبی اور رسول کو نہیں آنا تھا ــــــ تو آئندہ یہ تنظیم کس بنیاد پر ہو گی؟ اس کے لئے نبی اکرم ﷺ نے اُمت کی رہنمائی کے لئے بیعت کی سُنّت جاری فرما دی۔ یعنی حضور ﷺ کے بعد اِعلاءِ کلمۃِ اللہ' اقامتِ دین اور اظہار دین الحق علی الدّین کُلِّہ کے لئے جو تنظیم بنے وہ بیعت سمع وطاعت کے اصول پر بنے۔

البتہ انتظامی امور کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے ادب واحترام کے ساتھ دریافت کر لیا کرتے تھے کہ آپؐ نے یہ جو تدبیر فرمائی ہے تو یہ آپؐ کا ذاتی اجتہاد ہے یا بذریعہ وحی اللہ کے حکم سے فرمائی ہے؟ اگر حضور ﷺ فرماتے کہ یہ فعل وحی کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ذاتی اجتہاد پر مبنی ہے' تب تو وہ اپنی رائے دینے کی جرأت کرتے تھے کہ حضور ﷺ! پھر اپنے تجربے اور فہم کی بنیاد پر ہم عرض کریں گے کہ فلاں معاملے کی تدبیر اس طرح کی جائے تو مناسب ہو گا ــــــ اس کی متعدد مثالیں سیرتِ مطہرہ میں موجود ہیں۔ مثلاً غزوۂ بدر کے لئے حضور ﷺ نے مسلمانوں کے کیمپ کے لئے جو مقام معین فرمایا تھا اس کے بارے میں صحابہؓ نے عرض کیا تھا کہ حضور! اگر یہ انتخاب وحی کی بنیاد پر ہے تو سرِ تسلیم خم ہے' لیکن اگر یہ اجتہاد کا معاملہ ہے تو ہم عرض کریں گے کہ جنگ کی حکمتِ عملی (War Strategy) کے اعتبار سے یہ جگہ مناسب نہیں ہے بلکہ فلاں جگہ مناسب ہے۔ تو حضور ﷺ نے وہاں کیمپ لگوا دیا ــــــ یہی معاملہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا تھا۔ اس موقع پر تین اطراف سے مدینہ منورہ کی چھوٹی سی بستی پر کفار نے یورش کی تھی۔ جنوب سے قریش آ گئے' شمال سے یہودی آ گئے اور مشرق سے بنو غطفان کے قبائل آ گئے۔ حضور ﷺ کو بڑا دُکھ تھا

کہ میری وجہ سے آج مدینہ کی بستی گھیراؤ میں آرہی ہے۔ اہل مدینہ نے مجھے اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنے یہاں پناہ دی اور میرا ساتھ دیا جس کی وجہ سے ان پر یہ قیامت ٹوٹ پڑنے والی ہے۔ تو انصار رضی اللہ عنہم پر نرمی کے خیال سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز پیش فرمائی کہ اگر آپ لوگ چاہیں تو بنو غطفان کے ساتھ ہم یہ معاملہ کرلیں کہ مدینہ کی پیداوار کا کچھ حصہ ان کو بطور خراج دینے کی پیشکش کریں' اور اگر وہ واپس چلے جائیں تو پھر ہم ان دو دشمنوں سے نمٹ لیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے انصارؓ کے حوصلہ کی پختگی (Morale) کا جائزہ لینے کے لئے یہ بات بطور تجویز پیش فرمائی ہو۔ واللہ اعلم! اس پر انصارؓ نے عرض کیا : حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اگر یہ تجویز وحی کی بنیاد پر ہے تو سرِ تسلیم خم ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ قبائل ہم سے کبھی جاہلیت میں بھی خراج نہ لے سکے' آج ہم اسلام میں آکر ان کو خراج دیں! ایسا نہیں ہو سکتا ـــــ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں شاباش دی۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی کے ساتھ اُمتی کا تعلق یہ ہوتا ہے کہ جہاں حکم آجائے اور ساتھ ساتھ یہ صراحت ہو کہ یہ اللہ کا حکم ہے تو اس کے بعد سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ لیکن اگر کسی معاملہ میں مشورہ کی گنجائش ہو تو مشورہ دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا : ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾ "اے نبی! آپ ان سے مشورہ کرتے رہا کریں"۔ ﴿ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ "لیکن جب آپ فیصلہ کر لیں تو پھر اللہ پر توکل کریں"۔ وہاں گنتی کی بنیاد پر کبھی فیصلے نہیں ہوئے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ حضورؐ نے اپنی ذاتی رائے کے مقابلے میں صحابہ کرامؓ کی رائے قبول فرما لی۔ رسول اور اُمتی کا تعلق ہی ایسا ہے کہ اس سے زیادہ مضبوط اور Disciplined جماعت کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ سوچنے کا مقام ہے اگر یہ کام صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے ہونا ہوتا تو تنظیم کے لئے کسی دوسری بنیاد اور اساس کو واضح کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن اگر یہ ایک جاری و ساری عمل ہے' اسے آگے بھی چلنا ہے' جیسے اس وقت ہمارے سامنے مسئلہ ہے کہ اگر اللہ

تعالیٰ ہمیں یہ ارادہ عطا فرمادے کہ ہمیں خالص اسی نہج پر انقلاب برپا کرنا ہے جس پر حضورؐ نے برپا فرمایا تھا' تو پھر سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ کے بعد نبی تو کوئی نہیں' تو پھر کس بنیاد پر لوگ جڑ کر ایک تنظیم بنیں گے؟ وہ تعلق کس اساس پر قائم ہو گا؟ آیا وہ کوئی جمہوری تنظیم ہو گی' دستوری تنظیم ہو گی' گنتی کی اساس پر فیصلے ہوا کریں گے؟ کیا ہو گا؟ اس کے لئے حضورؐ نے یہ طریق کار اختیار فرما کر جسے ہم لفظ بیعت کے نام سے جانتے ہیں اپنے اُسوۂ حسنہ سے ہمیشہ ہمیش کے لئے راہنمائی چھوڑی ہے۔ یعنی اللہ کا کوئی بندہ کھڑا ہو ـــــ ظاہر ہے وہ نبی اور رسول نہیں ہو گا ـــــ لیکن وہ اللہ کی توفیق سے کھڑا ہو اور پکارے کہ میں اسلامی انقلاب کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا ہوں' کون ہے جو میرا ساتھ دے؟ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟ ـــــ لوگ اسے ٹھونک بجا کر دیکھیں' جائزہ لیں' اس کی سیرت و کردار کو پرکھیں' اس کی پوری تاریخ کو دیکھیں۔ اپنی حد تک اطمینان کی کوشش کریں کہ یہ شخص بہروپیا تو نہیں' واقعتاً کوئی کام کرنا چاہتا ہے' اور اس کی زندگی میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو اس کام سے متضاد اور متناقض ہو جس کا بیڑا اٹھا کر یہ کھڑا ہوا ہے' فی الجملہ اس کے فکر اور اس کے خلوص پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں ـــــ یہ ہے بیعت سمع و طاعت۔ جس کے لئے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے تفصیلی ہدایات چھوڑی ہیں۔ حضورؐ نے کئی مواقع پر بیعت لی تھی۔ دو مواقع کا تو ابھی ذکر ہوا' بیعتِ عقبہ اولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ ـــــ ایک بیعت وہ ہے جس کا تذکرہ ابد الآباد تک ہوتا رہے گا' جب تک کہ قرآن حکیم کی تلاوت ہوتی رہے گی۔ وہ ہے بیعت رضوان' جس کا ذکر قرآن حکیم میں بایں الفاظ ہوا: ﴿ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ ﴾ ـــــ غور کیجئے کہ اس موقع پر اگر حضور ﷺ جنگ کا فیصلہ فرماتے تو کیا ان چودہ سو اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم میں سے کوئی ایک بھی پیچھے ہٹ سکتا تھا جو مدینہ منورہ سے چل کر حدیبیہ تک گئے تھے؟ ـــــ پھر حضورؐ نے بیعت کیوں لی؟ صرف اس لئے کہ اصل میں یہ بعد والوں کے لئے سُنّت

اور اسوہ ہے جو نبی اکرم ﷺ نے چھوڑا ہے۔

پس یہ بنیاد ہے تنظیم کی جو ہمیں سُنّتِ نبویؐ سے ملتی ہے۔ اور اس تنظیم میں ہر قسم کے نسلی اور قبائلی امتیازات کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ اب یہ نہیں ہے کہ کوئی قرشی ہے تو اس کا مقام اونچا ہے اور اگر کوئی حبشی ہے تو اس کا مقام نیچا ہے۔ یہ تقسیم تو جاہلیت کی تقسیم ہے' اسلام کی تقسیم نہیں ہے۔ سہیل بن عمرو وہ صاحب ہیں جو حدیبیہ میں قریش کے نمائندے کی حیثیت سے صلح کی شرائط طے کرنے آئے تھے۔ قریش میں ان کا کتنا اونچا مقام ہو گا کہ وہ صلح کی شرائط کی گفت و شنید کے لئے قریش کی طرف سے بااختیار نمائندہ بن کر آئے تھے۔ وہ بڑے ذہین تھے۔ جب نبی اکرم ﷺ نے صلح نامہ تحریر کرانا شروع کیا کہ "یہ معاہدہ ہے محمدؐ رسول اللہ اور قریش کے مابین" تو انہوں نے فوراً اعتراض کر دیا کہ نہیں' یہاں "محمدؐ رسول اللہ" کے الفاظ نہیں آئیں گے۔ اس لئے کہ اگر وہ حضور ﷺ کو "رسول اللہ" مان لیتے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔ نیچے دستخط تو دونوں فریقوں کے ہونے تھے۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ یہ لکھا جائے گا کہ "یہ معاہدہ ہے محمد بن عبداللہ اور قریش کے مابین" —— حضور ﷺ مسکرائے کہ کوئی مانے نہ مانے میں اللہ کا رسول ہوں۔ لیکن آپؐ نے اس اعتراض کو تسلیم فرمالیا۔ فتح مکہ کے بعد سہیل بن عمرو بھی ایمان لے آئے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کا ایک واقعہ ہے کہ قریش کے یہ چوٹی کے فرد سہیل بن عمروؓ فاروق اعظمؓ کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ آنجنابؓ نے ان کو اپنے پاس بٹھالیا۔ ان کے بعد چند اور اصحابؓ آگئے جو السّابقون الاوّلون میں سے تھے' یا اصحاب بدر و اُحد میں سے تھے' یا اصحابِ بیعت رضوان یعنی اصحابِ شجرہ میں سے تھے تو آپؓ نے حضرت سہیلؓ کو کچھ پیچھے ہٹ جانے کے لئے فرمایا اور ان حضراتؓ کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ پھر چند اور اصحاب آگئے تو ان کو اور پیچھے ہٹایا اور ان حضرات کو قریب بٹھایا۔ لوگ آتے رہے اور حضرت عمرؓ سہیلؓ کو پیچھے

ہٹاتے رہے۔ ہوتے ہوتے سہیلؓ جوتیوں تک پہنچ گئے۔ تب ان کی قرشیت کی حمیت ذرا جاگی اور انہوں نے شکوہ کیا کہ کیا آپؓ کی مجلس میں ہمارا مقام یہ جوتیوں والا رہ گیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زبان سے کوئی جواب نہیں دیا' اشارہ کر دیا کہ سرحدوں پر کفار سے جنگیں ہو رہی ہیں ـــــ تم نے وہ تمام مواقع کھو دیئے جو اسلام میں آگے آنے کے مواقع تھے۔ تاہم اب بھی موقع ہے' وہاں سرحدوں پر جاؤ اور اسلام کے لئے قربانیاں دو' سرفروشیاں کرو' تب تو شاید تمہیں یہ مقام حاصل ہو جائے' لیکن نسلی اور قبائلی بنیاد پر جو مراتب تھے' وہ ختم ہو چکے۔ چنانچہ کسی جماعت میں اگر اس نسلی امتیاز کا خاتمہ نہ ہو تو وہ انقلابی جماعت نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بلال حبشی رضی اللہ عنہ اس مقام تک پہنچ گئے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ انہیں ہمیشہ "سیدنا بلال" (ہمارے آقا بلال) کہا کرتے تھے۔ عمرؓ! ـــــ اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو "سیدنا" کہہ دیں! ان کے مزاج اور ان کے مقام سے کون واقف نہیں۔ ان کی شخصیت کا ایک اپنا رنگ تھا۔ ہر شخص کی اپنی افتادِ طبع ہوتی ہے' چنانچہ حضرت عمرؓ کی اپنی طبیعت کا ایک خاص انداز تھا۔ لیکن آپؓ حضرت بلالؓ کا نام "سیدنا" کہے بغیر نہیں لیتے تھے۔ آپؓ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے لئے بھی کہا کرتے تھے کہ "اَبُوْبکر سَیِّدُنَا وَاَعْتَقَ سَیِّدَنَا" یعنی ابو بکرؓ خود بھی ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار (بلالؓ) کو آزاد کیا تھا ـــــ اسلام میں آکر اب یہ فرق و تفاوت رونما ہو چکا تھا کہ کہاں وہ حبشی' وہ آزاد کردہ غلام اور کہاں وہ بلند مرتبہ مقام جو انہیں حاصل ہو گیا۔ عرب کے معاشرے میں غلام آزاد ہو کر بھی نیم غلام تو رہتا ہی تھا' اسے "مولیٰ" کہا جاتا تھا اور اسے ایک آزاد شخص کی طرح معاشرے میں برابری کا مقام پھر بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اسی امتیاز کو ختم کرنے کے لئے جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عملی سبق دیا تھا کہ جنگ موتہ میں لشکر کی کمان زیدؓ بن حارثہ کے سپرد فرمائی جو ایک آزاد کردہ غلام تھے' اور ان کی کمان کے تحت جعفر طیارؓ (حضرت علیؓ کے بھائی)' خالدؓ بن ولید' عبد اللہؓ بن رواحہ اور نہ معلوم کیسے کیسے جلیل القدر

اصحابِ رسول ﷺ تھے۔ پھر عین مرضِ وفات میں آپؐ نے جو لشکر شام کی سرحدوں کی طرف بھیجنے کے لئے تیار فرمایا تھا' اس کی کمان انہی زیدؓ کے بیٹے اُسامہؓ کو سونپی تھی' جن کی عمر بھی اُس وقت تیئس چوبیس برس کی ہو گی اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر جیسے اکابر صحابہ کرام ﷺ ان کے زیرِ کمان تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ اس لئے کیا کہ پچھلے نسلی اور قبائلی افتخار کے بُت اگر ابھی ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہوں تو وہ سب پاش پاش ہو جائیں۔ یہ بالکل نیا نظام ہے جو قائم ہوا۔ یہ اس انقلابی پارٹی کے لئے نئے Cadres اور نئی درجہ بندی ہے۔

پھر اس انقلابی جماعت میں سمع وطاعت کا معاملہ کس نوعیت کا تھا! اس کے لئے دو واقعات کافی ہیں۔ پورے مکّی دور میں تمام صحابہ کرامؓ کے لئے حکم یہ رہا کہ چاہے مشرکین تمہیں کتنا ہی ماریں' کتنی ہی ایذائیں دیں' حتیٰ کہ تمہیں ہلاک کر دیں لیکن تم ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی ـــــ اور تاریخ میں اس کی شہادت موجود نہیں ہے کہ کسی نے حضور ﷺ کے اس حکم کی خلاف ورزی کی ہو۔ یاد رہے کہ قرآن مجید میں ایسا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ جو بدنصیب لوگ سُنّت کی اہمیت کے قائل نہیں ہیں' ان کے لئے یہ بات خاص طور پر غور کرنے کی ہے کہ مکی دور میں صحابہ کرام ﷺ کس حکم پر اس شدت اور سختی سے عمل پیرا تھے؟ قرآن حکیم میں تو کہیں جا کر ۵ھ یا ۶ھ میں سورۃ النساء میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ... ﴾ "(اے نبیؐ) کیا آپؐ نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جن کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو..." لیکن پورے مکی قرآن میں یہ حکم موجود نہیں ہے۔ دراصل یہ حکم اللہ کا نہیں تھا بلکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ یا یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم حضور ﷺ کو وحی خفی کے ذریعے سے دیا۔ وحی جلی میں یہ حکم بہرحال موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں اس کی توثیق فرمائی ہے۔ اس آیت سے اس بات کی وضاحت ہو گئی ہے کہ اے مسلمانو! ایک دَور وہ تھا جب حکم یہ تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو' اُس وقت تو تم

کہا کرتے تھے کہ ہمیں جنگ کی اجازت ہونی چاہئے۔ اور آج جبکہ جنگ کا حکم دے دیا گیا ہے تو تم گھبرا رہے ہو! ــــــ کسی جماعت کے اس درجہ منظم ہونے اور اپنے رہنما' قائد اور لیڈر کے حکم کی پابندی کی ایسی مثال پوری انسانی تاریخ میں آپ کو نہیں ملے گی۔

دوسری مثال اس کے برعکس ہے۔ ایک موقع پر نظم کی عدم پابندی اور حکم عدولی ہوئی۔ وہاں ڈسپلن توڑا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی جو سزا دی گئی اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ اس ڈسپلن کا کیا مقام ہے جو مطلوب ہے ــــــ غزوۂ اُحد میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ اہلِ ایمان کی مدد ہو گی اور واقعتاً نصرتِ الٰہی آئی۔ چنانچہ پہلے ہی مقابلے کے اندر کفار کے قدم اُکھڑ گئے اور مسلمانوں نے انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ لیکن اس موقع پر ان تیر اندازوں کی غلطی سے میدانِ جنگ کا نقشہ بدل گیا جو حضور ﷺ کی طرف سے جبلِ اُحد کے ایک درّے پر معیّن کئے گئے تھے اور جنہیں حضور ﷺ نے حکم دیا تھا کہ چاہے ہم سب کے سب شہید ہو جائیں' ہم میں سے کوئی نہ بچے اور تم دیکھو کہ پرندے ہمارے جسموں سے ہمارا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی یہاں سے نہ ہٹنا ــــــ یہ پچاس تیر انداز تھے جن کے کمانڈر حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ تھے۔ درے پر معین ان صحابہ کرامؓ کی اکثریت سے اس موقع پر یہ اجتہادی غلطی ہوئی کہ انہوں نے سمجھا کہ حضور ﷺ کا حکم شکست کی صورت سے متعلق تھا' جبکہ اب تو برعکس صورت سامنے ہے' فتح ہو گئی ہے اور کفار میدانِ جنگ سے فرار ہو رہے ہیں' لہٰذا اب یہ جگہ چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے' اب ہمیں بھی نیچے میدان میں چلنا چاہئے ــــــ لیکن ان کے کمانڈر حضرت جبیرؓ ان کو روکتے رہے کہ حضور ﷺ کے حکم کو پیش نظر رکھو' ہمیں کسی حال میں بھی حضور ﷺ کے حکم کے بغیر یہاں سے نہیں ہٹنا۔ لیکن پچاس میں سے پینتیس افراد نے حکم عدولی کی ــــــ حضور ﷺ کے حکم کی جو نافرمانی ہوئی اس کے متعلق تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی یہ تاویل کی گئی کہ حضورؐ نے تو شکست کی صورت

میں اس درے کو چھوڑنے سے منع فرمایا تھا' فتح کی حالت کے لئے تو نہیں فرمایا تھا ـــــ لیکن اس دستہ کا جو کمانڈر ہے فیصلے کا اختیار تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ فوج میں دستے کے کمانڈر کی بات کو ماننا ڈسپلن کا عین تقاضا ہے بلکہ فرض ہے۔ دستہ کے سپاہیوں کو کسی بالائی حکم کی تاویل کرنے کا قطعی حق نہیں ہے' یہ حق صرف اس کمانڈر کا ہے۔ چنانچہ اس دستہ کے کمانڈر حضرت جُبَیرؓ تو اپنے دستہ کو روک رہے تھے۔ ان پینتیس افراد نے اپنے کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی کی اور درہ چھوڑ کر میدان میں جا اترے ـــــ خالد بن ولید جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور جن کا شمار جنگی حکمت عملی کے ماہرین میں ہوتا تھا' انہوں نے جب اس درے کو خالی دیکھا تو گھڑسواروں کے ایک دستہ کے ساتھ جبل اُحد کے عقب کا چکر لگا کر درے کے دوسرے سرے سے حملہ کر دیا۔ پندرہ صحابہ رضی اللہ عنہم جو وہاں رُک گئے تھے' جن میں حضرت جبیرؓ بھی شامل تھے' سب کے سب شہید ہو گئے۔ اب خالد بن ولید نے مسلمانوں پر پُشت کی طرف سے حملہ کر دیا۔ فرار ہونے والے کفار نے بھی پلٹ کر ایک زوردار حملہ کیا۔ اس طرح ان پینتیس صحابہؓ کی ڈسپلن کی خلاف ورزی کی وجہ سے فتح شکست سے بدل گئی اور پینتیس مسلمانوں کی حکم عدولی کی سزا ستّر صحابہ کرامؓ کی شہادت کی صورت میں سامنے آئی۔ ان میں حمزہؓ "اَسدُ اللہ واَسدُ رسولہٖ" بھی تھے' جو ہزار افراد کے مقابلہ کا ایک فرد تھا' مصعب بن عمیرؓ جیسی جان نثار شخصیت بھی تھی جن کی تبلیغ و دعوت کو اللہ نے یہ شرفِ قبولیت عطا فرمایا کہ یثرب دارالہجرت اور مدینۃُ النبیؐ بن گیا۔ پھر ان کے علاوہ دوسرے جان نثار انصار و مہاجرین رضی اللہ عنہم نے جام شہادت نوش کیا۔ کل ستّر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ اور تو اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے۔ خود کی کڑیاں رخسار مبارک میں گڑ گئیں' آپؐ پر غشی طاری ہوئی ـــــ مسلمانوں میں سراسیمگی پھیلی' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر اڑی' بہت سے صحابہ دل گرفتہ اور مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ اہل ایمان کے لشکر میں بھگدڑ بھی مچی ـــــ وہ تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ذرا سنبھلی

اور آپؐ صحابہ کرام ؓ کو لے کر جبل اُحد پر چڑھ گئے اور لوگوں نے آپؐ کو زندہ سلامت دیکھ لیا تو پراگندہ جمعیت دامنِ کوہ میں جمع ہوئی ـــــ بہرحال شکست تو ہو گئی۔ اتنا بڑا چرکہ لگ گیا۔

بعد میں سورۂ آل عمران (آیت ۱۵۲) میں اس صورت حال پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان الفاظ میں تبصرہ نازل ہوا: ﴿ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ ﴾ ـــــ اے مسلمانو! اللہ کا وعدہ جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔ اللہ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب تم اس کی اجازت سے اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ لیکن جب تم ڈھیلے پڑے، تمہارا نظم ٹوٹا اور تم نے جب وہ چیز دیکھی جو تمہیں محبوب ہے اور اس کے بعد تم نے حکم کی خلاف ورزی کی تب ہم نے یہ سزا دی ـــــ یہاں "تُحِبُّوْنَ" سے بعض مفسرین نے "مالِ غنیمت" کے بجائے سورۃ الصف کی آیت ۱۳ کے الفاظ ﴿ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ ﴾ سے استشہاد کرتے ہوئے وہ فتح مُراد لی ہے جو بالکل ابتدا ہی میں مسلمانوں کو حاصل ہوتی نظر آ رہی تھی ـــــ البتہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی انقلاب کے لئے کیسی تنظیم مطلوب ہے اور اس میں امیر کی اطاعت کی کیا اہمیت ہے، چاہے وہ پچاس افراد کے دستہ پر ہی کیوں نہ مقرر کیا گیا ہو!

خطابِ دوم

جمعہ ۱۲ اکتوبر ۸۴ء

☆

انقلابی تربیت کا نبویؐ منہج

☆

تربیت و تزکیۂ محمدیؐ کے عناصرِ سہ گانہ

خام ہے جبتک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

ع

با نشۂ درویشی درساز و دمادم زن!

اقبالؔ

- اعادۂ سابق مع توضیحِ مزید
- انقلابی تربیت کا نبویؐ منہاج :
  - انقلابی تربیت کا ہدف
  - خانقاہی تزکیہ و تربیت
  - " اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ "
  - ذوقِ عبادت اور شوقِ رکوع و سجود
  - جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت
  - ہر قسم کی مخالفت اور ملامت سے بے پروائی
- تزکیہ و تربیتِ محمدیؐ کے عناصرِ سہ گانہ :
  - انقلابی نظریات کا استحضار اور انقلابی جذبے کی آبیاری ـــــ بذریعہ تلاوتِ قرآن
  - مخالفت و مجاہدۂ نفس بذریعہ عبادات بالخصوص قیام اللیل و تہجد
  - مخالفت اور ایذا پر صبر و استقامت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ مسنونہ ' تلاوتِ آیاتِ قرآنی ' احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

تُو خاک میں مِل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ ' تعمیر نہ کر!

انقلابی جماعت کی تشکیل و تنظیم کے بعد اگلا مرحلہ افراد کی تربیت کا ہے۔ کیونکہ کچے پکے لوگوں کو جمع کر کے اگر کوئی کام شروع کیا جائے ' خاص طور پر انقلاب کا کام جہاں تصادم کا شدید ترین مرحلہ بھی آتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی ناکامی کا سبب پہلے ہی سے خود فراہم کر لیا ہے۔ اسلئے کہ کچے پکے لوگوں کے ہاتھوں کامیابی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اس کام کیلئے بہت پختہ اور بہت مضبوط لوگ درکار ہیں ـــــ اسی کو علامہ اقبال نے یوں کہا ہے کہ ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹّی کا اِک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو

یعنی پختہ ہونا لازم ہے۔ خام لوگوں سے کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر اگر ریت کے بڑے بڑے گولے بنائے جائیں اور پھر انہیں کسی دروازے یا کھڑکی کے شیشے پر پوری قوت سے دے ماریں تو شیشے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس میں تو بال بھی نہیں پڑے گا ' البتہ پھینکے ہوئے ریت کے گولے بکھر جائیں گے۔ لیکن اسی ریت کو بھٹی میں پکا کر پختہ اینٹ بنا لیں ' پھر اس اینٹ کو شیشے پر پر دے ماریں تو نتیجہ بر آمد ہو گا کہ شیشہ کھیل کھیل ہو جائے گا ـــــ علامہ نے بڑے ہی پیارے اور بڑے ہی مؤثر انداز میں اسے فارسی میں خوب ادا کیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس میں ۳+۳ کے مراحل کو ایک ایک مصرع میں سمو دیا ہے ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

پہلا مرحلہ ہے تیاری کا۔ اس کے لئے درویشی چاہئے۔ خاک میں ملنا پڑے گا' آگ میں جلنا ہو گا' آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزرنا پڑے گا'نفس کے ساتھ مجاہدہ کرنا ہو گا۔ ان سب سے گزر کر پھر جب پختہ ہو جاؤ تو پھر اپنے آپ کو سلطنتِ جم پر دے مارو۔ یعنی اسلام یہ بھی نہیں چاہتا کہ بس اپنی ذاتی اصلاح ہی کو مقصود و مطلوب بنالو۔ یہ نہ ہو کہ خانقاہی مزاج ہی پختہ تر ہوتا چلا جائے اور میدان میں آنے کا مرحلہ ہی نہ آئے بلکہ وہ نظروں سے بالکل اوجھل ہو جائے۔ باطل سے تصادم کے لئے تیاری بھی بہت ضروری ہے' بغیر تیاری کے میدان میں آگئے تب بھی ناکامی ہے۔ لیکن اگر محض تیاری ہی ہوتی رہے اور باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے کا خیال بھی دل میں نہ آئے تو وہ تیاری بے کار ہو جائے گی۔[1]

اس تربیت کے ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ یہ محض انقلاب نہیں بلکہ اسلامی انقلاب کی تیاری ہے' اس لئے کارکنوں کی روحانی اور اخلاقی تربیت ضروری ہے۔ اگر انقلابی کارکن ہی اُن اقدار کے پیکر نہ بن سکیں تو پیشِ نظر انقلاب میں کہاں سے وہ اقدار آ جائیں گی اور کہاں سے وہ اَبعاد (Dimensions) آ جائیں گے جو اس نظام کے لازمی اجزاء میں سے ہیں جو قائم کرنا مطلوب ہے۔ لہٰذا بنیادی طور پر فرق واقع ہو جائے گا۔ ایک تربیت وہ ہے جو کسی دنیوی اور مادی انقلاب کے لئے کافی ہے اور ایک تربیت وہ ہے جو اسلامی انقلاب کے لئے درکار ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

---

(۱) اس موضوع پر ارمغانِ حجاز میں علامہ اقبال کے یہ اشعار بھی نہایت موزوں ہیں ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری — کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی — یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری
شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو — کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!

(مرتب)

انقلابی تربیت کا ہدف

اب جو حزب اللہ وجود میں آئے گی اس کے متعلق پہلے یہ سمجھنا ضروری ہو گا کہ اس حزب اللہ کے سامنے ہدف کیا ہے؟ اگر ہدف اسلامی انقلاب ہے تو پھر لازماً یہ غور کرنا ہو گا کہ اس کے لئے کس قسم کے کارکن درکار ہیں! وہ نقشہ کیا ہے جس کے مطابق کارکنون کو جِدّوجُہد کرنی ہے! ظاہر ہے کہ کسی مہم کے لئے ایک ہدف (Target) معین کیا جاتا ہے' پھر اسی کی مناسبت سے اسباب و وسائل مہیا کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی طے کرنا ہوتا ہے کہ اس مہم کے لئے کس نوع کے اوصاف اور صلاحیتیں رکھنے والے کارکن اور کس قسم کی سیرت و کردار کے لوگ درکار ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی قرآن پاک سے واضح راہنمائی ملتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے : ﴿كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ﴾ "اللہ والے بنو"۔ جب تک اللہ والے وجود میں نہیں آئیں گے' اسلامی انقلاب کا کوئی سوال نہیں۔ محض عسکری تربیت ہو' محض ڈسپلن کی عادت ہو اور محض چلت پھرت اور حرکت ہو' تو ان چیزوں سے انقلاب نہیں آتا۔ خواہ ان چیزوں کی وجہ سے کسی خاص وقت میں کوئی سماں بندھ جائے اور لوگ مرعوب ہو جائیں ــــ لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ اس کام کے لئے اللہ والے درکار ہیں' یعنی رَبَّانِيُّوْنَ اور رِبِّيُّوْنَ ــــ فرمایا گیا : ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ﴾ (آل عمران : ۱۴۶) "اور کتنے ہی انبیاء ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر "رِبِّيُّوْنَ" یعنی اللہ والوں نے جنگ کی ہے' تو وہ ان مصیبتوں کی وجہ سے جو انہیں اللہ کی راہ میں پہنچیں نہ پست ہمت ہوئے' نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ انہوں نے دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے۔"

اس آیت میں جو لفظ "وَهن" آیا ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ اس کے معنی ضعف کے ہیں۔ اب یہی لفظ ضعف بھی اس آیت میں آگیا ہے' ساتھ ہی "اِستکانة" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی بھی کمزوری کے ہیں۔ اگرچہ ان تینوں الفاظ میں کمزوری کا

مفہوم مشترک ہے' لیکن ان تینوں میں ایک باریک اور نازک سا فرق بھی ہے۔
موت سے خوف اور زندگی سے محبت دل میں جو کمزوری پیدا کرتی ہے وہ "وَهن"
ہے۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ ایک حدیث میں بھی آیا ہے۔ (مشکوٰۃ' باب تغیر الناس'
ص۴۵۹) جسمانی کمزوری اور قوتِ ارادی کی کمزوری سے عمل میں جو تعطل پیدا ہوتا
ہے وہ "ضعف" ہے۔ جبکہ حریف کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کی کمزوری اور بزدلی
"اِستکانَة" ہے۔ چنانچہ اس آیت سے یہ بات واضح ہوئی کہ انبیاء علیہم السلام کے
حَوارِیّین جہاں شجاع' بہادر اور جنگجو تھے اور کسی قسم کی کمزوری اور بزدلی ان کے
پاس پھٹکی بھی نہیں تھی' وہاں وہ "رِبِّیُّوْنَ" یعنی اللہ والے بھی تھے۔ بلکہ اگر آیت
کے اسلوب کے پیش نظر یہ مفہوم لیا جائے کہ ان میں شجاعت' پامردی' جان نثاری
کے اوصاف پیدا ہی اس باعث ہوئے تھے کہ وہ "رِبِّیُّوْنَ" تھے' اللہ والے بن چکے
تھے' اللہ کی راہ میں جان دینا ان کو زندگی سے عزیز تر ہو گیا تھا' تو یہ بھی صحیح ہو گا۔ پس
معلوم ہوا کہ اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کا اولاً اللہ والا ہونا لازمی ہو گا اور
یہی لِلّٰہیت ان میں وہ بہادری' دلیری اور حوصلہ مندی پیدا کرے گی کہ وہ اپنے سے
دوگنا نہیں' دس گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد کی کفار کی فوج سے بھی پروانہ وار
ٹکرائیں گے۔ ان کو اللہ کی راہ میں گردن کٹانے کی آرزو اور تمنا سے عزیز تر کوئی
چیز نہیں ہو گی۔ اگر صرف عسکری قوت ہی ہے' صرف مادی تربیت ہی ہے اور صرف
تنظیم ہے' لیکن اللہ سے تعلق کمزور ہے تو وہ کام نہیں ہو گا جسے اسلامی انقلاب'
اعلائے کلمۃ اللہ' اقامت دین اور اظہار دین الحق علی الدین کلہ سے تعبیر
کیا جاتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب انقلابِ اسلامی کے بین الاقوامی
مرحلہ کی تکمیل کے لئے جنگیں ہو رہی تھیں تو دو بڑے بڑے محاذ کھل گئے تھے۔ ایک
شام کا محاذ اور دوسرا ایران کا محاذ ـــــ ایران کی افواج کے سپہ سالار رُستم نے چند
ایرانی جاسوس بھیجے کہ مسلمانوں کی فوجوں کے حالات معلوم کریں اور رپورٹ دیں

تا کہ اندازہ ہو کہ ان کے عزم و ہمت اور حوصلہ و ولولہ (Morale) کا عالم کیا ہے؟
ان کا رنگ ڈھنگ کیا ہے؟ ان کے شب و روز کیسے ہیں؟ بے سرو سامان اور لوٹ مار
کی خوگر اس عرب قوم کی کایا پلٹ اور قلب ماہیت کے اسباب کیا ہیں؟ سامانِ جنگ
ان کے پاس کس درجہ کا ہے؟ رسد رسانی کے انتظامات کیا ہیں؟ فوجوں کی اصل
تعداد کیا ہے؟ وغیرہ۔ تاکہ وہ اس تحقیق کی روشنی میں اپنے لئے جنگ کی حکمت عملی
مرتب کر سکے۔ ان تحقیقات سے یقیناً مدد ملتی ہے اور اگر کسی سمت میں کمزوری یا
ضعف نظر آجائے تو اس سے حریف بھرپور فائدہ اٹھانے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔
ان جاسوسوں نے بھیس بدل کر مسلمانوں کے لشکر میں گھوم پھر کر حالات معلوم کئے
اور واپس جا کر رُستم کو جامع ترین الفاظ میں جو رپورٹ دی وہ یہ تھی کہ یہ عجیب لوگ
ہیں : هُمْ رُهبانٌ بِاللَّيل وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ۔ "یہ رات کے راہب اور دن کے
شہسوار نظر آتے ہیں"۔ ان کی راتیں اپنے اللہ کے حضور میں قیام و سجود' الحاح و
گریہ اور دعا و مناجات میں بسر ہوتی ہیں' ان کی ڈاڑھیاں اور ان کی سجدہ گاہیں
خشیتِ الٰہی کے آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں —— اور یہی لوگ دن کو شہسوار اور
جنگجو نظر آتے ہیں اور میدان جنگ میں برق کی مانند کوندتے' لپکتے' جھپٹتے ہیں اور اس
راہ میں گردن کٹا دینے کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے ہیں —— جبکہ دنیا آج تک
فوجیوں کے جن طور طریقوں سے واقف چلی آ رہی ہے وہ تو یہ ہیں کہ ان کی راتیں
شراب و کباب اور شباب سے کھیلنے میں بسر ہوتی ہیں۔ جس بستی یا اس کے گرد و نواح
میں کسی فوج کا پڑاؤ ہو جائے تو کیا وہاں کسی جوان خاتون کی عصمت محفوظ رہ سکتی
ہے؟ لیکن وہ ایسے انوکھے' نرالے اور عجوبہ روزگار سپاہی تھے کہ ان کی شخصیت کے
یہ دو رُخ "رُهبانٌ بِاللَّيل وَفُرسان بِالنَّهار" اتنے ظاہر و نمایاں تھے کہ غیر مسلم
ایرانی جاسوسوں کو بھی نظر آگئے۔

تو یہ جو دو متضاد کیفیات کو جمع کر دیا گیا ہے یہ درحقیقت تربیتِ محمدی علیٰ صاحبها
الصّلوٰۃ والسّلام کا کمال ہے۔ اُس زمانے میں ان دونوں اقسام کے لوگ موجود تھے۔

شام و فلسطین کے علاقوں میں راہب اور راہب خانے بڑی کثرت سے موجود تھے۔ ایران اور روما اُس وقت کی دو عظیم ترین سلطنتیں تھیں اور ان کے درمیان وقفے وقفے سے سالہا سال تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ چنانچہ ایرانی' راہبوں اور ان کے روز و شب کے معمولات سے خوب واقف تھے۔ بحیرہ راہب کا نام سب نے سن رکھا ہے جس نے حضور ﷺ کو بچپن میں پہچانا تھا ــــــ جب آپؐ ابو طالب کے ساتھ ایک تجارتی قافلہ میں شامل ہو کر شام تشریف لئے گئے تھے ــــــ کہ آپؐ نبیّ آخر الزماں ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ اس راہب کا کتنا علم اور کتنا فہم ہو گا! اسی طرح حضرت سلمان فارسی ؓ کی داستان میں کئی راہبوں کا ذکر آتا ہے۔ اور ایک راہب ہی نے' جبکہ وہ بسترِ مرگ پر تھا' حضرت سلمانؓ کے یہ پوچھنے پر کہ آپ کے بعد میں کس کے پاس جاؤں؟ کیونکہ تلاش حقیقت کی میری پیاس ابھی بجھی نہیں ہے اور آپ کے انتقال کا وقت آ گیا ہے' بتایا تھا کہ کھجوروں کی سرزمین میں آخری نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔ اس طرح ایرانی' راہبوں سے خوب واقف تھے اور یقیناً ان میں چند بڑے خدا رسیدہ راہب تھے۔ لیکن وہ راہب' دن کے بھی راہب تھے اور رات کے بھی راہب۔ ان کے ہاتھ میں تلوار کبھی نظر نہیں آئی تھی اور نہ وہ کسی میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے نظر آئے تھے۔ اسی طرح ایرانی جنگی سپاہیوں سے بھی واقف تھے۔ اس دور میں سلطنت روما اور سلطنت کسریٰ کی لاکھوں کی تعداد میں وقت کے اعلیٰ ترین اسلحہ سے لیس اور بہترین تربیت یافتہ عسکری قوت موجود تھی' اگرچہ عرب اس وقت ان دونوں چیزوں سے نابلد تھے ــــــ پھر تعداد کے تناسب کا یہ عالم تھا کہ دورِ نبوت میں جنگِ مُوتہ کے موقع پر مسلمانوں کے تین ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں رومیوں کی ایک لاکھ کی فوج آ گئی تھی۔ تو ان دونوں مملکتوں کے پاس لاکھوں کی تعداد میں فوجیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ لیکن مسلمان مجاہدین کا عالم یہ تھا کہ ؎ "تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا۔"

جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا یہ کمال ہے کہ ان دو متضاد چیزوں کو

ایسے جمع کیا کہ آپ کے ساتھی رات کے راہب ہونے کے ساتھ ساتھ دن کے مجاہد اور مردِ میدان بن گئے۔ اور جب تک یہ دونوں اوصاف جمع نہیں ہوں گے وہ اسلامی انقلاب کبھی نہیں آئے گا جو اصل مقصود ہے' اور جو برپا فرمایا تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

خانقاہی تزکیہ و تربیت

تربیت و تزکیہ ہی کے مقصد کے لئے بنواُمیہ کے دَور میں راہبانہ اور خانقاہی نظام بنا تھا جو بہت مؤثر رہا ہے اور اس نے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن وہ نظام انقلابی کارکن پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ نظام اس وقت بنا جب اسلامی حکومت قائم تھی۔ اگرچہ اس میں ایک خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ اسلام کے نظامِ خلافت کا یہ اصول کہ جو بھی خلیفہ بنایا جائے وہ کسی خاندانی اور قبائلی تعلق کی بنیاد پر نہیں بلکہ مسلمانوں کے باہمی مشورے سے بنایا جائے' ختم ہو گیا تھا۔ لیکن بہرحال پوری اسلامی مملکت میں اسلامی قانون رائج تھا' فقہاء تھے' مفتی حضرات تھے' قاضی تھے' عدالتیں تھیں اور اسلام کا پورا دیوانی اور فوجداری قانون رائج تھا۔ حدود اللہ جاری تھیں' تعزیرات کا اجراء ہو رہا تھا۔ قاضی حضرات بڑے بڑے باجبروت خلفاء بلکہ صحیح تر الفاظ میں ملوک و سلاطین کو مدّعیٰ علیہ یا شاہد کے طور پر عدالت میں حاضر ہونے کے پروانے جاری کر دیتے تھے۔ حکومت کی سطح پر زکوٰۃ' عشر اور خراج کی تحصیل و تقسیم کا انتظام موجود تھا۔ معاشی ناہمواری اور فرق و تفاوت بہت کم تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کا اٹل اصول نہ صرف تسلیم کیا جاتا تھا بلکہ اس دائرے کے اندر اندر قانون سازی ہوتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے ہیئتِ اجتماعیہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ ان حالات میں انقلابی طرز و نوعیت کی جِدّوجُہد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہاں جو تربیت درکار تھی وہ یہ تھی کہ اچھے مسلمان وجود میں آئیں۔ خدا ترس لوگ معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ موجود رہیں۔ ایسے لوگ چشمِ سر سے نظر آئیں جن کی نگاہ میں دنیا کی

حیثیت پرِ کاہ سے بھی فروتر ہو اور آخرت ہی ان کا مطلوب و مقصود ہو۔ لوگوں میں امانت ہو' دیانت ہو' شرافت ہو' ہمدردی ہو' ومسازی ہو' دلوں میں خدمتِ خلق کا بے پناہ جذبہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں مسلمانوں کا نظامِ تربیت خالص خانقاہی طرز کا بن گیا تھا ـــــ جس میں قلوب کا تزکیہ' اَذکار و اَشغالِ مسنونہ کی تلقین' لوگوں کی نفسیات کے پیش نظر ان کو مختلف وظائف کی تعلیم جیسی چیزیں شامل تھیں۔ اس لئے کہ پیش نظر انفرادی اصلاح تھی' کیونکہ مقبوضاتِ اسلامیہ میں اسلام کا اجتماعی قانون تو نافذ تھا' چنانچہ انقلاب کے لئے کارکنوں کی تربیت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کارکنوں کو اس اعتبار سے میدان میں لانے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا انقلابی تربیت اور انقلابی تصورات والا حِصّہ اس خانقاہی تربیت میں نہیں تھا۔

خانقاہی تربیت کا ہدف کچھ اور ہے' اس کا نتیجہ کچھ اور ہے' جبکہ انقلابی یا مجاہدانہ تربیت کا ہدف کچھ اور ہوگا اور اس کا نتیجہ کچھ اور ہوگا۔ جہاں انقلاب کی ضرورت نہیں وہاں وہ خانقاہی تربیت کافی ہے' لیکن جہاں پیش نظر انقلاب برپا کرنا اور غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کرنا ہو تو ظاہر بات ہے وہاں وہ خانقاہی تربیت کافی نہیں ہوگی۔

اگر بالکل معروضی انداز میں (objectively) دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا طریقِ تربیت خانقاہی نہیں' انقلابی تھا! علامہ اقبال نے اسی فرق کو اس قطعہ میں واضح کیا ہے ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلک مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اللہ اکبر کی تسبیح ایک مجاہد بھی کرتا ہے اور کسی خانقاہ میں بیٹھا ایک صوفی بھی کر رہا

ہے۔ لیکن ان دونوں کی تسبیح میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اب دیکھئے اقبال نے الفاظ وہ استعمال کئے ہیں جو تصوف کے ہیں "خود آگاہ اور خدا مست"۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے آپ کو بھی پہچان چکے ہیں اور محبت الٰہی میں مست بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن محبت الٰہی میں مست ہونے کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ آپ مجذوب ہو کر بیٹھ جائیں' آپ کی قوتِ عمل معطل ہو جائے۔ اور ایک محبت خداوندی وہ ہے کہ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر آپ میدان میں آئیں اور اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے اپنی گردن کٹوا دیں۔ اب یہ دو نتیجے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ لہٰذا ان کو علامہ نے محولہ بالا قطعہ میں نمایاں کیا ہے۔

اس قطعہ کے ذریعے واضح طور پر فرق و تفاوت سامنے آجاتا ہے کہ ایک ہے مذہبی اور خانقاہی نظامِ تربیت اور دوسرا ہے انقلابی و مجاہدانہ نظامِ تربیت۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جو مجاہدانہ اور انقلابی تربیت ہے اس کا شاہکار ہے تربیت محمدی ﷺ۔ چنانچہ حضورؐ نے جن اصحاب کو تربیت دے کر تیار فرمایا وہ سربکف ہو کر میدان میں آگئے: ﴿ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ﴾ (التوبہ:111) "وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔" ان کے لئے گویا زندگی کی آخری تمنا یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں گردن کٹ جائے' جان چلی جائے اور شہادت کی موت حاصل ہو جائے۔ ان کے دلوں میں اس سے بڑی آرزو اور کوئی نہیں ہے۔ اس ضمن میں قرآن حکیم کے چند حوالے ملاحظہ ہوں ـــــ سورۃ الفتح کے آخر میں فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ ﴾

"وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کرے اسے پوری جنس دین پر (پورے نظامِ حیات پر) اور اللہ کافی ہے بطور گواہ۔"

پورے نظام ہائے زندگی اور نظام ہائے اطاعت پر دین حق کا غلبہ ہی تو درحقیقت انقلابی عمل ہے۔ محمد ﷺ اپنے اس فرضِ منصبی کی ادائیگی میں جو کچھ کر سکتے تھے وہ کر گزرے تو اس کے لئے بطور گواہ اللہ کافی ہے۔ کسی اور کی گواہی کی آپ ؐ کو ضرورت نہیں ـــــ اگلی آیت میں فرمایا کہ یہ کام کون کریں گے' یا یہ کام کس نے کیا؟ فرمایا : ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ﴾ یہ درحقیقت محمد ﷺ اور وہ لوگ ؓ جو ان کے ساتھ ہیں' سب کی مشترکہ جدّ وجُہد اور سعی و محنت ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عظمت کو کم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔ اللہ تعالیٰ تو انہیں اپنی کتابِ مبین میں اپنے رسول ﷺ کا معین قرار دے رہا ہے۔ غور کا مقام ہے اسلامی انقلاب اگر اکیلے رسول کے ذریعے سے برپا ہو سکتا ہوتا تو کیوں نہ حضرت نوح علیہ السلام انقلاب برپا کر دیتے! لیکن رسول کے ساتھ ایک ایسی جمعیت اور جماعت کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنے آپ کو رسول کے مقصد کے لئے ہمہ تن وقف کرلے اور کامل تعاون و اعانت کا عملی مظاہرہ دکھادے۔ جہاں رسول کا پسینہ بہے وہ اپنے خون کی ندیاں بہادے۔ وہ رسول کے چشم و ابرو کے اشارے پر اپنی گردنیں کٹوا دینے کو اپنے لئے دنیا کی عظیم ترین نعمت و سعادت سمجھے۔ جب تک ایسے لوگوں کی جماعت و جمعیت موجود نہ ہو انقلاب نہیں آسکتا' اللہ کا دین غالب نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی خصوصیت والی آیتِ مبارکہ : ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ ﴾ سے متصلاً بعد فرمایا : ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ .... ﴾ ـــــ یہ ہے ان دونوں آیات کا باہمی ربط و تعلق۔ یہ ہے نظم آیات جس میں معانی و مفاہیم اور حِکم و بصائر کے کبھی ختم نہ ہونے والے خزانے موجود ہیں۔ یہ ہیں وہ جواہرات اور عجائبات جو قرآن و حدیث اور سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام میں معروضی طور پر تدبّر اور غور و فکر کرنے والے طالب علم کے نصیب میں آتے ہیں۔

انقلابی کارکنوں کے مطلوبہ اوصاف

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ

سورۃ الفتح کی آخری آیات میں آگے چل کر پہلے ان لوگوں کی سیرت کے دو اوصاف اور دو اَبعاد (Dimensions) بیان ہوئے جو اسلامی انقلاب کے لئے درکار ہیں :

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ... ﴾

"محمد رسول اللہ (ﷺ) اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ ہیں' کفار کیلئے نہایت سخت ہیں' آپس میں (مسلمانوں کے حق میں) نہایت نرم دل' شفیق' ہمدرد و دمساز ہیں۔"

اسی کو علامہ اقبال نے یوں تعبیر کیا ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم!
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

پس کسی انقلابی جماعت میں پہلا وصف "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ" ہے۔ ایک انقلابی شخص یہ سمجھتا ہے کہ رائج الوقت نظامِ باطل ہے ـــــ اب جو اس نظام سے وفاداری کا رشتہ رکھتا ہے' وہ چاہے باپ ہو' بیٹا ہو' بھائی ہو' یا کوئی اور رشتہ دار' ان کے ساتھ اس انقلابی کارکن کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ سکتا۔ اگر نظامِ باطل کی فرماں برداری و وفاداری کسی کے اندر ہے تو اس کے ساتھ ایک انقلابی شخص کے تمام روابط' تمام تعلقات حتیٰ کہ رشتہ داریاں ختم ہو جائیں گی' تمام محبتیں منقطع ہو جائیں گی۔

یہ کام تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے عملاً کر کے دکھایا۔ چنانچہ

میدانِ بدر میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے' کفار کے ساتھ تھے اور باپ ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں سرفروشی کے لئے موجود تھے۔ عبدالمطلب کے ایک بیٹے عباس جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے' کفار کے ساتھ اُدھر تھے اور ایک بیٹے حمزہ اَسَدُ اللہ واَسدُ رسولہٖ رضی اللہ عنہ اِدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے۔ عتبہ بن ربیعہ سپہ سالارِ لشکر کفار اُدھر ہے اور بیٹے ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ بن عتبہ اِدھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں ــــــ ماموں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اِدھر اسلامی لشکر کے ساتھ تھے اور بھانجا اُدھر کفار کے ساتھ تھا۔ اس طرح نہ معلوم کتنے قریبی رشتہ دار معرکۂ بدر میں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آراء تھے۔ تمام رشتے کٹ گئے۔ اب یہاں قرابت داری کا کوئی سوال نہیں۔ عبدالرحمٰن بن ابوبکر (رضی اللہ عنہما) نے ایمان لانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ سے ایک موقع پر کہا "اباجان! غزوۂ بدر میں آپ میری تلوار کی زد میں آگئے تھے' لیکن میں نے آپ کی رعایت کی۔" اس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں "بیٹے! تم نے یہ اس لئے کیا کہ تم اُس وقت باطل کے لئے لڑ رہے تھے۔ خدا کی قسم اگر کہیں تم میری تلوار کی زد میں آگئے ہوتے تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا' اس لئے کہ میری جنگ حق کے لئے تھی۔"

جنگِ یرموک کا ایک بڑا دل گداز واقعہ ہے جو "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" کی بڑی نمایاں عکّاسی کرتا ہے ــــــ ایک زخمی کی آواز آتی ہے العَطش العَطش۔ ایک مجاہد پانی لے کر اپنے زخمی بھائی کی طرف لپکتے ہیں کہ اچانک دوسری طرف سے ایک اور زخمی مجاہد کی آواز سنائی دیتی ہے العَطش العَطش۔ وہ زخمی کہتے ہیں کہ پہلے میرے اس بھائی کی پیاس بجھاؤ۔ پانی لانے والے مجاہد اس کے پاس پہنچتے ہیں کہ تیسری طرف سے آواز آگئی العَطش العَطش۔ وہ کہتے ہیں کہ پانی پہلے اس بھائی کے پاس لے جاؤ۔ وہ اُدھر لپکتے ہیں۔ پانی وہاں پہنچا نہیں ہے کہ زخمی کی رُوح پرواز کر گئی۔ وہ پلٹ کر دوسرے زخمی تک پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں وہ بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے۔ پہلے زخمی کے پاس آئے تو وہ بھی اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کر چکا تھا۔ تینوں

بغیر پانی پئے چلے گئے' لیکن سورۃ الحشر کی آیت ۹ میں مومنین صادقین کے لئے جو الفاظِ مبارکہ آئے ہیں : ﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ ("خواہ اپنے اوپر کتنی ہی تنگی ہو اہلِ ایمان اپنے دوسرے بھائیوں کو اپنے سے مقدّم رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ شہداء کرام اس کی عملی تصویر پیش کر گئے۔ پھر حضور ﷺ نے ہجرت کے بعد مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کے درمیان جو مؤاخات قائم فرمائی' تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔

پس ان کی شخصیت کا ایک وصف تو یہ ہے کہ محبت کے' دوستیوں کے' قرابت داریوں کے پیمانے بالکل بدل گئے ہوں ___ اگر یہ نہیں ہوگا تو یہ جماعت انقلابی جماعت نہیں ہے۔ اِدھر بھی محبتیں ہیں' اُدھر بھی تعلقات ہیں۔ دل یہ بھی چاہتا ہے کہ اسلام کا غلبہ ہو جائے لیکن جو لوگ نظامِ باطل کی گاڑی کھینچ رہے ہیں ان سے بھی گاڑھی چھن رہی ہے اور دلی دوستیاں بھی نبھائی جا رہی ہیں' تو ان طریقوں سے انقلاب نہیں آتا ___ تمام دلی محبتیں' تمام ہمدردیاں ان لوگوں کے لئے سمٹ آئیں جو راہِ حق میں ان کے ہم سفر اور ساتھی ہیں۔ یہ ہے ہمارے دین اور ایمان کا تقاضا اور یہ ہے اسلامی انقلاب کے کارکنوں میں مطلوب و مقصود پہلا وصف!

ان "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" کا اللہ کی نگاہ میں کیا مرتبہ' کیا مقام اور کیا وقعت ہے اسے اس حدیثِ قدسی سے سمجھئے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکار ہوگی : ((اَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِي الْيَوْمَ اُظِلُّهُمْ تحتَ ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّي)) "کہاں ہیں وہ لوگ جو میرے جلال کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟ آج کے دن میں ان کو اپنے عرش کے سایہ میں پناہ دوں گا کہ اِس دن میرے عرش کے سائے کے سوا کہیں اور کوئی سایہ نہیں" ___ اس کی تائید اس حدیثِ مبارکہ سے بھی ہوتی ہے : ((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ)) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "جس نے کسی سے اللہ کے لئے محبت کی اور کسی سے اللہ ہی کے لئے علیحدگی اختیار کی

اور کسی کو اللہ کی خوشنودی کے لئے دیا جو کچھ دیا اور اللہ ہی کی رضا کے لئے روکا جو کچھ روکا تو یقیناً اس شخص نے اپنے ایمان کی تکمیل کرلی۔"

ذوقِ عبادت اور شوقِ رکوع و سجود

سورۃ الفتح میں انقلابی کارکنوں کا دوسرا وصف یہ بیان ہوا : ﴿ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ﴾ "تم دیکھو گے ان کو رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے۔ وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں۔"

یہ دوسرا وصف ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھیوں کے معمولات کا جزوِ لاینفک بن چکا تھا۔ اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کی تربیت کا یہ وہ رُخ ہے جسے ایرانی جاسوسوں نے رُہبان باللیل سے تعبیر کیا تھا۔ حضر ہو کہ سفر ہو' امن ہو کہ جنگ ہو' ان اللہ والوں کے ان مشاغل میں فرق نہیں آتا تھا۔ ایک طرف عالم یہ ہے کہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے' اللہ کے باغیوں اور سرکشوں سے تمام دوستیاں' محبتیں' تمام رشتہ داریاں اور تعلقات ختم ہو چکے ہوں اور دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت

اسلامی انقلابی پارٹی کے وابستگان کا تیسرا وصف ہے جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جوش اور ولولہ ــــــ اور شہادت کی موت کی تمنّا اور آرزو۔

اللہ والوں کی اس انقلابی جماعت کے کارکنوں کے سامنے علائقِ دنیوی اور سامانِ زیست کی محبت کے مقابلہ میں اللہ' اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کی اہمیت کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ تنبیہ واضح کسوٹی ہے کہ :

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ

وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی يَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○ ﴾ (التوبہ : ۲۴)

"(اے نبی! ﷺ) ان سے کہہ دیجئے : اگر تمہیں اپنے باپ' اپنے بیٹے' اپنے بھائی' اپنی بیویاں' اپنے رشتہ دار' اپنے وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں' اپنے وہ کاروبار جن کے مندے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور اپنے وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں (جو تم نے بڑے ارمانوں سے بنائے اور سجائے ہیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ سے' اس کے رسولؐ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے' تو جاؤ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے' اور اللہ ایسے نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔"

اس آیت کے اختتام کا جو اسلوب ہے اس کے پیش نظر "فَتَرَبَّصُوْا..." کی ترجمانی اور تعبیر یوں مناسب ہے "جاؤ دفع ہو جاؤ اور انتظار کرو حتیٰ کہ اللہ تم جیسے فاسقوں کے متعلق اپنا فیصلہ فرما دے"۔ غالباً اسی آیت سے تأثر لے کر علامہ نے اپنی مشہور نظم "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" میں یہ شعر کہا ہے ؎

یہ مال و دولتِ دنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا اِلٰہ اِلا اللہ!

انقلابی کارکنوں کے اوصاف کا جامع نقشہ

اس ضمن میں ایک کامل نقشہ کے اعتبار سے سورۃ المائدہ کی آیات ۵۴ تا ۵۶ نہایت جامعیت کی حامل ہیں جن میں سے آیت نمبر ۵۴ اہم ترین ہے۔ فرمایا :
﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ... ﴾ "اے اہلِ ایمان! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر گیا..." پھر جانے میں ہٹ جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس

سے ایک تو ظاہری ارتداد مراد ہے۔ یعنی کوئی اسلام ہی کو چھوڑ دے' کافر ہو جائے' کسی کذّاب مدّعیٔ نبوت پر ایمان لے آئے ـــــ جیسے لوگ مسیلمہ پر ایمان لے آئے۔ ہمارے دور میں مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان لے آئے۔ ایک تو یہ قانونی اور ظاہری اتداد ہے' لیکن ایک باطنی اور حقیقی ارتداد ہوتا ہے' یعنی منافقت ـــــ اندر سے کافر لیکن ظاہری طور پر اور قانونی اعتبار سے مسلمان۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی کی نماز جنازہ حضور ﷺ نے پڑھائی۔ بظاہر وہ مسلمان تھا لیکن بباطن مرتد و کافر۔ اسی طریقے سے جو شخص بھی اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے میدان میں آتا ہے اور پھر اپنی جان کی محبت کی وجہ سے' رشتہ داروں اور مال و اسبابِ دنیا کی محبت کی وجہ سے پیچھے ہٹتا ہے ـــــ تو یہ بھی ارتداد ہے' اگرچہ یہ قانونی ارتداد نہیں ہے۔ جیسے منافق قانونی طور پر مرتد نہیں ہوتا' حقیقت کے اعتبار سے مرتد ہوتا ہے' اسی طرح وہ شخص ہے جو اقامتِ دین اور اظہار دین الحق علی الدّین کلّہ کی فرضیت کو سمجھ کر بھی دنیوی مفادات و تعلقات کی وجہ سے اس فریضہ کی ادائیگی سے جان چرا رہا ہے۔ اپنی جان پیاری ہے' یا مال پیارا ہے' یا دنیا پیاری ہے' لہٰذا پیچھے ہٹ رہا ہے تو یہ بھی درحقیقت ارتداد ہے' اگرچہ اس پر قانونی ارتداد کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا۔

انہی لوگوں کو یہاں للکارا جا رہا ہے : "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو" ـــــ یعنی ایمان کے مدّعی ہو۔ جو کوئی بھی تم میں سے ارتداد اور پسپائی اختیار کرے گا وہ سُن رکھے ﴿ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ ﴾ اللہ تعالیٰ انہیں دفع کرے گا' مسترد کر دے گا اور کسی دوسری قوم کو لے آئے گا ـــــ اور اس قوم کے ہاتھ میں اپنے دین کا جھنڈا تھما دے گا۔ وہ قوم اللہ کے دین کے قیام و نفاذ کے لئے مجاہدہ کرے گی' جس میں یہ اور یہ اوصاف ہوں گے۔ اب اسی آیت میں آگے چار اوصاف وارد ہوئے ہیں۔

پہلا وصف ﴿ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ ﴾ "اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس (تعالیٰ) سے محبت کریں گے"۔ تو یہ ان کا اور اللہ کا تعلق ہے۔ اسی کا ایک مظہر ہے قیام اللیل ـــــ دوسرا وصف ہے ﴿ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾

"اہل ایمان کے حق میں بہت نرم' کافروں کے حق میں بہت سخت"۔ یہ دونوں چیزیں تو وہی ہیں جو سورۃ الفتح میں بایں الفاظ آئی ہیں : ﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ البتہ یہاں ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ یہاں تیسرا وصف آ رہا ہے ﴿ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ کے الفاظ میں 'یعنی وہ اپنی پوری قوتیں 'ہمہ تن' ہمہ وجوہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے لگا دیں گے۔ اور چوتھا وصف ﴿ لَا يَخَافُوْنَ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ ﴾ کے الفاظ میں بیان ہو رہا ہے 'یعنی اس کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ بددل اور خوف زدہ ہوں گے اور نہ ہی کوئی تاثر لیں گے۔

ہر قسم کی ملامت و مخالفت سے بے پروائی

یہ ملامت مخالفانہ بھی ہوتی ہے اور ناصحانہ بھی۔ لوگ ہمدرد بن کر کہتے ہیں : میاں اپنے کیریئر کی فکر کرو' کچھ تو اپنے مستقبل کا خیال کرو' اپنی اولاد کے متعلق سوچو' بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں ـــــ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ پاگل اور دیوانے ہو گئے ہو؟ کہ بس ایک دھن تم پر سوار ہو گئی ہے' کچھ تو سوچو اور اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ یہ ناصحانہ انداز کی مخالفت ہے۔ دوسری مخالفانہ انداز کی ملامت ہوتی ہے : شیخ چلی کے خواب دیکھ رہے ہو! صدیوں سے جمے جمائے نظام کو بدلنے کیلئے کھڑے ہو رہے ہو؟ ہم نے اپنے آباء و اجداد سے جو نظام ورثہ میں پایا ہے اس کی مخالفت کر رہے ہو۔ کیا ہمارے اسلاف نادان تھے جو اس نظام کو قائم کر گئے اور کیا ہمارے موجودہ عمائدین و قائدین بیوقوف ہیں جو اس نظام کو چلا رہے ہیں؟ پھر ان کی سیادت وقیادت ہے' ان کا اثر و رسوخ ہے' ان کے ہاتھ میں قوت و طاقت ہے' ان کے مالی و معاشی مفادات اس نظام سے وابستہ ہیں۔ تم مٹھی بھر سر پھرے کیا تیر مار لو گے؟ ـــــ ان دونوں ملامتوں سے کوئی اثر لئے بغیر اپنی توانائیاں' اپنی قوتیں' اپنی صلاحیتیں اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لئے لگانا' یہ ہے چوتھا وصف۔ جو لوگ یہ چاروں اوصاف اپنے اندر پیدا کر لیں گے ان کو اللہ نے "حِزْبُ اللّٰهِ" کہا

ہے : ﴿ فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ جن لوگوں کے اندر یہ بیان کردہ اوصاف پیدا ہو جائیں وہ لوگ حزب اللہ بن جائیں گے' یہ وہ پارٹی بن جائیں گے جن کی محبتیں بھی اپنے ہی دائرہ میں ہوں گی۔ وہ اللہ سے 'اُس (تعالیٰ) کے رسولؐ سے اور اہلِ ایمان سے محبت کریں گے۔ اور جن سے ان کی مخاصمت اور مخالفت ہو گی' مجاہدہ اور مجادلہ و مقاتلہ ہو گا وہ بھی صرف اور صرف اللہ اس کے رسول ﷺ اور دینِ حق کی سربلندی کے لئے ہو گا۔ کوئی ذاتی غرض' کوئی ذاتی عداوت' کوئی ذاتی دشمنی' اس دنیا کا کوئی ذاتی مفاد ان کے پیش نظر نہیں ہو گا۔

ایسے لوگوں کے لئے پہلی نوید ہے : ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ ﴾ ہے۔ یعنی جن لوگوں میں مطلوبہ اوصاف پیدا ہو جائیں تو "یہ ان پر اللہ کا فضل ہے' وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے"۔ انسان کی اس سے بڑی سعادت اور کون سی ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کے دین کے لئے جبکہ وہ غالب نہ ہو بلکہ سرنگوں ہو' خود جادۂ حق پر ثابت قدم رہ کر' اس راہ کی مشکلات و موانع کا مواجہہ کر کے اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اپنا تن من دھن لگاتا ہے۔ وہ نوعِ انسانی کو آخرت کے عذاب اور اللہ کے دین سے روگردانی کے باعث دنیا میں پیدا ہونے والی افرا تفری اور فتنہ و فساد سے بچانے کے لئے اپنی توانائیاں' صلاحیتیں اور وسائل لگاتا ہے۔ اسے یہ توفیق بھی اللہ کے فضل سے ملتی ہے اور اللہ کا فضل غیر محدود ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ اس کے فضل کا اہل اور مستحق کون سا بندہ ہے۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ اللہ کا وعدہ ہے : ﴿ فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ ﴾ اللہ کا اس حزب اللہ سے وعدہ ہے کہ وہ غالب ہو کر رہے گی ـــــــ یہی بشارت اور یہی وعدہ سورۂ آل عمران میں بایں الفاظ فرمایا گیا : ﴿ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ ﴾ "اور نہ سُست ہو نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔" سربلندی اور غلبہ کا وعدہ یہاں مشروط ہے حقیقی ایمان اور قلبی یقین سے' جس کا عملی مظہر ہے اپنی جان

و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد ـــــ جیسا کہ سورۃ الحجرات میں حقیقی ایمان کی تعریف میں فرمایا :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ ﴾

"مومنین تو صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول ؐ پر' پھر شک میں نہ پڑے اور جنہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے' اور ایسے لوگ ہی اپنے دعوئ ایمان میں سچے ہیں۔"

ایسے مؤمنین صادقین' ایسے سرفروشوں اور جاں نثاروں کے ساتھ اللہ کا وعدہ ہے غلبہ اور سربلندی کا۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو وفا کرنے والا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ حزب اللہ کو جو تربیت درکار ہے اس کا ہدف مجاہدانہ کردار اور تعلق مع اللہ پیدا کرنا ہے۔ اور جب تک ان کے اندر یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوں گی اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔

تزکیہ و تربیتِ محمدیؐ کے عناصرِ سہ گانہ

تزکیہ و تربیت کے لئے جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے جو نظام اختیار فرمایا اِس کے تین عناصر ہیں' جن کو جان لینے پر ہی اِس تربیت کے نظام کو سمجھ لینے کا دارومدار ہے' البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ زیر بحث انقلابی تربیت ہے' خانقاہی تربیت نہیں۔ خانقاہی تربیت کے اپنے اہداف و مقاصد ہیں' لیکن اگر اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے تو آج کے دور میں وہ خانقاہی تربیت نہیں بلکہ مجاہدانہ تربیت درکار ہے۔ چنانچہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے اختیار کردہ نظامِ تزکیہ و تربیت میں مندرجہ ذیل تین عناصر کو

بنیادی اہمیت حاصل تھی۔

انقلابی نظریات کا استحضار اور انقلابی جذبہ کی آبیاری بذریعہ تلاوتِ قرآن

اِس مجاہدانہ تربیت کے لئے سب سے پہلی لازم چیز یہ ہے کہ جو شخص بھی اس میدان میں آئے اس کا اپنے اِس انقلابی نظریہ کے ساتھ شعوری تعلق پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے۔ اگر کہیں اپنے انقلابی نظریہ کے ساتھ ذہنی تعلق کمزور ہو جائے گا تو وہ شخص مضمحل ہو جائے گا اور پھر وہ انقلابی کام نہیں کر سکے گا۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے حصول کے لئے قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ میں سب سے زیادہ زور قرآنِ حکیم کی تلاوت پر دیا گیا ہے۔ نہایت نامساعد ماحول اور شدید ترین مخالفت کے دنوں میں نبی اکرم ﷺ کو یہی حکم دیا جا رہا ہے : ﴿ اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ ﴾ (العنکبوت : ۴۵) "(اے محمد ﷺ) تلاوت کرتے رہا کرو اُس کتاب کی جو اللہ نے آپؐ پر نازل کی ہے" ـــــ غور کیجئے کہ یہ حکم صرف حضورؐ کو نہیں ہے بلکہ آپؐ کی وساطت سے تمام اہلِ ایمان کو دیا جا رہا ہے کہ اگر اس انقلاب کے لئے تمہیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہے تو تمہارا شعوری' ذہنی و قلبی تعلق اس نظریہ کے ساتھ مضبوط ہونا چاہئے۔ اگر وہ کمزور پڑ جائے گا تو اس جدّوجُہد کے لئے جو جذبہ درکار ہے وہ بھی مضمحل ہو جائے گا ـــــ آگے فرمایا : ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ ﴾ "اور نماز کو قائم رکھو' بلاشبہ نماز فحش اور بُرے کاموں سے روکنے والی چیز ہے"۔

یہاں دو چیزیں جمع کر لیں۔ یعنی قرآن اور نماز۔ اس لئے کہ نماز کا جزوِ اعظم بھی قرآن ہے۔ قرآن کا لُبِّ لباب سورۂ فاتحہ ہے' اس کی تلاوت نماز کی ہر رکعت میں لازمی ہے۔ اس کے ذریعے سے توحید کے ساتھ ہمارے ذہنی رشتہ کی استواری اور ہمارے عہد کی تجدید ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم پڑھتے ہیں : ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ

الْعٰلَمِيْنَ ○ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ ﴾ تو ہم توحیدِ نظری یا توحید فی العقیدہ کا اعادہ کرتے ہیں اور جب ہم کہتے ہیں : ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ ﴾ تو ہم توحید عملی یعنی اللہ کی عبادت و استعانت کا اقرار کرتے ہیں ـــــ اسی طرح سورۂ کہف اُس زمانے میں نازل ہوئی جبکہ مکّہ میں قریش کی طرف سے حضور ﷺ کے قتل کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ یہ مکّی دور کا آخری حصہ ہے۔ اس میں حضورؐ کو کیا حکم دیا جا رہا ہے! ﴿ وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ڗ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○ ﴾ "(اے نبی ﷺ) تلاوت کیا کرو اس کتاب کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف وحی کی گئی ہے۔ اس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں۔ اور تم اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہ پاؤ گے"۔ یاد رہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تمام اہلِ ایمان بھی اس حکم کے مخاطب ہیں کہ اِس کتاب کی تلاوت کرو اور اس کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط بناؤ۔ اِس کتاب کے ساتھ جس کا تعلق جتنا مضبوط ہو گا اتنا ہی انقلابی نظریہ کے ساتھ اس کا شعوری اور قلبی تعلق مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ دوسرے انقلابات کے نظریئے انسانی ذہنوں کی پیداوار ہیں جبکہ اسلامی انقلاب کا نظریہ وحی کے ذریعے سے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ قرآن سے تعلق' زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت' نماز میں زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھنا ضروری ٹھہرایا گیا۔ خصوصاً تہجّد کے وقت اس کا التزام ہو اور ﴿ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴾ کے مصداق نمازِ فجر میں قرآن مجید کی طویل قراءت ہو۔ اسی لئے اس کو "قرآن الفجر" کا نام دیا گیا۔ باقی نمازوں میں اتنی طویل قراءت نہیں ہوتی' لیکن فجر کی نماز میں طویل قراءت مطلوب ہے۔ فرمایا گیا کہ جان لو قرآن پڑھنا فجر کا مشہود ہے۔ یعنی اس کی گواہی دی جاتی ہے۔ اس موقع پر فرشتے سب سے زیادہ تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ رات کے فرشتے بھی' جن کی ڈیوٹی ختم ہو رہی ہوتی ہے اور دن کے فرشتے بھی' جو آ کر چارج

لیتے ہیں، فجر کی نماز کے وقت دونوں جمع ہوتے ہیں۔

درحقیقت تربیتِ محمّدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کے نظام کی سب سے اہم اور اولین شق قرآن کو زیادہ سے زیادہ ٹھونک ٹھونک کر اپنے ذہن و قلب میں اتارنا ہے۔ ذہن کی گتھیوں کو سلجھانے، آئینہ قلب کو صیقل کرنے، ایک بندۂ مومن کے باطن کے نور کو اُجاگر کرنے اور اس میں ایک تازہ ولولہ اور جوشِ عمل پیدا کرنے کے لئے قرآن حکیم سے زیادہ مؤثر شے اور کوئی نہیں ہے۔ یہ کتابِ مبین ہے، جو ﴿ تَبۡصِرَةً وَّذِكۡرٰى لِكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِيۡبٍ ﴾ بن کر نازل ہوئی ہے۔ یعنی "سیدھی راہ دکھانے والی اور یاددہانی ہر اُس بندے کیلئے جو اللہ کی طرف رجوع کرے۔"
اسی بات کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے کہ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یعنی یہ قرآن اگر کسی کے ذہن میں اتر جائے گا اور اس کے دل میں رچ بس جائے گا تو اس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہو جائے گا اور اس کی شخصیت بدل جائے گی۔ اور جب اندر انقلاب آئے گا تو یہ بالآخر ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔
پھر علامہ نے یہ بھی کہا کہ اپنے نفس کے تزکیہ کیلئے بھی اس قرآن سے زیادہ مؤثر شے اور کوئی نہیں ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ اُو گم اندر اَعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی!
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی!!

یعنی ابلیس کو قتل کر دینا آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ تو انسان کے دل پر جا کر گھات لگاتا ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ يَجۡرِىۡ مِنَ الۡاِنۡسَانِ مَجۡرَى الدَّمِ ﴾ "یقیناً شیطان انسان کے جسم میں خون کی مانند دوڑتا

ہے"۔ پس جو زہر پورے جسم میں سرایت کر گیا ہو' اس کے لئے تریاق بھی وہ درکار ہے جو پورے وجود میں سرایت کر جائے اور وہ تریاق صرف قرآن ہے۔ اس کو اپنے باطن میں اتارو۔ اس کو اتارنے کا عمل یہ ہے کہ اسے بار بار پڑھو' اسے hammer کرو' اسے ٹھونک ٹھونک کر اپنے اندر اتارو۔ یہ نہیں کہ ایک بار پڑھا اور سمجھ لیا' بلکہ اس کو پڑھتے رہو۔ اِس طریقہ سے یہ قرآن رفتہ رفتہ انسان کے وجود میں سرایت کرتا ہے۔

تلاوتِ قرآن کے انقلابی نظریہ اور تربیت محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کے ساتھ منطقی ربط و تعلق سے واضح ہوا کہ انقلابی کارکن کے لئے اہم ترین بات یہ ہے کہ اس کا ذہنی و قلبی تعلق اپنے انقلابی نظریہ کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔ یہ تعلق کمزور رہے گا تو انقلاب کے لئے قربانی کا مطلوبہ جذبہ بھی مضمحل رہے گا۔ اور قرآن چونکہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا نظریہ ہے' للٰذا تربیتِ محمدیؐ کی پہلی شق یہی ہے کہ اِس قرآن کو مسلسل اور پیہم محنت کر کے انسانوں کے اندر اتارا جائے۔

مخالفت و مجاہدۂ نفس بذریعہ عبادات
بالخصوص قیام اللّیل و تہجّد

اسلامی انقلابی تربیت کا دوسرا عنصر نفس کی مخالفت ہے۔ یہ نفس جسے ہم ID یا LIBIDO بھی کہہ سکتے ہیں' جس کے لئے قرآن کی اصطلاح "نفسِ امارہ" ہے' یہی راستہ کی رکاوٹ بنتا ہے۔ دنیا کی محبت' مال کی محبت اور دیگر خواہشاتِ نفس آدمی کا راستہ روکتی ہیں' بقول جگر ؎

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

انسان کو عافیت اور عیش و آرام درکار ہے' وہ دولت چاہتا ہے' شہرت چاہتا ہے۔

اور یہ حُبِّ مال ' حُبِّ جاہ ' حُبِّ دنیا ' علائقِ دنیوی اور ساز و سامانِ دنیا کی محبت ہی تو بندۂ مومن کے راستے کی اصل رکاوٹ ہے۔ ان کو جمع کرلیں تو یہ ہے نفس ـــــ اِس نفس کی مخالفت دوسری شق ہے تربیتِ محمدیؐ کی ـــــ اس کے لئے ہمارے دین میں عبادات کا نظام رکھا گیا ہے ' جنہیں اب ہم نے رسوم (Rituals) بنالیا ہے۔ بالفاظ علامہ اقبال ؒ

رہ گئی رسمِ اذاں ' روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا ' تلقینِ غزالی ؒ نہ رہی

اب وہ صرف مراسِم عبودیت بن کر رہ گئے۔ یہ تو درحقیقت ہمارے انحطاط کا نتیجہ ہے۔ اِس بات کی ضرورت ہے کہ سمجھا جائے کہ تربیتِ محمدیؐ میں عبادات کی اصل غایت اور حقیقی مقام کیا ہے! نماز کی ایک غایت ابھی بیان ہو چکی : ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَاءِ وَالۡمُنۡکَرِ ؕ ﴾ سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴾ "نماز قائم کرو میری یاد کے لئے"۔ انسان اپنی دُنیوی مصروفیات کے دوران دن میں پانچ مرتبہ نکلے تاکہ وقفہ وقفہ سے اسے یاد دہانی حاصل ہو کہ وہ کسی کا بندہ اور غلام ہے ' وہ مختارِ کل نہیں ہے ' اسے اپنے روز مرّہ کے معمولات بھی اسی اللہ کے احکام کے مطابق انجام دینے ہیں جس کے ذکر یعنی یاد دہانی کے لئے وہ دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرتا ہے۔

روزہ رکھنے کی بھی ایک غایت ہے تاکہ نفس کے اندر جو بھوک کا تقاضا ہے ' زبان جو چٹخارے مانگتی ہے ' شہوت کا جو تقاضا ہے ' ان کا روزہ کے ذریعہ سے مقابلہ کرو۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ ڈھال ہے : ((اَلصَّوۡمُ جُنَّةٌ)) نفس کے حملوں سے روکنے والی چیز تمہارے پاس روزہ کی ڈھال ہے ' جو اللہ نے تمہارے لئے فرض عبادت کے طور پر رکھی ہے۔ سال میں ایک مہینہ یعنی رمضان میں تو لازماً روزہ رکھو ' اور اسے تمام مسلمان رکھیں ' ایک اجتماعی ماحول بن جائے۔ لیکن صرف اس پر اکتفا نہ کرو ' بلکہ نفلی روزے بھی رکھو ' ہر مہینہ میں تین دن رکھنے کا اہتمام کرو ' اور اس

روزے کے ذریعہ سے اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کرو۔ تربیتِ محمدیؐ کی یہ دوسری شق ہے۔ نماز اور روزہ دنیا کے Mode of Worship کے عمومی تصور سے بالکل علیحدہ ہیں۔ یہ یقیناً بندگی اور اللہ کے سامنے عاجزی و تذلّل کا ایک اظہار بھی ہے' لیکن یہ چیزیں تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کے وہ بنیادی امور ہیں جن کے ذریعہ سے تربیت دی جانی مقصود ہے۔ انہی کے ذریعے سے انسان کی قوتِ ارادی کو تقویت حاصل ہو گی اور اس میں صلاحیت پیدا ہو گی کہ وہ نفس کے زور آور تقاضوں کا مقابلہ کر سکے۔

اسی طرح زکوٰۃ کی فرض عبادت ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ہی ایتاءِ زکوٰۃ کا حکم ہے۔ یعنی زکوٰۃ ادا کرو' اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ انسان کے دل میں سب سے بڑی جو نجاست پیوست ہو جاتی ہے وہ مال کی محبت ہے۔ یہ گویا بریک ہے۔ جب تک گاڑی کا brake نہیں کھلے گا آپ کتنا ہی ایکسی لیٹر دبائیں انجن پھڑپھڑا کر بند ہو جائے گا۔ مال کی محبت کا بریک لگا ہوا ہے تو جس صحیح رخ پر ایک مسلمان اور ایک مجاہد کا کردار پروان چڑھنا چاہئے' وہ کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ لہٰذا اسے دل سے کھرچ کھرچ کر نکالنا ہو گا۔ اس کے لئے زکوٰۃ جیسے صدقاتِ واجبہ ہیں' پھر صدقاتِ نافلہ بھی ہیں۔ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں ان صورتوں میں خرچ کرو۔ واضح رہے کہ لفظ زکوٰۃ تزکیہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پاک کرنا' صاف کر دینا۔ گویا بریک کھول دینا' رکاوٹ کو دور کر دینا۔ تزکیہ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایک مالی جب اپنے باغ میں دیکھتا ہے کہ اس نے جو پھل یا پھول والے پودے لگائے ہیں' ان کے ساتھ کچھ خود رو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ بھی اگ آیا ہے اور اب یہ جھاڑ اور خود رو گھاس بھی زمین سے غذا لے رہی ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو وہ پوری غذا ان پودوں کو ملے۔ ہوا میں جو قوتِ نمو ہے یہ خود رو چیزیں اس کو بھی جذب کر رہی ہیں۔ یہ نہ ہوں تو یہ پوری قوت ان پودوں کو ملے گی جن کو وہ چاہتا ہے کہ پروان چڑھیں ـــــ چنانچہ وہ مالی کھرپا ہاتھ میں لیتا ہے اور ان تمام خود رو چیزوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اس عمل کا نام عربی

میں تزکیہ ہے۔ انسان کی شخصیت میں جو اوصاف پروان چڑھنے چاہئیں ' ان کی نشوونما اور ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ مال کی محبت اور دنیا کی محبت ہے۔ یہ نجاست ہے جو یہ دل سے نکلے گی تو جو صلاحیتیں بالقُوّہ انسان کے باطن میں موجود ہیں وہ پروان چڑھیں گی۔ تو یہ ہے حقیقت میں تزکیہ کا عمل۔ اور زکوٰۃ کا لفظ تزکیہ سے ماخوذ ہے۔ زکوٰۃ کا اصل مقصد قرآن کے ان الفاظ سے واضح ہے : ﴿ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ﴾ "وہ جو اپنا مال دیتا ہے حصولِ تزکیہ کیلئے"۔ سورۃ التوبہ میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جاتا ہے : ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَکِّیْهِمْ بِهَا ﴾ "(اے نبیؐ) ان مسلمانوں کے مالوں میں سے صدقات (زکوٰۃ) لیجئے تاکہ اس طرح آپ ان کو پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں"۔

نفس کی مخالفت کا جو تیسرا پروگرام اقدمیت و اوّلیت رکھتا ہے اور جو تربیتِ محمدیؐ کا اہم ترین نکتہ ہے 'وہ ہے رات کو جاگنا۔ نیند بھی انسان کے نفس کا بہت بڑا تقاضا ہے۔ جہاں پیٹ کا بھرنا نفس کا تقاضا ہے ' زبان کا چٹخارا نفس کا تقاضا ہے ' شہوت کا جذبہ نفس کا تقاضا ہے ' وہاں نیند ' آرام ' استراحت بھی نفس کا ایک زوردار تقاضا ہے ــــــ لہٰذا نفس کی مخالفت میں سب سے زیادہ انسان کی قوتِ ارادی کو مضبوط کرنے والی شے یہی ہے۔ سورۃ المزّمّل میں فرمایا گیا : ﴿ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلاً ﴾ یعنی نفس کو کچلنے 'نفس کی قوت کو توڑنے اور قابو میں رکھنے کے لئے سب سے مؤثر شے رات کا جاگنا ہے۔

اگرچہ نزولِ وحی سے قبل بھی نبی اکرم ﷺ انسانِ کامل تھے ' آپؐ کی شخصیت اور سیرت بے داغ تھی ' اس پر کوئی دھبّہ نہیں تھا ' دشمنوں نے آپؐ کو اَلصَّادِق اور اَلاَمِیْن مانا ہے ' لیکن اس کے باوجود انذارِ آخرت اور تکبیرِ رب کے کام کیلئے مزید تربیت ضروری تھی۔ سورۃ القلم میں فرمایا گیا : ﴿ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ﴾ اے نبیؐ! آپؐ خلق عظیم کا نمونہ ہیں۔ لیکن بایں ہمہ جو بارِ گراں اور بھاری ذمہ داری آپؐ کے کاندھوں پر آنے والی ہے اس کے لئے ایک اضافی تربیت کی ضرورت ہے

اور وہ ہے قیام اللّیل۔ اور اس میں کیا کیجئے : ﴿ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ﴾ اس قرآن کا آپؐ کے قلبِ مبارک پر نزول ہو۔ اسے ٹھہر ٹھہر کر' رک رک کر پڑھنا ہے' جیسے کہ ہتھوڑے کی چوٹ پڑتی ہے۔ ایک بار کی چوٹ سے بات نہیں بنتی بلکہ بار بار کی چوٹ مقصد کو پورا کرتی ہے : ﴿ کَذٰلِکَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُؤَادَکَ وَرَتَّلْنٰہُ تَرْتِیْلًا ○ ﴾ (الفرقان : ۳۲) "اسی طرح اُتارا تاکہ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو ثبات عطا فرمائیں۔ لہٰذا پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر"۔ تاکہ یہ قرآن آپ کے قلب میں جاگزیں ہو جائے۔

یہ حکم اور یہ کام صرف حضورؐ کے لئے نہیں تھا' بلکہ حضورؐ کے ساتھ آپؐ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی اُس کے لئے بھی تھا۔ چنانچہ اسی سورۃ المزمل کے دوسرے رکوع میں فرمادیا' جو بعد میں نازل ہوا ہے : ﴿ اِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَہٗ وَثُلُثَہٗ وَطَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ ﴾ یعنی "اے نبیؐ! ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپؐ بھی اور آپؐ کے ساتھیوں کی ایک جماعت بھی دو تہائی رات اور آدھی آدھی رات اور تہائی رات کے قریب کھڑے رہتے ہیں"۔ مراد ہے وہ ترتیلِ قرآن کا کام سرانجام دے رہے ہیں جس کا حکم ابتداء میں صرف آپؐ کے لئے آیا تھا ـــــ یہ ہے تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ کا جامع ترین لائحہ عمل جس میں قراءتِ قرآن' اقامتِ صلوٰۃ اور رات کا جاگنا تین چیزیں جمع ہو گئیں۔ اندازہ کیجئے کہ نصف رات تو بہت ہی زیادہ ہے لیکن ایک تہائی شب بھی کم نہیں ہے۔ اگر سردیوں کی رات چودہ گھنٹوں کی اور گرمیوں کی رات نو گھنٹوں کی ہو تو بالترتیب قریباً ساڑھے چار گھنٹے اور تین گھنٹے تو لگائے جائیں گے تب کہیں جا کر کم از کم تقاضا پورا ہو گا ـــــ یہ تھا قیام اللّیل کا مکی دور میں کم از کم نصاب ـــــ مکی دور کے اواخر میں سورۂ بنی اسرائیل میں اِس کا مستقل نصاب بایں الفاظ بیان ہوا ہے : ﴿ وَمِنَ الَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ ﴾ ـــــ دن کے اوقات میں تو اے نبی آپؐ نماز پڑھتے ہی ہیں۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ ہے اور بعض رکعتوں میں قرآن کا دوسرا حصہ بھی

پڑھا جاتا ہے' اور نماز فجر تو گویا ہے ہی قرآن الفجر' لیکن آپ کے لئے یہ کافی نہیں ہے' لہٰذا رات کا ایک حصہ تو اس قرآن کو ساتھ لے کر جاگیئے۔ یہ آپؐ کے لئے زائد ہے۔ یہاں "فَتَهَجَّدْ بِهٖ" کا لفظ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یعنی قرآن کے ساتھ جاگنا مطلوب ہے ـــــ آپؐ کی وساطت سے اُمت اور خاص طور پر اُن لوگوں کے لئے جو تکبیرِ رب' اقامتِ دین' اظہار دینِ الحق علی الدّین کلِّہ کے لئے کمر بستہ ہو جائیں' یہ نفل مشقت قرآن جمع صلٰوۃ ہے۔ تاکہ حالت نماز میں قرآن حکیم کو اپنے قلب وذہن میں اتارنے کا یہ مؤثر ترین طریقہ جاری وساری رہے۔ رات کی تنہائیوں میں طویل قیام میں ترتیل کے ساتھ قرآن کی قراءت دل کے آئینہ کو جس طرح صیقل کرتی ہے اور اس سے قوتِ ارادی کو جو نمو حاصل ہوتی ہے اور اس سے روح کو جو کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اس سے لذت آشنا وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کو یہ توفیق وسعادت ملتی ہے۔

مخالفت و ایذا پر صبر و اِستقامت

نبی اکرم ﷺ کی تربیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ تربیتِ میدان میں اُتارنے کے لئے تھی' محض گوشے میں بٹھانے کی تربیت نہیں تھی۔ اس لئے کہ فوراً کشاکش یا عرف عام میں کشمکش شروع ہو جاتی تھی۔ جہاں زبان سے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا کلمہ نکلا فوراً مار پڑنی شروع ہو جاتی تھی۔ اب یہ جو مار پڑ رہی ہے تو یہ عملی تربیت کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اگر اس کو جھیلو گے تو تمہاری قوتِ ارادی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی' تمہارے اندر صبر و استقامت کے اوصافِ عالیہ ترقی پاتے چلے جائیں گے۔ اگر یہ کشمکش نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ کسی شخص کو تیرنے کی تربیت خشکی پر دیں اور اسے بتائیں کہ تیرنے کے لئے یہ کرنا ہوتا ہے' وہ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن سال بھر کی ٹریننگ سے بھی وہ شخص تیراک نہیں بنے گا' جبکہ زیر تربیت تیراک کو پانی میں اتاریئے اور اسے بتایئے کہ تیرنے کے لئے اسے ہاتھ' پاؤں اور

پورے جسم کو کس طرح استعمال کرنا ہے تو وہ چند دنوں میں بلکہ اگر کوئی ذہین ہو تو ایک ہی دن میں تیراک بن جائے گا ــــ تو محمد ﷺ کی تربیت خانقاہی نہیں ہے۔ گوشے میں بٹھا کر دی جانے والی تربیت نہیں ہے۔

غور کا مقام ہے' محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں کیا کہ لوگوں کو نکال کر کہیں اور لے جائیں اور وہاں تربیت دیں' بلکہ یہ کیا ہے کہ جو شخص جہاں ہے' وہیں تربیت پائے۔ اور وہ شخص وہیں کھڑے ہو کر کہے کہ میں ایک اللہ کو مانتا ہوں' میں جناب محمد ﷺ کو رسول اللہ تسلیم کر چکا ہوں اور آپؐ کے نقشِ قدم اور آپؐ کی سُنّت پر چلنے کا فیصلہ کر چکا ہوں' میں آخرت کے محاسبہ کا یقین رکھتا ہوں۔ اس پر کشمکش شروع ہو جائے گی۔ اپنے گھر میں کشمکش ہو گی۔ اہل و عیال اور رشتہ داروں سے کشمکش ہو گی۔ آج آپ ذرا کسی رسم کو چھوڑ کر دیکھئے' آپ کی برادری آپ کا حُقّہ پانی بند کر دے گی۔ ذرا آپ زمانے کے جو چلن ہیں' جو رواج ہیں ان کو چھوڑ دیجئے' آپ کو یہ نظر آ جائے گا کہ آپ کے بچوں کے لئے رشتے نہیں ملیں گے' آپ کی بچیوں کے لئے کہیں سے پیغام نہیں آئیں گے۔ یہ ہے اصل میں تربیت۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ماریں کھا کر تربیت حاصل کی تھی۔ اُس دورِ سعید اور ہمارے دور میں جو فرق ہے وہ پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔ وہاں کلمہ طیّبہ پڑھنے پر مار پڑتی تھی۔ جس نے کہا : اَشْهَدُ اَنْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ اسے ماریں پڑنا شروع ہو جاتی تھیں۔ یہاں تو آپ ہزار دانے کی تسبیح لے کر بیٹھ جائیں اور اس پر کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہیں' کوئی مخالفت نہیں ہو گی' کوئی مار نہیں پڑے گی' بلکہ ایسے شخص کے احترام و توقیر میں اضافہ ہو گا کہ یہ شخص بڑا اللہ والا ہے۔ آپ راتوں کو جاگئے' قرآن کی تلاوت کو معمولات میں شامل کیجئے' نفلی روزوں کا اہتمام کیجئے' اس پر آپ کو کوئی مار نہیں پڑے گی' بلکہ اگر لوگوں کے علم میں بھی یہ بات آ جائے تو آپ کے تقویٰ اور تدین کی دھوم ہو گی۔

آج کے دور میں کشمکش جو شروع ہو گی وہ اس سے ہو گی کہ "میرے نزدیک

از روئے شریعت یہ کام غلط ہے' میں یہ نہیں کروں گا"۔ بس آپ نے جوں ہی یہ کیا وہیں کشمکش شروع ہو گئی۔ آج جو کشمکش ہے وہ شریعت پر عمل کرنے کی کشمکش ہے۔ اُس مکی دور میں شریعت نہیں تھی' صرف کلمۂ شہادت پر مار پڑتی تھی۔ لیکن یہ طے ہے کہ جب تک مار نہ پڑے' کشمکش نہ ہو' تربیت نہیں ہوتی۔ وہ تربیت خانقاہی تربیت ہے جس میں مار نہیں پڑتی۔ ایک شخص ایک گوشہ میں بیٹھا اوراد و وظائف کی تسبیحات پڑھ رہا ہے تو اس کا بھی فائدہ ضرور ہو گا' لیکن اس کا ہدف وہ نہیں ہے جو تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کا ہے۔ وہ تربیت انقلابی تربیت نہیں ہو گی' خانقاہی تربیت ہو گی۔ اگرچہ اس تربیت سے اچھا مسلمان وجود میں آئے گا' اسے روحانی ترفّع حاصل ہو گا' وہ نیک ہو گا' صالح ہو گا' نماز میں اس کا جی لگے گا' ذکر اللہ میں اسے لذّت حاصل ہو گی۔ یہ سب کچھ اسے حاصل ہو جائے گا لیکن وہ مردِ میدان کبھی نہیں بنے گا' وہ باطل سے پنجہ آزمائی کبھی نہیں کر سکے گا۔ باطل اور طاغوت کو وہ کبھی نہیں للکار سکے گا۔ جبکہ یہاں وہ لوگ درکار ہیں جو میدان میں آئیں' باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے چیلنج کریں۔ اس کے لئے ضرورت ہے اُس تربیت کی جس میں ماریں پڑ رہی ہوں' جس میں گھر والوں اور ماحول کے ساتھ شدید کشمکش سے سابقہ پیش آیا ہو۔ اکبر الٰہ آبادی کا شعر ہے کہ ؎

تُو خاک میں مِل اور آگ میں جل جب خِشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

محمدٌ رسول ﷺ کے جان نثار ساتھی فی الواقع آگ میں جلے تھے۔ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا تھا۔ اب جو شخصیت اِس طرح پک گئی' پختہ ہو گئی' جس نے صبر و مصابرت کا یہ مورچہ سر کر لیا وہ کیا میدان میں کبھی پیٹھ دکھائے گی؟۔ یہ ہے انقلابی تربیت جس پر جب آپ عمل شروع کرتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ "یہ ہے میرا راستہ جس پر میں چلوں گا' چاہے والدین کو ناپسند ہو' چاہے اہل و عیال کو ناپسند ہو' چاہے رشتہ داروں کو ناپسند ہو" معاشرے کے ساتھ آپ کی

کشمکش شروع ہو جائے گی۔ وہ شخص جو رشوت لے رہا ہے اور گھر والے عیش کر رہے ہیں وہ آج طے کر کے دیکھے کہ میں رشوت نہیں لوں گا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سب سے پہلی لڑائی گھر میں ہو گی۔ اس لئے کہ جو دو دو پراٹھے کھاتے تھے اگر ان کو سوکھی روٹی پر گزارا کرنا پڑے تو سب سے پہلے دشمن خود اپنے گھر والے ہوں گے۔ جب تک اس قسم کی کشمکش در کشمکش نہیں ہوتی' اُس وقت تک وہ تربیت نہیں ہو گی جو اسلامی انقلاب کے لئے درکار ہے۔ کوئی شخص چالیس دن کے چلے کے لئے اپنے وطن سے دور تبلیغ کے لئے نکل جاتا ہے' وہاں اسے کوئی نہیں جانتا' اس کی عبادت اور نوافل دیکھ کر لوگ متاثر ہوں گے' مگر اپنے وطن میں وعظ و تبلیغ کرنا مشکل ہے کیونکہ لوگ آئینہ سامنے رکھ دیں گے کہ تم عملی زندگی میں رشوت اور سود سے پرہیز تو کرتے نہیں۔ پس اصل تربیت اپنے مقام اور ماحول میں ہوتی ہے جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فرمائی۔

خطابِ سوم
۱۹ر اکتوبر ۸۴ء
تصادم کا مرحلۂ اوّل:
صبرِ محض
اور
عدمِ تشدّد!
بعنوانِ الفاظِ قرآنی
"کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ"

- **بعض سابقہ نکات کی مزید وضاحت**

- **تصادم کے مراحل**
  - تصادم کا آغاز اصولاً انقلاب کے علمبرداروں
  - کی جانب سے ہوتا ہے !

- **مرحلۂ اوّل : صبرِ محض اور عدمِ تشدّد**
  - داعی کی کردار کُشی اور نفسیاتی حربے
  - جسمانی تشدد اور تعذیب
  - "کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ"

- **عدمِ تشدد کی بعض دُوسری مثالیں :**

  گاندھی کا عدم تشدد
  حضرت مسیحؑ کے اقوال
  سکھوں کی گوردوارہ پربندھک تحریک
  چوراچوری کا واقعہ

- **گاندھی کا اعترافِ حق**
  - علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب (۱۹۱۷ء)
  - کانگریسی وزراء کو ہدایات (۱۹۳۷ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیاتِ قرآنی' احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے دین کا اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا انقلابی پہلو ہماری نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ ہم نے نوعِ انسانی کے عظیم ترین انقلابی جناب محمد ﷺ کی ذاتِ اَقدس پر تقدس' احترام اور تعظیم کا ایک ہالہ اس انداز سے قائم کیا ہوا ہے کہ ہم نے اپنے ذہنوں میں آپؐ کے لئے ایک مافوق الفطرت (Super Human) شخصیت کا ہیولیٰ اور نقشہ جما رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے عقیدت و عظمت کا احساس تو پوری طرح موجود ہے لیکن یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ انقلاب کس طور سے برپا فرمادیا' اور سطحِ زمین پر حضور ﷺ کی جِدّوجُہد کن مراحل سے گزری ہے اور حضور ﷺ نے قدم بقدم خالص انسانی سطح کی کشمکش سے گزر کر اور ہر مرحلہ پر مصائب و شدائد' تکالیف اور مشکلات جھیل کر کس طریقے پر اسلامی انقلاب کو تکمیل تک پہنچایا ہے' ان اہم اُمور کا ہم نے جائزہ ہی نہیں لیا۔ اس لئے کہ اس پہلو سے حضور ﷺ کا اتباع ہمارے پیشِ نظر ہی نہیں رہا۔ یہ تو اُس وقت ہوگا جب کہ دل میں یہ عزم پیدا ہو جائے کہ اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے۔ تب انسان سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا خاص طور پر اس پہلو سے مطالعہ کرے گا کہ وہ کیا اہم نشاناتِ راہ (Land Marks) ہیں جو ہمیں سیرتِ مبارکہ سے اسلامی انقلابی عمل کے لئے ملتے ہیں۔

ایک الزام کی وضاحت

تصادم کے مراحل کے ذکر سے پہلے دو باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

پہلی بات یہ کہ ہمیں لفظ تصادم سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ دُنیا کے سامنے ہمارا انداز جو معذرت خواہانہ اور apologetic رہا ہے کہ اسلام میں تو صرف مدافعانہ جنگ ہے' تصادم اور جارحیت نہیں ہے' اس کو پہلے اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے۔ اس کا باعث اغیار کا یہ شدید اعتراض تھا کہ مسلمان قوم بڑی خونی قوم ہے اور اسلام کی جو بھی اشاعت و تبلیغ ہوئی ہے وہ تلوار کے زور سے ہوئی ہے ع "بُوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے"۔ اَغیار نے ہم پر یہ تہمت اس شدّومد سے لگائی کہ ہم ہاتھ جوڑتے ہی رہ گئے اور معذرت کے انداز سے اس الزام کو اپنے سر سے اُتارنے میں حد سے تجاوز کر گئے۔ یہ انداز اب بالکل بدل جانا چاہئے۔ اور الحمد للہ ہمارے بہت سے اصحابِ علم و فضل کی مدلّل تحریروں کی بدولت بڑی حد تک یہ انداز بدل بھی گیا ہے' لیکن ایسے نام نہاد دانشوروں کی ابھی اچھی خاصی تعداد خود ہمارے یہاں موجود ہے جن کے ذہنوں پر سابقہ دور میں بنی ہوئی فضا کی چھاپ اب بھی موجود ہے اور وہ اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور یہی راگ الاپتے رہتے ہیں کہ اسلام میں صرف مدافعانہ جنگ ہے' اسلام میں کوئی جارحانہ جنگ نہیں ہے' حضور ﷺ نے صرف مدافعت کے لئے جنگ لڑی ہے' حضور ﷺ نے کبھی بھی پیش قدمی کر کے جنگ کا آغاز نہیں کیا' وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں جس انداز سے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہیں وہ انداز بالکل غلط ہے' اِس کو بالکل ختم ہونا چاہئے۔

تصادم کا آغاز انقلاب کے علمبردار کرتے ہیں

یہ حقیقت ہے کہ کوئی انقلابی تنظیم یا انقلابی جماعت جب کسی معاشرے میں اپنی دعوت کا آغاز کرتی ہے تو محض یہ دعوت کا آغاز ہی اس کی طرف سے تصادم کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انقلاب اسی کا نام ہے کہ کوئی کھڑا ہو کر کہے کہ یہ نظام جو چل رہا ہے یہ سراسر غلط نظام ہے۔ جب رائج الوقت نظام کو غلط کہہ دیا جائے اور اس عزم کا اظہار کر دیا جائے کہ اس کو بدلنا ہوگا تو تصادم کا آغاز تو کر دیا

گیا۔ اس لئے کہ جو مراعات یافتہ طبقات ہیں' جن کے Vested Interests اس باطل نظام سے وابستہ ہیں' ان کی عافیت تو اسی میں ہے کہ رائج الوقت نظام قائم رہے' status quo برقرار رہے' دبے ہوئے طبقات جن بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں انہی میں بندھے رہیں' جس طرح کی جکڑ بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں انہی میں جکڑے رہیں۔ ظالم اور استحصالی طبقات ہرگز نہیں چاہیں گے کہ وہ جن ناجائز حقوق کے مالک ہیں وہ ان سے چھن جائیں۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ نظام جیسا بھی ہے ویسا ہی رہے۔ جبکہ آپ کہتے ہیں کہ یہ نظام غلط ہے' اس کو ہم تبدیل کر کے رہیں گے یا اس جدوجہد میں ختم ہو جائیں گے۔ پس تصادم کا آغاز تو آپ نے کیا۔ جو بھی ہو' چاہے وہ فردِ واحد ہو' یا کوئی گروہ یا کوئی جماعت ہو۔ اگر آپ اس نظام کو غلط کہہ کر اس کی تردید کر رہے ہیں' اسے ظالمانہ اور استحصالی کہہ رہے ہیں' اس کو ختم کرنے کا داعیہ لے کر سامنے آئے ہیں تو گویا آپ نے رائج الوقت نظام کو چیلنج کیا ہے۔

یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ تصادم کا آغاز ہمیشہ انقلابی دعوت دینے والوں کی طرف سے ہوتا ہے' چاہے وہ کوئی فرد ہو' گروہ ہو' یا جماعت ہو۔ اگرچہ وہ جماعت ہاتھ نہیں اُٹھاتی' وہ کسی کو گالیاں نہیں دیتی' کسی کو کسی نوع کی جسمانی تکلیف نہیں پہنچاتی' لیکن وہ یہ دعوت لے کر اُٹھتی ہے کہ پورا نظام غلط اور فاسد ہے اور اس داعیہ کا اظہار کرتی ہے کہ یا تو اس نظام کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ کر اپنے نظریہ کی بنیاد پر بالکل نیا نظام قائم کر کے رہیں گے یا اسی کوشش اور جِدّوجُہد میں ہم اپنی جانیں دے دیں گے۔ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر تصادم کا آغاز فرمایا کہ "تمہارا مذہب غلط' تمہارا معاشرہ غلط' تمہارے اخلاق غلط' تمہارا پورا نظام غلط"۔ یہ صدیوں سے قائم و رائج نظام سے بغاوت ہے۔ یہ ان لوگوں کے خلاف چیلنج ہے جو اس نظام میں قیادت و سیادت کے مناصب پر فائز ہیں اور جو اس نظام سے ناجائز اور استحصالی طور طریقوں سے انتفاع کر رہے ہیں۔ پس تصادم کا آغاز داعیٔ انقلاب کرتا

ہے اور وہ جماعت کرتی ہے جو اِس دعوت کو قبول کر کے داعیٔ انقلاب کے اعوان و انصار پر مشتمل ہوتی ہے۔

انقلابی جِدّوجُہد کے ابتدائی مراحل اور اس کے بعد تصادم کے مرحلے کو علاّمہ اقبال کا یہ شعر بڑے اچھے انداز میں واضح کرتا ہے۔

با نشّہ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

اب جبکہ افراد پختہ ہو گئے تو اب اپنے آپ کو سلطنت جم پر دے ماریں۔ یہاں "سلطنتِ جم" سے بطور استعارہ وہاں کا رائج نظام مراد ہے۔ انقلاب اسی طرح آئے گا۔ اگر وہ طاقت محفوظ پڑی رہے' وہ Potential جو فراہم ہوا ہے وہ غیر متحرک اور غیر فعال رہے تو ظاہر بات ہے کہ انقلاب نہیں آسکے گا۔ لہٰذا اس شعر سے بھی اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ تصادم کا آغاز درحقیقت انقلابی جماعت کی طرف سے ہوتا ہے اور تصادم انقلاب کا ناگزیر خاصہ ہوتا ہے۔

صبرِ محض اور عدمِ تشدد کا مرحلہ

درحقیقت تصادم کا آغاز تو اسی لمحہ ہو جاتا ہے جس لمحہ انقلابی دعوت شروع ہوتی ہے' لیکن ابھی اس انقلابی جماعت کو کچھ مہلت درکار ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی دعوت کی توسیع کر سکے' اپنے دعوتی Base کو وسیع کر سکے' لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اسے قبول کریں' اس جماعت میں شامل ہوں۔ پھر ان کی تربیت ہو' ان کو منظّم کیا جائے۔ اس کام کے لئے بڑا وقت اور مہلت درکار ہے۔ جس کو انگریزی میں کہتے ہیں "to buy time" یعنی اپنے دشمنوں سے وقت کو خریدنا ہے' ان سے کچھ مہلت لینی ہے۔ لہٰذا پہلا مرحلہ ہوتا ہے صبرِ محض یعنی Passive Resistance کا۔ معاندین و مخالفین داعی کو پاگل' دیوانہ' مجنوں اور بیوقوف کہیں گے' مگر حکمت دعوت کا تقاضا ہے کہ ان سب کو برداشت کیا جائے

اور جواباً زبان سے کوئی نازیبا جملہ نہ نکلے' ان مخالفین کے تمام استہزاء و تمسخر کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے' مصابرت و استقامت کا مظاہرہ ہو' اپنے موقف پر ڈٹ کر دعوت و تبلیغ کا فرض کماحقہ ادا ہوتا رہے۔ جب مخالفین اس میں ناکام ہو جائیں گے اور دیکھیں گے کہ انہوں نے جس کو مشت غبار سمجھا تھا اور اسے چٹکیوں میں اڑانا چاہا تھا' وہ تو زبردست آندھی بنتی نظر آرہی ہے' عام لوگوں خاص طور پر نوجوانوں کو متاثر کر رہی ہے اور وہ داعی کے اعوان و انصار بن کر اُٹھ رہے ہیں' تو پھر مخالفین آگے بڑھیں گے۔

اس طرح دوسرا مرحلہ تشدّد کا شروع ہوتا ہے۔ معاندین دعوت قبول کرنے والوں پر ظلم و ستم اور مصائب کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ دہکتی آگ پر ننگی پیٹھ لٹاتے ہیں۔ مکہ کی سنگلاخ اور توے کی طرح تپتی ہوئی زمین پر کھینچتے ہیں۔ برچھی سے ایک مظلوم خاتون کو نہایت بہیمانہ طور پر ہلاک کرتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ پاؤں سرکش اونٹوں سے باندھ کر انہیں اس طرح بھگاتے ہیں کہ جسم کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ کسی کو چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں چھوڑتے ہیں۔ کسی کو مادر زاد ننگا گھر سے نکال دیتے ہیں۔ کسی کو اتنا پیٹتے ہیں کہ بس مرنے کی کسر رہ جاتی ہے۔ داعی الی اللہ ﷺ پر دست درازی کرتے ہیں۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں۔ آپؐ کے گھر میں غلاظت پھینکنا معمول بنا لیتے ہیں۔ آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے ہیں کہ چشم ہائے مبارک ابل پڑتی ہیں۔ آپؐ کی پشت مبارک پر عین سجدہ کی حالت میں اونٹ کی نجاست بھری اوجھری رکھ دیتے ہیں۔ آپؐ پر پتھروں کی اس قدر بارش ہوتی ہے کہ جسمِ اطہر لہولہان ہو جاتا ہے۔ آپؐ کا معاشی مقاطعہ ہوتا ہے اور آپؐ کو تین سال تک آپؐ کے قبیلے کے تمام لوگوں کے ساتھ' چاہے انہوں نے دعوت قبول کی ہو یا نہ کی ہو' ایک وادی میں محصور کر دیا جاتا ہے ــــــ لیکن حکم ہے کہ معاندین و مخالفین کے ان تمام متشدّدانہ طرز عمل کو برداشت کرو' جواب میں اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ مت اُٹھاؤ۔ البتہ اپنے موقف پر

ڈٹے رہو' اس سے پیچھے نہ ہٹو' کوئی بھی معافی اور توبہ نامہ دے کر ان مصائب سے بچنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ لیکن ہاتھ اُٹھانے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ جواب میں تشدد کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ہے صبر محض۔

صبر محض کا یہ مرحلہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں مسلسل بارہ برس تک جاری رہا۔ اور اس بارہ سال کے عرصہ میں اس بہیمانہ تشدد کی وجہ سے نہ تو کسی نے کمزوری دکھائی' نہ اپنے موقف سے ہٹا اور نہ ہی کسی نے جواباً ہاتھ اُٹھایا۔ ان حالات میں عام طور پر لوگ desperate ہو کر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ کمال ہی نہیں معجزہ ہے جناب محمد ﷺ کی تربیت و تزکیہ کا' کہ ایک شخص نے بھی آپؐ کے حکم اور ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کی۔ نہ کوئی اپنے موقف سے ہٹا اور نہ کسی نے جواب میں ہاتھ اُٹھایا۔ یہ اہم ترین وقت تھا۔ یہی مہلت تھی جسے محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے بھرپور طریقے پر استعمال فرمایا۔ حق تو یہ ہے کہ ہمیں سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے پورا فلسفۂ انقلاب سیکھنا ہے اور وہیں سے ہمیں اصول اخذ کرنے ہیں۔

"صبرِ محض" کی حکمت

اس صبرِ محض (Passive Resistance) کے مرحلہ کی حکمت یہ ہے کہ ابتداء میں چند باہمت اور سلیم الفطرت لوگ اس انقلابی نظریہ کے قائل اور حامی ہوتے ہیں۔ اگر وہ لوگ Violent ہو جائیں' یعنی تشدد کا جواب تشدّد سے دینے لگیں تو اس غلط نظام کے علمبرداروں کو پورا اخلاقی جواز مل جائے گا کہ انقلاب کے حامیوں کو کچل کر رکھ دیں۔ جب تک انہوں نے ہاتھ نہیں اُٹھایا تو ان مخالفین و معاندین کے چودھریوں اور سرداروں کے پاس کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے۔ چنانچہ اس حال میں اگر وہ تشدد کر رہے ہیں تو بلاجواز کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رفتہ رفتہ عامّتہ الناس کی ہمدردیاں اس انقلابی جماعت کے ساتھ ہونی شروع ہو جاتی

ہیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان لوگوں کو آخر کیوں مارا اور ستایا جا رہا ہے' جبکہ یہ ہمارے معاشرے کے شریف' بے ضرر اور بہترا افراد میں سے ہیں۔ اور یہ لوگ خاموشی سے کیوں ماریں کھا رہے ہیں! اب ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ حضرت بلالؓ کو مکّہ کی سنگلاخ اور تپتی زمین پر گردن میں رسّی باندھ کر اس طرح گھسیٹا جا رہا ہے جیسے کسی مُردہ جانور کی لاش کو گھسیٹا جاتا ہے۔ آخر دیکھنے والے بھی انسان تھے۔ ان کے اندر بھی احساسات تھے!۔ اگرچہ ان میں جرأت اور ہمت نہیں کہ اس بہیمانہ ظلم پر صدائے احتجاج بلند کریں۔ ایسے لوگوں کو اصطلاح میں خاموش اکثریت (Silent Majority) کہا جاتا ہے۔ یہ خاموش اکثریت اندھی اور بہری نہیں ہوتی۔ دیکھتی بھی ہے اور سنتی بھی ہے۔ خاموش تو ہے' بولتی نہیں ہے' لیکن وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی رہتی ہے کہ یہ کیسا ظلم ہو رہا ہے؟ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ بلالؓ جیسے محنتی اور فرض شناس غلام کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیوں ہو رہا ہے! خبابؓ جیسے شریف النفس شخص کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر کیوں لٹایا جا رہا ہے؟ خبابؓ بن الارت پیشے کے اعتبار سے لوہار تھے۔ اور بڑے ہی نیک نوجوان تھے۔ حضور ﷺ کے دامن سے وابستہ ہو کر کردار مزید بلند ہو گیا۔ مکّہ کے سردار ایمان لانے کی پاداش میں ان کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیتے تھے۔ مکّہ کے اندر یہ ظلم اہلِ مکّہ دیکھ تو رہے تھے۔ مگر ظلم کرنے والے ابوجہل' ولید بن مغیرہ' اُمیّہ بن خلف' عتبہ بن ابی معیط اور عتبہ بن ربیعہ وغیرہ بڑے بڑے چوہدری اور سردار تھے۔ ان کے خلاف آواز اُٹھانا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ تو عوام کا ان کے خلاف کھڑے ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' لیکن اندر ہی اندر ہمدردی کے احساسات پیدا ہو رہے تھے' بقول شاعر کیفیت یہ ہو رہی تھی کہ ؏ "جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ"۔ چنانچہ دل اندر ہی اندر فتح ہو رہے تھے۔ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان مظلوموں نے کوئی جرم نہیں کیا' کسی کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی' بس ایک بات کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد

ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ بس یہی ان کا قصور ہے۔ کسی پر انہوں نے آج تک ہاتھ نہیں اُٹھایا' کسی کو انہوں نے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا' پھر ان کے ساتھ یہ ظلم اور تشدّد کیوں ہو رہا ہے؟

اصل میں صبرِ محض کے مرحلے کی حکمت اور اس کا فلسفہ یہی ہے۔ کسی انقلابی جماعت کو اس "صبرِ محض" (Passive Resistance) کے دور میں تین ابتدائی کاموں کو کرنے کی مہلت ملتی ہے۔ یعنی دعوت زیادہ سے زیادہ پھیلانا' دعوت قبول کرنے والوں کو منظم کرنا اور پھر اس مرحلے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان کی تربیت کرنا۔ اس لئے کہ اگلے مراحل کی کامیابی کا انحصار انہی لوگوں پر ہے۔ گویا اگلے تمام مراحل کی کامیابی کا دارومدار ان تمہیدی و ابتدائی مراحل کی پختگی پر ہے۔ اگر ان مراحل کے تقاضوں کو کماحقہٗ ادا کیا گیا ہے اور انقلابی کارکنوں کی سیرت و کردار میں پختگی اور مضبوطی آ گئی ہے تب تو آگے چل کر کامیابی ہو گی' ورنہ وہی بات ہو گی کہ ریت کا گولہ بنا کر شیشے پر ماریں گے تو شیشہ کھڑا رہے گا اور وہ ریت بکھر جائے گی ـــــ پھر ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ ماریں کھا کر لیکن ہاتھ نہ اُٹھا کر ایک طرف ان کارکنوں میں قوّتِ برداشت اور قوّتِ ارادی پروان چڑھتی ہے' اپنے نظریہ سے ان کی وفاداری مضبوط ہوتی ہے اور اس پر انہیں استقامت حاصل ہوتی ہے' جیسے خام سونا کٹھالی میں تپ کر کندن بنتا ہے اسی طرح ان انقلابی کارکنوں میں مظالم و مصائب کی بھٹیوں سے گزر کر ایک آہنی عزم اور پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں ایثار و قربانی کا جذبہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ اور دوسری طرف جور و تعدّی' تشدّد اور ظلم و ستم جھیل کر یہ لوگ معاشرہ کی خاموش اکثریت کے دل جیتتے چلے جاتے ہیں۔

داعی کی کردار کشی اور نفسیاتی حربے

اس صبرِ محض کے بھی دو مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں زبانی

کلامی تشدّد ہوتا ہے۔ یعنی کوفت پہنچاؤ' ذہنی اذیت پہنچاؤ' لیکن کوئی جسمانی تشدد اور جسمانی تکلیف نہ دو۔ اس مرحلہ پر اصل ہدف اور نشانہ خود داعی بنتا ہے' اس کے ساتھی ہدف نہیں بنتے۔ اس لئے کہ ابتداء میں لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص ہے جس کا دماغ خراب ہوا ہے اور یہ ہمارے نوجوانوں کے دماغ خراب کر رہا ہے۔ ان نوجوانوں کو تو انہوں نے reclaim کرنا ہے' انہیں واپس لینا ہے' لہٰذا اُن کے خلاف ابھی ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے بلکہ داعی کی شخصیت کو مجروح کرنے (Character Assassination) کی کوشش ہوگی۔ کہا جائے گا یہ پاگل ہے' fanatic ہے' ساحر ہے' شاعر ہے اور دیوانہ ہے۔ سیرتِ مطہّرہ میں یہ ساری ہی باتیں ملتی ہیں' جن کا تذکرہ ابتدائی مکی سورتوں میں آتا ہے۔ مکی دور کے قریباً تیرہ برس کے ابتدائی تین سال میں صرف نبی اکرم ﷺ پر تشدد ہوا ہے اور تشدد جسمانی نہیں بلکہ صرف زبانی کلامی تشدد کہ ان کو کوفت پہنچاؤ' انہیں ذہنی اذیت پہنچاؤ۔ جیسے کہ قرآن مجید میں سورۃ الحجر میں ان معاندین و مخالفین کا یہ قول نقل کیا گیا ہے : ﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ ﴾ اگر عربی زبان سے ذرا سی واقفیت ہو تو اندازہ ہوگا کہ کتنا زہر میں بجھا ہوا یہ جملہ ہے : "اے فلانے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس پر کوئی ذکر نازل ہو رہا ہے' ہم تو تم کو پاگل سمجھتے ہیں۔" اب یہ بات بھی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنی۔ غور کیجئے آپؐ کی طبیعت پر اس کا کس قدر اثر ہوا ہوگا۔ اس کو کہتے ہیں اعصابی جنگ (War of Nerves) یعنی کسی طرح سے ان کی قوتِ ارادی کو ختم کر دو' ان کے اندر جو آہنی عزیمت ہے کسی طرح اس کو پگھلا کر رکھ دو۔ اسی سورۃ الحجر کے آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں : ﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ﴾ "(اے محمد ﷺ) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس سے آپؐ کا سینہ بھنچنے لگتا ہے (آپؐ کو شدید ذہنی اذیت و کوفت ہوتی ہے)"۔

داعی سوچتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو کل تک میرے قدموں تلے آنکھیں

بچھاتے تھے' جو مجھے دیکھتے ہی کہا کرتے تھے : جَاءَالصَّادِقُ' جاءَالْاَمِیْنُ —— ہر جگہ خیر مقدم ہوتا تھا' ہر ایک مجھ سے محبت کرتا تھا' ہر شخص میرا احترام کرتا تھا' لیکن یہی لوگ ہیں جو آج میرا استہزاء و تمسخر کر رہے ہیں' کوئی مجنون و دیوانہ کہہ رہا ہے' کوئی شاعر و ساحر کہہ رہا ہے۔ سورۃ الدّخان میں فرمایا : ﴿ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۝ ﴾ "اور انہوں نے کہا کہ یہ تو (معاذ اللہ) سکھایا پڑھایا باؤلا ہے"۔ یعنی آپؐ کو کوئی اور سکھاتا پڑھاتا ہے اور یہ آکر ہم پر دھونس جماتے ہیں کہ یہ کلام مجھ پر اللہ کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ حضور ﷺ کے قلبِ مبارک پر کیا گزرتی ہوگی جب یہ باتیں کہی جاتی ہوں گی۔ مزید برآں آپؐ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان پر کسی آسیب کا سایہ ہوگیا ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک روز حضور ﷺ کی خدمت میں عتبہ بن ربیعہ آیا جو قریش کے بڑے سرداروں اور چودھریوں میں سے تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے معاندین و مخالفین میں سے یہ شخص بڑا شریف النفس تھا۔ وہ بڑے ہی مخلصانہ و مشفقانہ اور بڑے ہی مہربانہ و ہمدردانہ انداز میں حضور ﷺ سے کہنے لگا کہ "بھتیجے! اگر واقعی تم پر کسی بد روح کا سایہ ہوگیا ہے تو مجھے بتادو' میرے بہت سے عاملوں اور ماہر فن کاہنوں سے تعلقات ہیں' میں کسی کو بلا کر تمہارا علاج کرا دوں گا"۔ غور کا مقام ہے کہ یہ سن کر حضور ﷺ کے قلبِ مبارک پر کیا گزری ہوگی۔ تشدّد کا پہلا نشانہ بحیثیتِ داعئ اوّل جناب محمّد ﷺ کی ذاتِ اَقدس تھی۔ استہزاء و تمسخر بھی بلاشبہ تشدد ہوتا ہے' بلکہ ذہنی اور نفسیاتی کوفت سے بڑا تشدد کوئی اور نہیں۔ جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ تکلیف انسان کو اُس وقت ہوتی ہے جب اسے ذہنی کوفت پہنچتی ہے۔ چنانچہ ابتدائی تین سال تک اعصاب شکنی کی پوری کوشش ہوتی رہی تاکہ آپؐ کے اعصاب ٹوٹ کر رہ جائیں اور آپؐ میں وہ ہمت باقی نہ رہے کہ کھڑے رہ کر دعوت پیش کرتے رہیں۔ مخالفین کی طرف سے اس کی ایک اور انداز سے بھی کوشش ہوئی تھی۔ بعض عامل لوگوں نے بہت سی ریاضتوں کے ذریعہ سے اپنی آنکھوں کے اندر ایک خاص کشش اور

چمک پیدا کرلی ہوتی ہے اور قوّتِ ارادی کو اپنی آنکھوں میں اس طور سے مرتکز کرلیا ہوتا ہے کہ وہ کسی کو گھور کر دیکھیں تو وہ دہل کر رہ جائے اور اس کی قوّتِ ارادی پاش پاش ہو جائے۔ یہ نفسیاتی مشقیں دُنیا میں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں اور آج کے دور میں تو اس نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کرلی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر ایسی کوششیں بھی کی گئیں سورۃ القلم میں فرمایا گیا ہے : ﴿ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ ﴾ "یہ کُفّار جب "الذّکر" یعنی قرآن سنتے ہیں تو یہ آپؐ کو ایسی نگاہوں سے گھور کر دیکھتے ہیں گویا آپؐ کے قدم اکھاڑ دیں گے (آپؐ کی آہنی قوّتِ ارادی کو پاش پاش کر دیں گے) اور زبان سے کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) یہ ضرور مجنون و دیوانہ ہے۔" استہزاء و تمسخر کے یہ الفاظ آپؐ کے قلبِ مبارک پر تیر کی طرح جا کر لگ رہے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے عاملین کی باقاعدہ خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ اپنی نگاہوں سے جناب محمد ﷺ کی قوّتِ ارادی کو پاش پاش کر کے رکھ دیں۔ پس یہ ہے تشدّد کا پہلا دور یعنی داعیٔ اوّل کو ذہنی کوفت پہنچانے کی ہر امکانی سعی و کوشش۔ چنانچہ پہلے تین سال میں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی اور صاحبِ ایمان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا ہو۔ اس لئے کہ ان کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے "فساد کی اصل جڑ" تو داعیٔ اوّل ہی تھا جو یہ دعوت لے کر کھڑا ہوا۔ لہٰذا وہ کہتے تھے کہ کسی طریقہ سے اس کو اکھاڑ پھینکیں تو فساد ختم ہو جائے گا۔ ہمارے کچھ جوشیلے اور سر پھرے نوجوان ہیں اور ہمارے شرفاء میں سے بھی کچھ لوگ اس کی باتوں میں آگئے ہیں، لیکن اگر ہم نفسیاتی و ذہنی حملوں کے ذریعہ سے اسی داعیٔ اوّل کو بددل (disheart) کر دیں اور اس کی قوّتِ ارادی کو ختم کر دیں تو یہ سب سے کامیاب حربہ ہے۔ پھر کامیابی ہی کامیابی ہے۔

جسمانی تشدّد اور تعذیب

پس پہلے تین سال تو جناب محمدؐ رسول ﷺ اس بد ترین ذہنی و اعصابی تشدد کا نشانہ بنے رہے۔ آغازِ وحی کے بعد چوتھے سال سردارانِ قریش دارالندوہ میں باقاعدہ مشاورت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اب تک ہم نے جو تدبیریں کی ہیں وہ سب ناکام ہو چکی ہیں اور یہ دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہے۔ گویا ؏
"نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے" ۔ اور اب تو یہ آگ ہمارے بارود خانوں تک پہنچ گئی ہے اور ہمارے غلاموں کے طبقہ کے لوگ محمدؐ (ﷺ) کی دعوت کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں۔ ان کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اب کیا ہو گا؟ کیونکہ غلاموں کا طبقہ اس معاشرے کیلئے بڑی افرادی قوت (Human Potential) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نظام میں غلام اپنی قسمت پر قانع تھے اور اس کے ساتھ خود کو reconcile کر چکے تھے کہ ٹھیک ہے' ہمارے نصیب میں یہی کچھ ہے۔ لیکن اگر کہیں ان کے اندر ان کی عزّتِ نفس بیدار کر دی گئی' اور انہیں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ہم بھی انسان ہیں اور ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں تو کیا ہو گا؟ ہمارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ یہ طاقت اگر کہیں ہمارے خلاف کھڑی ہو گئی تو اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کی اس تشویش میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا کہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی دعوت ان کے نوجوانوں میں نفوذ کر رہی ہے جو ایک بڑے خطرہ کی علامت ہے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ عثمان بن عفان ؓ کون ہیں؟ خاندانِ بنو اُمیّہ کا ایک صالح نوجوان۔ مصعب بن عمیر' سعد ابی بن وقّاص' حذیفہ بن عتبہ اور عبداللہ بن مسعود کون ہیں؟ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ یہ اونچے گھرانوں کے نوجوان ہیں۔ یہ اور متعدد دوسرے نوجوان محمدؐ (ﷺ) کے قدموں میں پہنچ گئے۔ لہٰذا کفارِ مکہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب تک ہماری جو حکمت عملی تھی وہ کامیاب اور مؤثر ثابت نہیں ہوئی۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ اب ان پر جسمانی تشدد کرو تاکہ ان کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ ہم میں سے جس کو بھی جس کسی پر کوئی اختیار

اور کوئی اقتدار حاصل ہے وہ اسے ان پر استعمال کرے اور ان کو جور وتعدّی اور ظلم وستم کا نشانہ بنائے تاکہ وہ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ آئیں۔ چنانچہ آغازِ وحی کے چوتھے سال اہل ایمان کے لئے جسمانی تشدد کا دور شروع ہوا۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ابتدائی تین سال تک تو ذہنی تشدد اور torture کا ہدفِ خاص طور پر حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس رہی۔ لیکن اب قریباً تمام اہل ایمان شدید قسم کی تعذیب' تعدّی اور بہیمانہ ظلم وستم کا ہدف بنے۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں' وہ غلام نہیں ہیں' کوئی آقا تو ان کو نہیں مار سکتا۔ لیکن وہاں کے معاشرے کے اصول و رواج کے مطابق آنجنابؓ کا چچا موجود ہے جو بمنزلہ باپ ہے اور اسے اپنے بھتیجے پر اختیار حاصل ہے۔ اس نے حضرت عثمانؓ کو مارا بھی اور بالآخر ایک چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھونی دے دی۔ اب دم گھٹ رہا ہے اور مرنے کے قریب ہیں۔ آخر کوئی وجہ تھی کہ جب نبوت کے پانچویں سال میں حضور ﷺ نے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہجرتِ حبشہ کی اجازت دی تو حضرت عثمانؓ اور آپؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا' جو رسول اللہ ﷺ کی لختِ جگر ہیں' یہ دونوں ان میں شامل تھے۔ جعفرؓ بن ابو طالب بھی ان مہاجرین میں شامل تھے جو بنو ہاشم کے سردار کے بیٹے اور حضرت علیؓ کے بھائی ہیں۔ یہ لوگ غلام تو نہیں تھے۔ لیکن وہاں بزرگوں کو خوردوں پر ایک اختیار حاصل تھا' لہٰذا یہ نوجوان اہل ایمان اپنے گھر والے مشرکین کے تشدد اور مظالم کا نشانہ بن رہے تھے۔

لیکن غلاموں کے ساتھ اس سے بھی بہت آگے بڑھ کر جور وستم کا معاملہ ہوا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ظلم وتشدد کی چکی میں سب سے زیادہ پسنے والے یہی لوگ تھے۔ ان کے تو کوئی حقوق تھے ہی نہیں' کیونکہ وہ اپنے آقاؤں کے مملوک تھے۔ ان کے آقا اگر انہیں ذبح کر دیں تو ان سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے کسی کی بکری ہو تو وہ جب چاہے اسے ذبح کر دے' کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ غلاموں کے ساتھ وہاں جو کچھ ہوا اس کو سن کر سخت سے سخت دل شخص کو بھی

جھرجھری آجاتی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ اُمیّہ بن خلف نے جو کچھ کیا وہ آپ کے علم میں ہے۔ لیکن کوئی نہیں تھا جو اس سے پوچھ سکے کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ ایک گوشت پوست کے زندہ انسان کے ساتھ وہ بہیمانہ سلوک کیا جا رہا تھا جو اگر کسی مُردہ جانور کے ساتھ بھی کیا جائے تو طبیعت میں ناگواری کا احساس پیدا ہو جائے' لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

مکّہ میں ان کے علاوہ ایک اور طبقہ تھا جو حلیفوں کا طبقہ کہلاتا تھا' جو نہ قرشی تھے' نہ غلام تھے' بین بین کی ایک حیثیت کے حامل تھے۔ دراصل مکّہ صرف ایک قبیلے کا شہر تھا' اس میں صرف قریش آباد تھے' اور کوئی دوسرا قبیلہ آباد نہیں تھا —— اس تفاوت کو پیش نظر رکھئے کہ تمدنی اعتبار سے مدینہ منورہ زیادہ ارتقائی مرحلے پر تھا' اس میں پانچ قبیلے آباد تھے' عربوں کے دو قبائل اوس و خزرج اور یہودیوں کے تین قبائل بنو نضیر' بنو قینقاع اور بنو قریظہ —— جبکہ مکّہ تمدنی اعتبار سے ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا اور صرف ایک قبیلے کا شہر تھا۔ اب اس میں یا تو قریش آباد تھے یا اُن کے غلام جو اُن کے نزدیک بھیڑ بکریوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک تیسری کیٹیگری وہ تھی کہ کوئی شخص باہر کا آکر اگر خود کو قریش کی کسی بڑی شخصیت کی حمایت میں دے دے' اس کا حلیف بن جائے تو گویا وہ اس بڑے شخص کے زیر حفاظت مکّہ میں رہ سکتا ہے۔ اس طرح اس قرشی کو اس پر پورا اختیار حاصل ہو جائے گا۔ اس کی حیثیت اگرچہ غلام کی نہیں ہے لیکن وہ پوری طرح آزاد بھی نہیں۔ وہ گویا آزادوں اور غلاموں کے بین بین ایک تیسری مخلوق ہو گئی۔

حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہی تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یمن کے رہنے والے ایک باعزّت انسان تھے۔ انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت ہوئی تھی۔ اسی کے پیش نظر وہ مکّہ میں آئے اور ایک شریف النفس قرشی کے حلیف بن کر اور اس کی پناہ میں آکر مکّہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اسی شخص کی ایک کنیز حضرت سمیّہ (رضی اللہ عنہا) سے آقا کی اجازت سے ان کا

نکاح ہو گیا اور اس طرح یہ ایک خاندان بن گیا۔ وہ قرشی لاوَلد مرگیا اور جو شخص اس کا وارث اور جانشین بنا وہ ابو جہل تھا۔ چنانچہ اب وہی حیثیت آلِ یاسر پر ابو جہل کو حاصل ہو گئی۔ حضرت یاسرؓ غلام تو نہیں ہیں لیکن ابو جہل کے حلیف اور اس کی پناہ میں ہیں۔ اس لئے کوئی اور ابو جہل سے نہیں پوچھ سکتا کہ تم اس خاندان کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مسلسل اور بد ترین تشدد کا نشانہ بننے والے یہ دو میاں بیوی اور ایک ان کے بیٹے حضرت عمارؓ ہیں۔ یہ تینوں حضور ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ ان پر ابو جہل نے شدید ترین مظالم کئے۔ حضرت سُمیّہ رضی اللہ عنہا کو شوہر اور بیٹے کی نگاہوں کے سامنے انتہائی بہیمانہ طور پر شہید کیا۔ یہ ایک مؤمنہ کا پہلا خون تھا جس سے مکّہ کی سرزمین لالہ زار ہوئی۔ پھر حضرت یاسرؓ کے ہاتھ پاؤں چار سرکش اونٹوں کے ساتھ باندھ کر انہیں چار سمتوں میں ہانک دیا گیا جس سے انؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔

"کُفُّوا اَیۡدِیَکُمۡ" کا حکم

مکّی دور کے بارہ برس تک اہلِ ایمان کو یہ حکم تھا کہ کسی تشدد، ظلم، اور زیادتی کے جواب میں ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ سورۂ نساء کی مندرجہ ذیل آیت تو مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے اور وہ بھی مدنی دور کے پانچویں یا چھٹے سال، جس کے الفاظ ہیں :
﴿ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ قِیۡلَ لَهُمۡ كُفُّوۡۤا اَیۡدِیَكُمۡ ﴾ (النساء : ۷۷) "کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کی طرف جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو" یہ حکم مکی دور کی کسی سورۃ میں نہیں ملے گا ــــ یہ ایک بہت اہم مثال ہے اس بات کی کہ عمل کے اعتبار سے بسا اوقات سُنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام قرآن مجید پر مقدّم ہوتی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ مدنی سورت کی ایک آیت میں ذکر ہو رہا ہے اس اسلوب سے کہ قِیۡلَ لَهُمۡ كُفُّوۡۤا اَیۡدِیَكُمۡ "ان سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو"۔ تو کہنے والا کون تھا؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ اس نوع کی کوئی آیت قرآن مجید میں

موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ حکم تھا جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا۔ تاہم اس میں دونوں امکانات ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حضور ﷺ کا اپنا ذاتی اجتہادی فیصلہ ہو۔ اس کی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفی نہیں ہوئی تو توثیق ہو گئی۔ جیسے کہ حدیث کی اقسام میں ایک "تقریری حدیث" ہے کہ حضور ﷺ کے سامنے ایک کام ہوا اور آپؐ نے اس سے روکا نہیں' تو اسے بھی سُنّت ہونے کی سند حاصل ہو گئی۔ اس لئے کہ اگر یہ کام غلط ہوتا تو حضور ﷺ اس سے منع فرما دیتے۔ تو یہ گویا اللہ کی طرف سے "تقریر" ہو گئی۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ وحی خفی یا وحی غیر متلو کے ذریعے سے حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو اور اسے آپؐ نے صحابہ کرامؓ تک پہنچا دیا ہو۔ اور بعد میں سورۂ نساء میں اس وحی خفی کا اس وحی جلی اور وحی متلو میں ذکر آ گیا کہ ان سے کہا گیا تھا : "کُفُّوا اَیْدِیَکُمْ" کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو' روکے رکھو ___ No Retaliation۔ کوئی جوابی کارروائی نہیں ہو گی۔ یہاں تک کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے۔

آگے فرمایا : ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ اُس وقت حکم یہ تھا کہ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرتے رہو۔ یعنی تربیت ہی کا مرحلہ تھا ؎

با نشّہ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

ابھی "بر سلطنتِ جم زن" کا حکم نہیں آیا تھا۔ بلکہ تربیت اور تیاری کا مرحلہ تھا۔ اللہ سے زیادہ سے زیادہ لو لگاؤ۔ اللہ کی محبت دلوں میں مزید جماؤ۔ اپنے عزم و ارادہ کو اور زیادہ تقویت دو۔ اللہ کی راہ میں مصائب و تکالیف جھیلنے کا خود کو زیادہ سے زیادہ عادی اور خوگر بناؤ۔ بقول اقبال ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہو رہا تھا کہ ہمیں باطل کے

خلاف اُٹھ کھڑے ہونا چاہئے' اس سے پنجہ آزمائی کرنی چاہئے۔ چنانچہ سورۂ نساء کی اس آیت کی تفسیر میں امام رازیؒ نے امام طبریؒ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں متعدد صحابہؓ مثلاً عبدالرحمٰن بن عوف' سعد بن ابی وقاص اور بعض دوسرے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا نام مذکور ہے' کہ یہ وہ حضرات تھے جو بار بار حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ اب ہمیں قتال کی اجازت ملنی چاہئے' ہم کب تک برداشت کریں گے! تصور کیجئے کہ جب مکّہ میں حضرت سُمیّہ رضی اللہ عنہا پر ظلم کیا جا رہا تھا جو صنفِ نازک میں سے تھیں' پھر بوڑھی بھی' تو کم از کم چالیس مسلمان موجود تھے۔ کیا ان کا خون کھولتا نہیں ہو گا؟ کیا وہ جوش میں نہ آتے ہوں گے؟ اور حضور ﷺ سے عرض نہ کرتے ہوں گے کہ "یا رسول اللہ! آپؐ کی نام لیوا ایک بوڑھی خاتون کو اس طرح ستایا جا رہا ہے اور بے عزت کیا جا رہا ہے' تو کیا ہم بے غیرت ہیں' کیا ہم میں مردانگی کا جوہر نہیں ہے؟ ہمیں اس بربریت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا چاہئے۔ لیکن اس وقت حکم یہی تھا کہ نہیں' کُفُّوا اَیْدِیَکُمْ' اپنے ہاتھ بندھے رکھو' ابھی اپنے اس جوش و جذبہ کو تھام کر رکھو۔ جلد ہی وقت آئے گا تب اپنا یہ جوش نکال لینا۔ کیونکہ انقلابی عمل کے اعتبار سے حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ جوش کو تھامو اور روکو۔ صبر کرو اور جھیلو۔ مدافعت میں ہاتھ مت اُٹھاؤ۔ چنانچہ حضور ﷺ جب حضرت یاسرؓ کے خاندان کے پاس سے گزرتے تو انہیں صبر کی تلقین فرماتے: ((اِصْبِرُوا یَا آلَ یَاسِر فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ)) "اے یاسر کے گھر والو' صبر کرو! اس لئے کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے"۔

یہ ابتدائی دور قریباً ساڑھے بارہ برس جاری رہا۔ درحقیقت یہ دور انقلابِ محمّدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا ناگزیر بنیادی لازمہ (Prerequisite) ہے۔ اسی میں انقلابی نظریہ و فکر کی دعوت و تبلیغ بھی ہو رہی ہے' دعوت قبول کرنے والوں کی تنظیم بھی ہو رہی ہے اور اسی میں اہل ایمان کے تزکیہ اور تربیت کے مراحل بھی طے پا رہے ہیں۔ اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ یعنی ایک طرف ان کے روحانی تزکیہ اور

ترفع کا پروگرام بھی چل رہا ہے اور دوسری طرف ان کو ماریں کھانے اور مصائب جھیلنے کا خوگر بنایا جا رہا ہے۔ اور پھر یہ کہ ان کو ڈسپلن کی پابندی کا عادی بنایا جا رہا ہے[1] جس سے ان کی قوتِ برداشت اور قوتِ ارادی کو چٹان کی مانند مضبوطی حاصل ہو رہی ہے۔ گویا تطہیرِ افکار اور تعمیرِ سیرت و کردار کے دونوں کام ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ بلاشبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (معاذ اللہ) بزدل نہیں تھے کہ خاموشی سے ماریں کھاتے رہے اور ظلم و ستم اور عقوبت و تعذیب جھیلتے رہے۔ بلکہ یہ اس لئے تھا کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کا حکم تھا کہ ہاتھ نہ اُٹھائیں۔ علامہ اقبال کا یہ شعر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل کا عکاس ہے کہ ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

"اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ ﷺ کے قدموں تک پہنچاؤ، اس لئے کہ دین تو نام ہی آنحضور ﷺ کا ہے۔ اگر وہاں تک رسائی نہ ہوئی تو اس کے باہر تو بولہبی یعنی کفر، زندقہ اور ضلالت ہی ضلالت ہے"۔

یہ قرآن جس پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، ہمیں محمد مصطفیٰ ﷺ ہی سے ملا ہے۔ یہ مجھ پر یا کسی اور پر تو نازل نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ابوبکر، عمر، عثمان، علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم) پر بھی نازل نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ پر قرآن بھی نازل ہوا اور نہ معلوم اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر مزید کیا کیا نازل فرمایا! حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ((اُوْتِیتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ)) "مجھے قرآن بھی ملا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی مثل اور بھی ملا ہے۔" اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکمت دی ہے، بصیرت دی ہے۔

---

(1) غور کیجئے کہ اِس سے بڑی ڈسپلن کی پابندی اور کیا ہو سکتی ہے کہ چاہے تمہارے ساتھ یا تمہارے کسی رفیق کے ساتھ یا خود داعیِ اوّل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تشدد کا کتنا ہی ہولناک اور ناقابل برداشت معاملہ کیا جائے، ظلم و ستم کے کتنے ہی پہاڑ توڑے جائیں تم ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے۔ اِس طرح گویا اِن کی سمع و طاعت کی تربیت بھی ہو رہی ہے۔ (مرتب)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ پھر وحی خفی ہے۔ بہت سی باتیں اللہ تعالیٰ بذریعہ الہام حضور ﷺ کو پہنچا رہا ہے۔ کبھی خواب کے ذریعے سے رہنمائی دی جا رہی ہے' کبھی کشف ہو رہا ہے۔ یہ سب چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا ایک حصہ ہیں جو اس (تعالیٰ) نے اپنے نبی کریم ﷺ کی فرمائی۔

تشدد کے جواب میں ہاتھ نہ اُٹھانے اور صبر کرنے کی بہت سی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ لوگ سمع وطاعت کے خوگر ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک حکم اور بھی ہے کہ پیچھے نہیں ہٹنا! اپنے موقف پر ڈٹے رہنا ہے! یہ نہ ہو کہ اس تشدد سے گھبرا کر اپنے انقلابی نظریہ کو خیرباد کہہ دو اور اس سے کنارا کش ہو جاؤ۔ نہیں! ڈٹے رہنا ہے اور کھڑے رہنا ہے۔ جان جاتی ہے تو جائے! یہ ہے اس تصادم کا پہلا مرحلہ —— "صبر محض" یا Passive Resistance۔

گاندھی کا نظریۂ عدمِ تشدد اور حضرت مسیح علیہ السلام کے اقوال

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے اغیار نے بھی بہت سے سبق حاصل کئے ہیں۔ چنانچہ مناسب وقت پر عدمِ تشدد کا مسنون انداز بھی غیروں نے اپنایا ہے۔ اس کی مثالوں میں سے ایک مثال مسٹر گاندھی کی ہے۔ گاندھی نے عدمِ تشدد کا جو نظریہ اختیار کیا وہ درحقیقت حضور ﷺ کی سیرت سے ماخوذ ہے۔ اس لئے کہ اس سے پہلے یہ چیز صرف دو جگہ نظر آتی ہے۔ یا جناب محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں' مسلسل بارہ برس۔ اس سے بڑا اور طویل عرصہ کہیں نظر آئے گا ہی نہیں —— یا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے تین سال کے دوران۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال یہ ہیں کہ "اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو باہنا بھی پیش کر دو۔" اور یہ کہ "اگر کوئی نالش کر کے تمہارا چوغہ لینا چاہے تو تم کرتا بھی اتار کر دے دو۔" اور "تمہیں کوئی بیگار میں اپنے ساتھ ایک کوس لے جانا چاہے تو تم دو کوس جاؤ" —— یہ درحقیقت بالکل ابتدائی اور تمہیدی دور کی

تعلیم ہے جس میں دعوت و تبلیغ کے ساتھ ہی مصائب و تشدد کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام صبر محض اور ایثار و قربانی کی تعلیم دے رہے ہیں' تاکہ ایک طرف معاندین و مخالفین کا بغض اور خبثِ باطن آشکارا ہو جائے' تو دوسری طرف اہل ایمان میں قوت برداشت پیدا ہو۔ اب یہ مشیتِ الٰہی تھی کہ اسی صبرِ محض (Passive Resistance) کے دور میں آنجناب علیہ السلام کا رفعِ آسمانی ہو گیا۔ گو کہ یہودیوں نے تو اپنی دانست میں آنجناب علیہ السلام کو صلیب پر چڑھوا کر دم لیا تھا۔ عیسائیوں کی عظیم ترین اکثریت بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا چلی آ رہی ہے' جبکہ انجیل برنباس میں وہی باتیں بیان ہوئیں جو قرآن میں ہوئی ہیں اور جو حقیقت و صداقت پر مبنی ہیں۔ کتاب و سُنّت کے مطابق آپ علیہ السلام جسدِ خاکی کے ساتھ زندہ آسمان پر اُٹھا لئے گئے اور وہاں جسم و روح کے اِتّصال کے ساتھ زندہ ہیں۔ قربِ قیامت میں آنجناب علیہ السلام کا نزول ہو گا' آپ علیہ السلام بنفسِ نفیس آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ اس وقت آپ علیہ السلام کے ہاتھ میں تلوار بھی ہو گی یعنی آپ علیہ السلام قتال فرمائیں گے۔ اور سیرتِ محمد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کے مدنی دور کی جھلک بھی دُنیا سیرتِ عیسوی علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام میں دیکھ لے گی۔ آپ علیہ السلام اس نزول کے وقت نبی آخر الزّماں جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمّتی ہوں گے۔ آپ علیہ السلام کے ہاتھوں یہودیوں کو عذاب استیصال کا مزا چکھنا ہو گا۔ دجّالِ اکبر آنجناب علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہو گا۔ یہودی دُنیا سے اسی طرح نیست و نابود کر دیئے جائیں گے جیسے قومِ نوح' قومِ عاد' قومِ ثمود' قومِ لوط اور اصحابِ مدین وغیرہ وقت کے رسولوں کی تکذیب کے جرم میں اس دُنیا سے بھی نسیاً منسیا کر دی گئیں اور آخرت کا عذاب تو ان کا مقدّر ہے ہی۔

سیرتِ عیسویؑ میں چونکہ "اقدام" (Active Resistance) کا دور آیا ہی نہیں' لہٰذا مسلح تصادم کا دور کیسے نظر آتا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نیا نظامِ شریعت لے کر تشریف نہیں لائے تھے بلکہ شریعتِ موسویؑ کی تجدید و احیاء کے لئے مبعوث

ہوئے تھے۔ چنانچہ موجودہ اناجیل میں آپ ؑ کے "پہاڑی کے وعظ" میں یہ قول آج بھی موجود ہے کہ "جہاں تک قانونِ شریعت کا تعلق ہے میں اسے بدلنے نہیں آیا۔ قانون تورات ہی کا نافذ رہے گا۔" خود قرآن میں قصاص کا قانون تورات کے حوالے سے بیان ہوا ہے اور شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تورات کے اس قانون کو باقی رکھا گیا ہے۔ تو کیسے ممکن تھا کہ قصاص کے اس قانون کو حضرت مسیح علیہ السلام ساقط کر دیتے۔ لیکن قانون اور ہوتا ہے' دعوت و تبلیغ کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی دور میں کسی طرح بھی قصاص کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس موقع پر حکم ہوتا ہے "كُفُّوا اَيْدِيَكُمْ"۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے اقوال میں اگر تدبر اور غور و فکر سے کام لیا جائے' تو وہاں بھی یہی حکمت کار فرما نظر آتی ہے۔

اگرچہ تورات میں نازل شدہ قصاص کا یہ قانون پوری دُنیا میں زبان زدِ عام ہو گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور جان کے بدلے جان' لیکن مکی دور میں نبی اکرم ﷺ نے قصاص کے اس آفاقی و مسلّمہ قانون کی بجا آوری سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو روک رکھا تھا۔ ورنہ اگر ہاتھ اُٹھانے کی اجازت ہوتی تو بلال ؓ صبر و سکون کے ساتھ اُمیّہ بن خلف کے بہیمانہ تشدد کا نشانہ نہ بنتے۔ وہ جان پر کھیل جاتے اور اس ظالم کو مزا چکھا دیتے۔ کیا جو ذہنی اور جسمانی کوفت و اذیت مکہ کی گلیوں میں مردہ جانور کی طرح کھینچے جانے کے باعث ہو رہی تھی' وہ جان دینے سے کم تھی؟ ___ اگر اجازت ہوتی تو خباب ؓ بن الارت ننگی پیٹھ دہکتے ہوئے انگاروں پر لیٹنے کے بجائے کیا دو چار کو ساتھ لے کر نہ مرتے؟ ___ ایک شخص دیکھ رہا ہے کہ یہ سارا اہتمام میرے لئے ہو رہا ہے۔ یہ دہکتے انگارے میرے لئے بچھائے جا رہے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ کرتا اُتار دو اور وہ اُتار دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے ان انگاروں پر لیٹ جاؤ اور وہ لیٹ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ ورنہ آدمی پس و پیش کرتا ہے۔ آدمی مایوس اور desperate ہو جائے تو اس میں بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ کمزور ہو تو بھی ایسے شخص میں مقابلے کی زبردست طاقت

عود کر آتی ہے۔ مشہور ہے کہ اگر بلّی کہیں گھیرے میں آجائے اور اسے کسی طرف نکلنے کا راستہ نہ ملے تو وہ انسان پر حملہ آور ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ جان لیتی ہے کہ اس کے سوا اس کے لئے کوئی چارہ نہیں۔ لیکن وہاں اس کی اجازت نہیں تھی۔ تو یہ بات بہت اہم ہے۔ معاذ اللہ! وہاں بزدلی کا معاملہ نہیں تھا۔ نہ معاذ اللہ بے غیرتی اور بے حمیتی کا کوئی معاملہ تھا کہ اہل ایمان یہ تشدد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن حرکت نہیں کرتے۔ یہ فلسفۂ انقلاب ہے ـــــ اور گاندھی نے عدم تشدد کا فلسفہ یہیں سے سیکھا ہے۔ البتہ گاندھی کی حماقت یہ ہے کہ اس نے اسے مستقل فلسفہ بنالیا۔ جبکہ یہ فلسفہ ایک دور کا فلسفہ ہے' کوئی مستقل فلسفہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس درجے میں عدمِ تشدد کہ جس درجہ میں بعد میں جاکر گاندھی نے اس کی تبلیغ کی' وہ نری حماقت ہے۔ جن لوگوں کی نظر سے مولانا آزاد کی کتاب "India wins Freedom" گزری ہے' ان کے علم میں ہو گا کہ وہ گاندھی کے اس فلسفہ کا مذاق اڑاتے ہیں کہ گزشتہ جنگ عظیم میں گاندھی نے اتحادیوں کو ہٹلر کے آگے عدمِ تشدد کے فلسفہ کے تحت ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کی تھی۔ عدمِ تشدد کے فلسفہ کو اس سطح تک لائیں گے تو یہ پاگل پن ہے۔ لیکن ہاں' ایک انقلابی تحریک اپنے ابتدائی مرحلہ میں اسے اختیار کرتی ہے۔ گاندھی نے اس سے بڑا فائدہ اُٹھایا تھا۔ اس لئے کہ اگر شروع میں کانگریس کی پالیسی عدمِ تشدد کی نہ ہوتی تو انگریز آناً فاناً پوری تحریک کو کچل کر رکھ دیتا اور تحریک آگے نہ بڑھ سکتی۔ لیکن ان کی طرف سے عدمِ تشدد کے باعث حکومت کے ہاتھ بندھ گئے تھے کہ کیا کرے؟ یہ تشدد تو کر نہیں رہے۔ اسے عالمی رائے عامہ کا بھی لحاظ رکھنا تھا۔

سِکھوں کی گوردوارہ پربندھک تحریک

عدمِ تشدد کی ایک اور مثال سکھوں کی گوردوارہ پر بندھک تحریک ہے۔ سکھوں کے گوردواروں کے ساتھ جو اوقاف تھے ان پر قبضہ ہندوؤں کا تھا۔ چونکہ

سکھوں کے بارے میں پورے طور پر یہ معیّن نہیں تھا کہ یہ کوئی علیحدہ مذہب ہے اور ہندو انہیں ہندومَت ہی کا ایک فرقہ قرار دیتے تھے' لہٰذا سکھوں کے گوردواروں کے اوقاف پر ہندو قابض تھے اور ان کی آمدنی میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کچھ بڑے لوگ پٹواریوں کی مٹھی گرم کر کے کاغذات اور دستاویزات تبدیل کرا کے انہیں ذاتی ملکیت بنا لیتے تھے[1]۔ سکھوں نے تحریک چلائی کہ ہمارے گوردواروں اور ان کے اوقاف کا کنٹرول ہمارے پاس ہونا چاہئے۔ یہ کیا تماشہ ہے کہ عبادت گاہیں تو ہماری ہیں اور ان کے ساتھ جو املاک و اوقاف ہیں وہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ہندو کی رسائی انگریز کے دربار میں بہت ہو چکی تھی۔ لہٰذا انگریز نے ہندوؤں کی پشت پناہی کی اور سکھوں کے اس معقول مطالبہ کو رد کر دیا۔ اور پولیس کو تو حکومت کی شہ اور پیسہ چاہئے۔ لہٰذا اس کی طرف سے بھی ہندوؤں کا پورا پورا ساتھ دیا گیا۔ بالآخر سکھوں نے اس تحریک کو عدمِ تشدد کے اصول پر چلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ احتجاج کے لئے سکھوں کا جو جتھا نکلتا تھا اس کو حکم تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھیں۔ ہر جتھا عموماً پچاس رضا کاروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ غالباً دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی' لہٰذا قانون کی خلاف ورزی ہو گئی۔ اور پولیس کو اختیار حاصل ہو گیا کہ ان پر لاٹھی چارج کرے' ڈنڈے چلائے اور ان کو منتشر کر دے ـــــ ادھر ان رضا کاروں کو یہ حکم تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھیں' ماریں کھائیں لیکن پیچھے نہ ہٹیں۔ حاجی عبدالواحد صاحب مرحوم و مغفور' جو امرتسر کے رہنے والے تھے' وہ اس تحریک کے عینی شاہد تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لاٹھیاں پڑنے سے سکھ رضا کار کا سر پھٹ گیا اور

---

(۱) جیسے ہمارے یہاں مزارات ہیں اور ان کے ساتھ اوقاف ہیں' تو گدی نشین صاحبان اُن کے ایک طرح مالک ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی جب اوقاف ایکٹ بنا تو اِن گدی نشینوں میں سے بڑی اکثریت نے پٹواریوں کی مٹھی گرم کر کے بہت سی اِملاک کے لئے اپنے حق میں کاغذات اور دستاویزات مرتب کرالیں اور اب اِن کی آمدنی پر عیش کر رہے ہیں۔ (مرتب)

وہ زمین پر گر گیا لیکن اس کے ہاتھ بندھے رہے۔ اس طرح جتھے کے تمام رضا کار زخمی ہو کر گرتے رہے لیکن کیا مجال کہ کسی کے ہاتھ کھلے ہوں۔ ایک جتھا اس بری طرح زخمی ہو گیا تو اس کی جگہ لینے دوسرا جتھا آگیا۔ چنانچہ انگریز کو جھکنا پڑا اور سکھوں کی تحریک کامیاب ہوئی۔ اور اُن کے گوردواروں کے اوقاف کا انتظام و انصرام ان کو مل گیا۔

چوراچوری کاواقعہ

گاندھی نے ۲۱۔ ۱۹۲۰ء میں عدمِ تشدد کی بنیاد پر ترکِ موالات کی جو تحریک' تحریکِ خلافت کے ساتھ مل کر چلائی تھی تو اس کے دوران پورے ہندوستان میں صرف ایک جگہ عدمِ تشدد کے اصول کی خلاف ورزی ہوئی۔ صوبہ بہار کا "چورا چوری" نامی ایک قصبہ تھا۔ یہاں پر پولیس والوں نے کچھ شرارت کی' جس سے جلوس میں شامل بعض لوگ مشتعل ہو گئے اور انہوں نے تھانے پر حملہ کیا' بہت سے سپاہیوں کو مار دیا اور تھانہ میں آگ لگادی' جس میں کچھ پولیس والے زندہ جل کر مر گئے۔ اب آپ دیکھئے کہ گاندھی نے صرف اس ایک حادثہ پر پوری تحریک ختم (call off) کر دی۔ اُس وقت گاندھی کی زندگی میں بڑا نازک مرحلہ آیا تھا۔ پورے ہندوستان میں اس کے خلاف جذبات مشتعل ہو گئے کہ یہ کیسا لیڈر رہے کہ اس نے تحریک ختم کر دی۔ ایسے موقع پر تو عموماً لوگ لیڈر کو گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن گاندھی نے اپنی لیڈری کی موت کا خطرہ مول لیا اور صرف یہ کہا کہ اگر تم میرے حکم پر نہیں چل سکتے تو میں تمہاری رہنمائی کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ میرا حکم یہ تھا کہ تمہیں ہاتھ نہیں اُٹھانا' تشدد نہیں کرنا' لیکن تم تشدد کر رہے ہو تو گویا تم میرا حکم ماننے کو تیار نہیں ہو۔ میں اس تحریک کی رہنمائی کی ذمہ داری کیسے قبول کر لوں کہ جس کے بارے میں مجھے یہ اعتماد نہ ہو کہ اس تحریک میں حصہ لینے والے میری بات کو مانیں گے۔ گاندھی کی بات بڑی معقول تھی۔

گاندھی کا ذکر اگر میں کرتا ہوں تو اس اعتبار سے نہیں کہ معاذ اللہ وہ میرے لئے کوئی حجت یا کوئی دلیل ہے یا رہنمائی کے لئے کوئی مثال ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ گاندھی نے یہ اصول سیرتِ محمدّی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے سیکھا ہے۔ اس کے شواہد موجود ہیں کہ گاندھی نے اسلام کا بغور مطالعہ کیا تھا ـــــ اس کے لئے میں دو مثالیں پیش کر دیتا ہوں۔

(i) علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب: ۱۹۸۴ء میں حیدر آباد دکن کے دعوتی دورے کے دوران میں نے متعدد تقریریں کیں اور قرآن حکیم کے دروس بھی دیئے۔ وہاں پر ایک صاحب' جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ہیڈ آف پولیٹیکل سائنس کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے انہیں میری فلسفۂ انقلاب والی تقریر بہت پسند آئی اور وہ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ بعد میں وہ مجھ سے ملنے آئے اور انہوں نے میری باتوں کی توثیق کے لئے بہت سے واقعات بتائے۔ انہوں نے علی گڑھ سے ایم اے کیا تھا۔ انہوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی کا ایک واقعہ سنایا' جو غالباً ۱۹۱۸ء کے آس پاس کا ہے۔ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیازات کے خلاف گاندھی نے جو تحریک چلائی تھی' اس کی وجہ سے وہ پوری دُنیا میں مشہور ہو گئے تھے۔ کالج میں اعلان ہوا کہ گاندھی کالج آ رہے ہیں۔ اُس وقت تک علی گڑھ کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ لوگوں میں بڑا اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ صاحب بتاتے ہیں کہ گاندھی آئے اور سیدھے اس کمرے میں چلے گئے جس میں سر سید احمد خاں مرحوم کی قبر ہے۔ وہاں وہ اکیلے پون گھنٹے تک سر سید مرحوم کی قبر کے پائنتی بیٹھے رہے۔ ایسا کیوں ہوا! یہ اللہ جانے۔ گاندھی جب باہر آئے تو منتظمین اور طلبہ نے ان سے جلسہ سے خطاب کے لئے کہا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو صرف سر سید صاحب کی قبر کی زیارت کے لئے آیا تھا' مجھے اور کوئی کام نہیں ہے۔ جب بہت زور دیا گیا تو گاندھی نے کہا کہ پہلے میں پورے کالج اور ہوسٹل کا ایک چکر (round) لگانا چاہتا ہوں۔ اُس وقت ہوسٹل کی وہ صورت نہیں تھی جو آج کل ہے' اُس وقت علی گڑھ میں نواب زادوں' جاگیرداروں اور بڑے بڑے

رئیسوں کے لڑکے پڑھتے تھے۔ ان کے کمروں میں قالین بچھے ہوئے تھے اور صوفے لگے ہوئے تھے۔ کالج کے طلبہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ گشت کے بعد گاندھی نے ہال میں مختصر سی تقریر کی' جس میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ "میں آپ حضرات کو خوشخبری دیتا ہوں کہ آپ کا یہ کالج جلد ہی یونیورسٹی بن جائے گا۔ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے"۔ دوسری خاص بات یہ کہی کہ "اگر آپ کا کالج یا آپ کی یونیورسٹی ایک بھی حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) پیدا کر دے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ لیکن میں دعوٰی سے کہتا ہوں کہ آپ کا کالج یا یونیورسٹی ایک بھی حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ لئے ہیں' صوفوں اور قالینوں پر پڑھنے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہیں بن سکتے"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کتنا گہرا مطالعہ تھا۔ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جانے بغیر کوئی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے؟ ـــــ میں نے جب اُن سے یہ واقعہ سنا تو فوراً میرا ذہن علامہ اقبال مرحوم کی اُس نظم کی طرف منتقل ہوا جو علامہ نے اسی زمانہ میں کہی تھی جس زمانے کا یہ واقعہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ گاندھی کی اس تقریر کی اخبارات میں رپورٹنگ ہوئی ہو گی اور شاید علامہ نے اسی سے متاثر ہو کر یہ اشعار کہے ہوں گے کہ ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی' ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا' شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل!
نہ زورِ حیدری ؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانی ؓ!

بہر حال یہ ایک خیال ہے۔ اب کوئی اس کی تحقیق کرے تو بات واضح ہو سکے گی۔

(ii) گاندھی کا مشورہ کانگریس کے وزراء کو : گاندھی کی دوسری بات بہت مشہور و معروف ہے کہ جب ۱۹۳۷ء میں بہت سے صوبوں میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت پہلی بار کانگریس کی وزارتیں بنیں تو گاندھی نے اپنے اخبار "ہریجن" میں لکھا کہ "میں تمام وزیروں سے کہتا ہوں کہ حکومت میں حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت

عمر(رضی اللہ عنہ) کی مثال سامنے رکھیں، جنہوں نے درویشی میں ایک عظیم ترین سلطنت کی سربراہی کی"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کے پہلے قرن سعید کا گاندھی کا مطالعہ کتنا تھا!۔ بہرحال میں گاندھی کے عدمِ تشدد کی بات کرتا ہوں تو اس اعتبار سے کہ انہوں نے یہ سبق سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے سیکھا ہے۔[1]

لاحاصل احتجاجی مظاہرے

ہمارے یہاں بھی تحریکیں چلتی ہیں گو وہ انقلاب کے لئے نہیں ہوتیں، صرف ایک ناپسندیدہ حکمران یا پارٹی کو ایوانِ حکومت سے بے دخل کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ تحریک کے قائدین کہا کرتے ہیں کہ جلوس تو ہم نے نکالا لیکن توڑ پھوڑ کوئی اور کر گیا۔ عجیب بات ہے۔ اگر آپ کی اتنی تنظیم نہیں ہے، اگر آپ کا اتنا کنٹرول نہیں ہے، اگر آپ کا اتنا ڈسپلن نہیں ہے تو آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ سڑکوں پر آئیں۔ کیا طرفہ تماشا ہے کہ جلوس تو نکل رہا ہے حکومت وقت کے خلاف اور شامت آ رہی ہے قومی املاک کی۔ کہیں اسٹریٹ لائٹیں توڑ دی گئی ہیں، کہیں نیون سائن اور ٹریفک سگنلز کی شامت آ گئی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بسوں کے ٹائر پھاڑے جا رہے ہیں، بسیں جلائی جا رہی ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ساٹھ ستر آدمیوں کو ہم نے بس سے اتار کر کھڑا کر دیا اور بس کو آگ لگا دی تو کیا وہ لوگ ہم کو دل میں گالیاں نہیں دے رہے ہوں گے؟ اور اس طرح رائے عامہ ہمارے حق میں جا رہی ہے یا خلاف جا رہی ہے؟ اب آپ سوچئے کہ اگر کسی کو چار

---

(1) محترم ڈاکٹر صاحب نے یہ تقریر ۱۹/اکتوبر ۱۹۸۴ء کو مسجد دارالسلام میں ارشاد فرمائی تھی۔ بعد ازاں "نوائے وقت" کے ممتاز کالم نگار جناب م۔ش مرحوم کا ایک خط ڈاکٹر صاحب کو موصول ہوا جس میں فاضل کالم نگار نے یہ انکشاف کیا کہ خان عبدالغفار خاں نے ایک بار انہیں (یعنی م۔ش صاحب کو) یہ بتایا کہ گاندھی نے عدمِ تشدد کا فلسفہ حضور ﷺ کی سیرت سے اخذ کیا ہے۔ (مرتب)

پانچ میل دور کسی مقام پر جانا ہے تو اس پر کیا بیتی ہوگی؟ پھر ایسی حرکتوں سے بر سر اقتدار طبقہ کو کیا تکلیف پہنچتی ہے اور اس کا کیا نقصان ہوتا ہے؟ تکلیف پہنچتی ہے عوام الناس کو اور نقصان ہوتا ہے قومی املاک کا ــــ اس کا نام مظاہرہ نہیں ہے' یہ تو درحقیقت فساد ہے' ہنگامہ ہے۔ اس کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ نتیجہ خیز مظاہرے وہ تھے جن کا اوپر ذکر ہوا ــــ اپنے حقوق کے لئے' اپنے جائز مطالبوں کے لئے کسی ظالم اور جابر بر سرِ اقتدار طبقے کے خلاف سڑکوں پر نکلنا پڑے تو نکلئے ــــ لیکن اس شان سے کہ لاٹھی چارج سے سر پھٹ جائے' گولیوں کی بوچھاڑ سے جسم زخمی ہو جائے' آنسو گیس سے آنکھوں میں شدید اذیت پہنچے لیکن ہاتھ بندھے رہیں اور جواب میں کسی نوع کا بھی متشددانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے۔ رہا توڑ پھوڑ' بسوں' موٹروں اور قومی املاک کو نقصان پہنچانا تو یہ فساد ہے' بدامنی ہے جو حکومت وقت کو پوری قوت کے ساتھ تحریک کو کچلنے کا اخلاقی اور قانونی جواز فراہم کرتی ہے۔

عدمِ تشدد کی اوپر بیان کردہ مثالیں اگرچہ غیروں کی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سیرتِ نبوی ﷺ سے ماخوذ ہیں۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

یعنی دُنیا میں جو کچھ بھی خیر اور بھلائی کہیں نظر آ رہی ہے وہ یا تو محمد رسول اللہ ﷺ کی عطا کردہ روشنی ہی سے حاصل کی گئی ہے یا ابھی نوعِ انسانی نورِ مصطفیٰ کی تلاش میں ہے۔ یعنی غیر شعوری طور پر اُن راستوں کی تلاش میں ہے اور انہی کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے جو راستے محمد رسول اللہ ﷺ نے دیئے تھے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

خطابِ چہارم

۲۶ اکتوبر سنہ ۸۴ء

☆

تصادم کا مرحلۂ ثانی: اقدام اور چیلنج

☆

ع "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؔ!"

ع "چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!"

— اقبالؔ —

- **گذشتہ مباحث کا خلاصہ اور ربطِ مضمون**
- **تصادم کا مرحلہ ثانی : اقدام اور چیلنج**
  - زیر بحث مراحل کی قرآنی اصطلاحات :
    صبر سے مصابرت اور جہاد سے قتال !
  - موضوع کی اہمیت مطالعہ سیرتؐ کے اعتبار سے
  - اقدام کے فیصلے کی اہمیت اور نزاکت
  - انبیاء و رسل کا خصوصی معاملہ
  - تحریکِ شہیدینؒ کی مثال
  - سیرت مطہرہ میں اقدام کا مرحلہ کب آیا ؟
  -
- **مدینہ میں حضورؐ کے اقدامات بغرضِ استحکام :**
  - تعمیر مسجد نبویؐ
  - مہاجرین اور انصار میں مؤاخات
  - یہود کے ساتھ معاہدے
- **راست اقدام کا مرحلہ**
  - مکہ کی معاشی ناکہ بندی
  - قریش کے سیاسی اثرات کی تحدید
  - غزوۂ بدر سے قبل آٹھ مہمات
- **مسلح تصادم کا نقطۂ آغاز : واقعۂ نخلہ**

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیاتِ قرآنی' احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

صبرِ محض (Passive Resistance) کے مرحلہ پر اگرچہ انقلابی جماعت کے کارکنوں کو سخت قسم کے تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے' تاہم انقلابی عمل کے لئے یہ مرحلہ نہایت اہم ہے' کیونکہ اس دوران ان کی مظلومیت کی وجہ سے معاشرے کی خاموش اکثریت (Silent Majority) کی ہمدردیاں رفتہ رفتہ اس انقلابی گروہ کے ساتھ ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف خود انقلابی گروہ کو مہلت مل جاتی ہے جس میں انہیں نظم کی پابندی کا خوگر بنایا جاتا ہے اور ان کی تربیت کی جاتی ہے کہ وہ بلاچون وچرا اطاعتِ امیر کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کے بعد جب انقلابی جماعت یہ محسوس کرے کہ اب ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم اس باطل و فاسد' ظالم و استحصالی اور غلط نظام کے خلاف راست اِقدام کر سکتے ہیں تو اب صبرِ محض کا مرحلہ راست اِقدام میں تحویل ہو جائے گا۔

سورۂ آل عمران کی آخری آیت میں امر کے صیغہ میں فرمایا گیا ہے : ﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا ﴾ "اے ایمان والو! صبر سے کام لو' باطل کے علمبرداروں کے مقابلہ میں پامردی اور استقامت وثبات کا مظاہرہ کرو' حق کا بول بالا کرنے کیلئے کمربستہ ہو جاؤ"۔ یہاں ایک لفظ "صبر" اور دوسرا "مصابرہ" آیا ہے۔ "مصابرت" کا لفظ قرآن مجید مدنی دَور میں استعمال کر رہا ہے' جبکہ مکّی دور میں ہمیں قرآن میں صرف صبر کا لفظ ملتا ہے۔ حضور ﷺ کو خطاب کر کے متعدد سورتوں میں مختلف اسالیب میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی۔ مثلاً : ﴿ فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّھُمۡ ﴾ (الاحقاف) ﴿ وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُکَ

اِلاَّ بِاللّٰهِ ﴾ (ہود) ﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا ﴾ (الطور) ﴿ وَاصْبِرْ عَلٰى مَايَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلاً ﴾ (المزّمّل) چنانچہ حضور ﷺ صبر کی اسی تاکید کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانب منتقل فرماتے رہے۔ آلِ یاسر رضی اللہ عنہم سے فرمایا : ((اِصْبِرُوا يَا آلَ يَاسِر فَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ)) "اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو' برداشت کرو! اس لئے کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے"۔

مکی دَور میں جو سورتیں اور آیات نازل ہوئیں ان میں بار بار صبر کی تاکید ہے کہ جھیلو! برداشت کرو! ـــــ اور یہ صبر یک طرفہ ہو رہا ہے۔ ابھی اہل ایمان پر ستم ڈھائے جا رہے ہیں اور وہ جھیل رہے ہیں۔ انہیں تشدد و مظالم کا ہدف بنایا جا رہا ہے اور وہ برداشت کر رہے ہیں اور کوئی بھی اپنے دفاع میں ہاتھ تک نہیں اٹھا رہا۔ اس لئے کہ ابھی اس کی اجازت نہیں تھی۔ مکی دَور میں قرآن مجید میں صرف "صبر" کا لفظ ملے گا' جو یک طرفہ عمل ہے۔ جبکہ مدنی دَور میں یہ لفظ کچھ بدلی ہوئی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اب مصابرہ یا مصابرت کا حکم آتا ہے۔ یہ لفظ باب مفاعلہ سے بنا ہے اور اس باب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں آمنے سامنے دو فریق ہونے لازمی ہیں۔ گویا "مصابرہ" کے معنی ہوں گے صبر کا صبر سے ٹکراؤ۔ یعنی وہ اگر تم پر زیادتیاں کر رہے ہیں تو اب تم بھی ان کے خلاف اِقدام کرو۔ معلوم ہوا کہ اب دو طرفہ صبر کا مظاہرہ ہو گا۔ مشرکین کو بھی جھیلنا پڑے گا' انہیں بھی جان کی بازیاں کھیلنی ہوں گی۔ اگر وہ اپنے باطل نظریہ اور فاسد نظام کا تحفظ چاہتے ہیں تو انہیں بھی قربانیاں دینی پڑیں گی۔ "مصابرہ" اسی عمل کا نام ہے کہ صبر کا صبر سے ٹکراؤ اور مقابلہ ہو۔ جس فریق میں قوتِ صبر یعنی برداشت کی طاقت زیادہ ہو گی بازی اس کے حق میں جائے گی۔ اب اسی مرحلے پر معلوم ہو گا کہ اہل حق اور اہل باطل میں سے کون سا فریق زیادہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کر سکتا ہے' کون اپنے مشن (Cause) کے لئے کتنی قربانیاں دے سکتا ہے!۔ صبر جب مصابرت میں بدلتا ہے تو یہ درحقیقت صبرِ محض (Passive Resistance) کا اِقدام (Active Resistance) میں

تبدیل ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جہاد قتال کے مرحلہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

موضوع کی اہمیت

انقلابی جدوجہد کا یہ مرحلہ انتہائی اہم ہے' یہ درحقیقت حضور ﷺ کی سیرت کا ایک نہایت نازک موڑ اور لمحہ (Critical Moment) ہے کہ نہج تبدیل ہو رہا ہے' صبر محض کی پالیسی ترک کر کے اِقدام کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین نے اس کو تضاد قرار دے کر اس کا محاکمہ کیا ہے اور اس ظاہری تضاد کو کافی نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ مسٹر منٹگمری واٹ نے سیرتِ مبارکہ پر دو علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کا نام "Mohammad at Makka" اور دوسری کا نام "Mohammad at Madina" ہے۔ اُس نے گویا یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مکّہ والے مُحمّد (ﷺ) دراصل مدینہ والے مُحمّد (ﷺ) سے مختلف ہیں۔ اس کے نزدیک مکّہ والے مُحمّد ایک داعی ہیں' مبلّغ ہیں' مزکّی ہیں' مربّی ہیں۔ غرضیکہ ان حضرات کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے اندر نبوّت کے جو اوصاف نظر آتے ہیں وہ مکّی دَور کی حد تک حضور ﷺ میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن مدینہ میں نقشہ کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ وہاں حضور ﷺ کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ آپؐ فوج کے سپہ سالار اور جرنیل ہیں' آپؐ مدینہ کی ریاست کے سربراہ ہیں۔ آپؐ ہی چیف جسٹس کا رول ادا کر رہے ہیں۔ دوسری اقوام سے معاہدے کر رہے ہیں۔ گویا مدینہ میں مُحمّد ﷺ ایک مدبر سیاست دان کے روپ میں نظر آ رہے ہیں —— مشہور مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی کہتا ہے :

> "*Muhammad* (ﷺ) *failed as a Prophet but succeeded as a statesman*"
>
> یعنی "مُحمّد (ﷺ) بحیثیت نبی تو ناکام ہو گئے' لیکن ایک سیاستدان کی حیثیت سے کامیاب رہے" (نعوذ باللہ من ذلک)

گویا منٹگمری واٹ کو بھی یہ پورا فکر اسی بات سے ملا ہے۔ یعنی انہیں مکّہ والے مُحمّد

ﷺ میں تو نبوت کی شان نظر آ رہی ہے۔ اس لئے کہ اُن کے اذہان میں نبیوں کی جو تصویر ہے (مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام) وہی تصویر اُن کو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی مکّہ میں نظر آ رہی ہے۔ لیکن مدینہ میں سیرتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام) کا جو نقشہ ان کو نظر آتا ہے وہ ان کے خیال کے مطابق نبوت والا معاملہ نہیں ہے۔ وہاں تو ان لوگوں کو نبی اکرم ﷺ بحیثیت ایک سیاست دان ومدبّر' ایک سربراہِ مملکت اور ایک جرنیل کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ آخر یہ منہجِ عمل کیسے تبدیل ہوا ہے؟ وہ تحویلی مرحلہ (Transitory Phase) کب آیا اور کیسے آیا؟ اور محمد ﷺ نے نظامِ باطل کے خلاف راست اِقدام کیسے کیا تھا؟

اِقدام کے فیصلے کی اہمیت اور نزاکت

کسی انقلاب کے لئے راست اِقدام (Active Resistance) کا فیصلہ بہت اہم اور نازک (Crucial + Critical) ہوتا ہے۔ اگر راست اِقدام کا فیصلہ قبل ازوقت ہو جائے گا تو دُنیوی اعتبار سے انقلاب ناکام ہو جائے گا۔ اگر تعداد معتدبہ نہیں ہے' اگر تربیت خام رہ گئی ہے تو دُنیوی ناکامی کا سامنا ہو گا۔ جیسے کُشتہ میں اگر یک آنچ کی کسر رہ گئی تو بعض اوقات یہی ذرا سی آنچ کی کسر تباہ کُن ہو جاتی ہے اور وہ کشتہ مقویٔ جسم و جاں بننے کی بجائے ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی طرح اگر تربیت میں خامی اور کمی رہ گئی اور قبل ازوقت اِقدام کر دیا گیا تو ناکامی ہو جائے گی' خواہ خلوص واخلاص کا کتنا ہی ذخیرہ اس جدوجہد کے پیچھے موجود ہو۔ لہٰذا یہ بڑا نازک لمحہ ہوتا ہے اور اس کے صحیح یا غلط ہونے پر انقلاب کے کامیاب یا ناکام ہونے کا دارومدار ہوتا ہے۔

انبیاء ورُسل کا خصوصی معاملہ

جہاں تک جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیاء و رُسل علیہم السلام کا معاملہ ہے' یہ فیصلے درحقیقت اللہ کی طرف سے وحی جلی یا وحی خفی کے ذریعے سے ہوتے

تھے' یا اگر رسولؐ اجتہادی طور پر کوئی قدم اٹھاتے تھے تو اللہ کی طرف سے اس کی تصویب یا اصلاح ہو جاتی تھی۔ لیکن اگر وحی کے ذریعے نہ تصویب ہوئی ہو نہ اصلاح تو گویا رسول کے اس اجتہادی فیصلہ کو اللہ کی طرف سے خاموش توثیق حاصل ہو گئی۔ لہٰذا اس معاملہ میں رسول تو محفوظ و مامون اور معصوم ہیں ـــــ اس ضمن میں حضور ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں ہمیں سفر طائف کی مثال ملتی ہے' جو حضور ﷺ کا ایک اجتہادی فیصلہ تھا۔ ۱۰ نبویؐ میں جب مکہ میں مشرکین نے دار الندوہ میں حضور ﷺ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا تو حضور ﷺ نے طائف کا سفر اختیار فرمایا۔ اس فیصلہ کی تصویب یا اصلاح وحی کے ذریعے نہیں ہوئی ـــــ گویا اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ طائف والے بھی ہمارے رسول (ﷺ) کے صبرو ثبات اور عزیمت کی خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کر لیں۔ چنانچہ طائف میں ایک دن میں رحمۃٌ لِلعالمین ﷺ کے ساتھ وہ سلوک ہوا جو مکی زندگی کے دس برس میں نہیں ہوا۔ جس کو بیان کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے اور جس کو پڑھتے ہوئے دل کانپ جاتا ہے۔ وہاں دعوتی اعتبار سے حضور ﷺ کے لئے کامیابی کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں یہ بات طے شدہ تھی کہ "مدینۃ النبیؐ" بننے کی سعادت یثرب کے حصے میں آنے والی ہے' یہ سعادت طائف کے نصیب میں نہیں تھی۔ حالانکہ غور کیجئے کہ طائف میں دعوت و تبلیغ کے لئے حضور ﷺ بنفسِ نفیس تشریف لے گئے' لیکن وہاں سے ناکام لوٹنا پڑا اور دوسری جانب صورت یہ ہے کہ آپؐ مکہ میں مقیم ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یثرب کے لئے کھڑکی کھول دی' جہاں سے آکر اولاً چھ اور بعد ازاں ۷۵ افراد نے آپؐ سے بیعت کر کے اسلام قبول کیا۔

گویا یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ دار الہجرت یثرب کو بننا ہے' طائف کو نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ قدم قدم پر نبی اکرم ﷺ کی وحی متلو (یعنی قرآن مجید) اور وحی غیر متلو (یعنی کشف' القاء' الہام اور رویائے صادقہ) کے ذریعے رہنمائی فرما رہا ہے۔ حضور ﷺ کے کسی اجتہادی عمل پر خاموشی ہے تو یہ گویا اللہ کی طرف سے اس کی

توثیق و تائید ہے ـــــ لیکن مابعد کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ نبوت و رسالت کا اتمام و اکمال حضور ﷺ کی ذات پر ہو گیا۔ اب تاقیامِ قیامت کسی نوع کا نبی نہیں آئے گا۔ لہٰذا اس کے بعد جو بھی اسلامی احیائی تحریکیں اٹھی ہیں یا اٹھیں گی' ظاہر بات ہے کہ ان کی قیادت انبیاء و رُسل علیہم السلام کے ہاتھوں میں نہ رہی ہے نہ رہے گی' بلکہ قیادت کی یہ ذمہ داری رسول اللہ ﷺ کے کسی امتی ہی نے ادا کی ہے اور آئندہ بھی یہ کام کسی اُمتی ہی کے ذریعے ہو گا۔ اور کوئی اُمتی بھی معصوم عن الخطا نہیں ہے' معصومیت خاصۂ نبوت ہے۔ نبوت ختم ہوئی تو معصومیت بھی ختم ہوئی۔ حضور ﷺ جہاں خاتم النبیّین ہیں وہاں خاتم المعصومین بھی ہیں ـــــ شیعہ مکتبِ فکر کا معاملہ بالکل علیحدہ ہے کہ وہ بزعمِ خویش جن اماموں کو مامور من اللہ مانتے ہیں ان کو معصوم عن الخطأ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس امکان کو اپنے ذہن سے بالکل محو کر دیجئے اور جان لیجئے کہ اب تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کی جو تحریک بھی برپا ہو گی' اس کے ہر مرحلہ کا معاملہ اجتہادی ہو گا اور اس اجتہاد میں خطا کا امکان رہے گا۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ خطا کا امکان نہیں ہے۔ جس نے یہ دعویٰ کیا وہ اہلِ سُنّت و الجماعت کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔

تحریکِ شہیدینؒ کی مثال

برِّعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں "تحریکِ شہیدین" کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد' ایک خالص اسلامی تحریک ہونے کے اعتبار سے' تحریکِ شہیدین کے ہم پلّہ کوئی دوسری تحریک نظر نہیں آتی۔ اس تحریک کے قائد سید احمد بریلوی رحمہ اللہ تھے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ تقویٰ' تدیّن اور خلوص و اخلاص کا اتنا بڑا سرمایہ دورِ صحابہؓ کے بعد اسلامی تاریخ میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔ انفرادی سطح پر بڑی بڑی عظیم شخصیتیں ہر دَور میں نظر آتی

ہیں۔ مجددینِ اُمّت ہیں' ائمہ اُمّت ہیں' محدثین کرام ہیں' فقہاءِ عِظام ہیں۔ انفرادی سطح پر علم' تقویٰ' تدیّن اور خلوص و اخلاص کے اعتبار سے ان میں سے ہر شخص کوہ ہمالیہ نظر آتا ہے لیکن اجتماعی سطح پر' ایک گروہ اور ایک جماعت کی صورت میں' اتنے متقی و متدیّن حضرات اور اتنا خالص اسلامی جہاد بالسیف دَورِ صحابہؓ کے بعد کہیں اور نظر نہیں آتا' واللہ اَعلم۔ لیکن وہاں بھی ایک اجتہادی خطا ہوگئی اور قبل از وقت اِقدام ہوگیا۔

حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ان ساتھیوں کی بھرپور تربیت کی تھی جن کو ساتھ لے کر وہ سرحد کے علاقہ میں پہنچے تھے۔ لیکن ان کی اصل جِدّوجُہد پشاور اور مردان کے اضلاع سے شروع ہوئی تھی ـــــ وہاں جا کر اِقدام سے پہلے وہاں کے مقامی باشندوں کی تربیت کی بھی ضرورت تھی۔ یا تو وہاں کے تمام خوانین اور رعایا سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو قطعی طور پر اپنا امیر تسلیم کر لیتے اور ان کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت اور جہاد کر لیتے' تب بھی کوئی مضبوط اساس قائم ہو جاتی' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ البتہ ایک یا دو قبیلوں کے خوانین نے بیعت کر لی تھی جو کافی نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ مقامی لوگوں کی تربیت سے پہلے اور وہاں اپنے آپ کو مستحکم (Consolidate) کرنے سے پہلے' ایک طرف سکھوں کے ساتھ جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ دوسری طرف اسلامی شریعت کی حدود و تعزیرات نافذ کر دی گئیں' جو مقامی لوگوں کے لئے بڑی شاق تھیں۔ اس لئے کہ وہ لوگ ایک مدت سے دین کے صحیح و حقیقی علم سے ناواقف تھے' اور اگرچہ وہ مسلمان تھے لیکن ان میں سے اکثر حقیقی ایمان کے لذّت آشنا نہیں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اکثریت نے سید صاحب کے خلاف سازشیں کیں' آپ کو زہر دیا گیا' مجاہدین کے کیمپوں پر شب خون مارا گیا اور بے شمار مجاہدین کو شہید کر دیا گیا۔ آپؒ کے خلاف مخبری کی گئی اور سکھوں کو مجاہدین کے لشکر کی نقل و حرکت اور اس کی قوت و وسائل کی خبریں پہنچائی گئیں۔ الغرض مقامی لوگوں کی اکثریت کی ناپختہ سیرت و کردار اور عدم تربیت کے باعث یہ عظیم اسلامی

تحریک دُنیوی اعتبار سے ناکام ہو گئی۔

تحریک شہیدینؒ کی مثال سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی انقلاب کے لئے تربیت کی کیا اہمیت ہے اور اِقدام کے مرحلے کے لئے صحیح وقت کا تعین کیا اہمیت رکھتا ہے! سید صاحب کا حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے مقامی لوگوں کو سچا اور پکا مسلمان سمجھ کر اِقدام کرنا اور سکھوں سے جنگ کا سلسلہ شروع کر دینا خطاءِ اجتہادی ہے اور اہل سنت کے نزدیک خطاءِ اجتہادی پر بھی آخرت کا اجر محفوظ رہتا ہے۔ ایک انسان اپنی امکانی حد تک غور کرنے کے بعد اپنی رائے میں صحیح فیصلہ کر رہا ہے' اس نے سوچ بچار اور غور و تدبر میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اور اس کے بعد اس نے اِقدام کیا ہے تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا اُخروی اجر و ثواب بالکل محفوظ ہے' اس میں قطعاً کوئی کمی نہیں ہوگی' لیکن دُنیوی اعتبار سے وہ جدوجہد اور وہ تحریک ناکام ہو جائے گی۔ یہ بات نہ صرف ماضی بلکہ آئندہ کے لئے بھی ہے۔ بہرحال کسی تحریک میں وہ وقت آتا ہے کہ جب اس کے قائد کو "اِقدام" کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہو گا کہ پوری طرح سوچ بچار کر کے حدِ استعداد کے مطابق حالات کا پورا جائزہ لے کر اور اپنی جمعیت کی تعداد اور اس کی تربیت کو پوری طرح تول کر اِقدام کا فیصلہ کیا جائے اور اس میں بھی اس کا تمام تر توکّل اللہ ہی کی ذات پر ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہی اصل حامی و ناصر ہے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست!
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن تحریک کا قائد اور اس کے ساتھی ذہناً اس کے لئے تیار رہیں کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خطا ہو جائے۔ اس لئے کہ اب کوئی نبی نہیں ہے' لہٰذا کوئی معصوم نہیں ہے۔

سیرتِ مطہرہ میں اِقدام کا مرحلہ کب آیا

سیرتِ مطہرہ میں راست اِقدام بالفاظ دیگر نظامِ باطل کو چیلنج کرنے کا جو مرحلہ

آیا ہے اس کا تعلق ہجرت کے متصلاً بعد کے زمانے سے ہے۔ یعنی جیسے ہی ہجرت ہوئی اور حضور ﷺ مکّہ کو خیرباد فرما کر عازمِ مدینہ ہوئے اسی لمحے یہ مرحلہ شروع ہو گیا۔ اس مرحلہ کے لئے قرآن مجید میں متعلقہ آیات سورۃ الحج کی ہیں۔ آیت ۳۹ میں فرمایا : ﴿ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۝ ﴾ یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے لئے قتال کا اِذن عام تھا۔ اب تک انہیں حکم تھا کہ ہاتھ بندھے رکھیں ' لیکن اب ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے کہ اب انہیں بھی جنگ کی اجازت ہے۔ یہ آیات اثنائے سفرِ ہجرت میں نازل ہوئیں۔ سفر میں کم از کم بیس دن لگے ہیں اور ۱۲/ ربیع الاول ۱ھ کو حضور ﷺ کا مدینہ منورہ میں ورودِ مسعود ہوا ہے۔ اِس اعتبار سے ۱۲/ ربیع الاول کی تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہی حضور ﷺ کی تاریخِ وفات ہے۔

اب سورۃ الحج کی آیت ۴۱ ملاحظہ ہو :

﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ ﴾

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکن و اقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے ' نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے۔"

اس آیت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو جو تمکّن فی الارض عطا کیا جانے والا تھا اور اس میں جو توسیع ہونے والی تھی اس کے پیش نظر یہ آیت گویا حزب اللہ اور اسلامی انقلاب کے منشور (Manifesto) کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے آج کل کوئی سیاسی جماعت الیکشن میں حصہ لیتی ہے تو اپنا ایک منشور شائع کرتی ہے کہ اگر ہمیں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو ہم کیا کریں گے اور ہمارا رویہ کیا ہو گا۔ یہاں یہ Divine Manifesto نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیا جا رہا ہے کہ اے محمد (ﷺ) آپ مدینہ

تشریف لے جا رہے ہیں' جہاں آپؐ کا داخلہ ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ہو گا۔ تو آپؐ کے اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے یہ منشور ہے جسے وہاں رُوبعمل لایا جائے گا۔

نبی اکرم ﷺ کا مدینہ منورہ میں ۱۲/ ربیع الاول ۱ھ کو ورودِ مسعود ہوا۔ چھ مہینے تک تو حضور ﷺ نے نہ کوئی جوابی کارروائی فرمائی نہ مکہ کی طرف کوئی اِقدام کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے حالات ایسے بنا دیئے تھے کہ حضور ﷺ کو خود مدینہ آنے کی دعوت ملی تھی۔ یہاں آ کر آپؐ کو دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں زیادہ وقت لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مدینہ میں اوس و خزرج کے دو بڑے قبیلے آباد تھے۔ دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار اور رؤساء رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا چکے تھے اور ان میں سے اکثریت بیعتِ عقبہ ثانیہ کے وقت موجود تھی اور حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر دو سال قبل بیعت کر چکی تھی۔ لہٰذا آپؐ نے استحکام کے لئے چھ ماہ صرف فرمائے ہیں اور اس عرصہ میں کئے جانے والے تین اِقدامات بہت اہم ہیں۔

مدینہ میں حضور ﷺ کے اِقدامات بغرضِ استحکام

۱) مسجدِ نبویؐ کی تعمیر: پہلا فوری اِقدام اقامت صلوٰۃ سے متعلق تھا۔ اس لئے کہ منشورِ الٰہی کی پہلی شق یہی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے پہلا کام جو کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھا۔ اس کے لئے جگہ کا انتخاب کیا گیا' پھر اس کے حصول کے بعد تعمیر کا آغاز کر دیا گیا۔ اس تعمیر کا یہ پہلو قابل غور ہے کہ حضور ﷺ اس میں بنفسِ نفیس شریک رہے ہیں۔ آپؐ نے ایک مزدور اور کارکن کی حیثیت سے مسجد نبویؐ کی تعمیر میں حصہ لے کر اپنے آباء و اَجداد کی سُنّت کی تجدید فرمائی۔ سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھانے کا ذکر بایں الفاظ کیا گیا ہے: ﴿ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ﴾ بیت اللہ کی دیواریں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہم السلام نے اُٹھائی تھیں تو مسجد نبویؐ کی

تعمیر میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی توانائیاں اور آپؐ کی محنت کا پسینہ شامل تھا۔

ii) مواخات : دوسرا اِقدام جو آپؐ نے فرمایا اس کا عنوان مواخات ہے۔ یہ بہت بڑا کام تھا۔ مہاجرین کو مدینہ کی آبادی میں مدغم اور ضم (integrate) کرنا' تاکہ وہ اس معاشرہ میں علیحدہ طبقہ کی حیثیت سے نہ رہ جائیں بلکہ اس کا ایک جزوِ لاینفک بن جائیں۔ چنانچہ مہاجرین میں جو اہم لوگ تھے ان کے بالکل سگے بھائیوں کی طرح انصار کے ساتھ رشتے کرا دیئے گئے۔ مواخات کا یہ اِقدام داخلی استحکام کے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مواخات کا یہ معاملہ سیرتِ مطہرہ کے ابواب میں ایک نہایت اہم باب ہے اور معلوم تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کے نتیجے میں انصار نے مہاجرین کیلئے اپنے گھر اور دوکانیں تقسیم کر دیں۔ ایک انصاری صحابیؓ کے بارے میں یہاں تک آتا ہے کہ ان کی دو بیویاں تھیں۔ وہ اپنے مہاجر بھائی کو گھر میں لے گئے۔ چونکہ اُس وقت تک حجاب کا حکم نہیں آیا تھا لہٰذا انہوں نے پیشکش کی کہ ان دونوں میں سے جو آپ کو پسند ہو میں اسے طلاق دیتا ہوں' آپ اس سے نکاح کر لیں۔ اس لئے کہ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے گھر میں دو بیویاں ہوں اور میرے بھائی کا گھر آباد نہ ہو۔

یہ مواخات بھی نہایت انقلابی اہمیت کا حامل اِقدام ہے۔ اس لئے کہ انسان کی سرشت کے اندر جو کمزوریاں ہیں اس میں طبقاتی تفاوت و امتیاز اور کشمکش بہت خوفناک ہوتی ہے۔ اوس و خزرج میں قبائلی و طبقاتی کشمکش اور عصبیت پہلے سے موجود تھی۔ لیکن اسلام اور پھر رسول اللہ ﷺ کے بنفسِ نفیس ورودِ سعید نے اس کو ختم کیا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ عرصہ بعد ہی منافقین اور یہود کسی نہ کسی بہانہ سے اس چنگاری کو بھڑکانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اگر مہاجرین اور انصار کا اس طرح ادغام و انضمام نہ کر دیا گیا ہوتا اور ان کے مابین مواخات قائم نہ کر دی گئی ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ بہت سی داخلی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ منافقین اور یہود نے اس کی موقع بموقع کوششیں کیں' لیکن نبی اکرم ﷺ کی فراست' تدبّر' معاملہ فہمی اور

حکمت نے ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنادیا۔

iii) یہودی قبائل سے معاہدے : تیسرا اِقدام جو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں استحکام کے لئے فرمایا وہ یہودیوں کے ساتھ معاہدوں سے متعلق تھا' جن کے تین قبیلے مدینہ میں آباد تھے اور وہ بہت اہم' بااثر اور طاقتور تھے۔ مدینہ کے اقتصادی شعبہ پر ان کا مضبوط تسلط تھا۔ ان کی قلعہ نما گڑھیاں تھیں' جن میں کافی اسلحہ اور ساز و سامان تھا۔ اگرچہ یہود اصل مالکان دِہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے' مالکان دِہ تو اوس و خزرج تھے' لیکن سرمایہ' تنظیم اور تعلیم' یہ چیزیں یہود میں بہت زیادہ تھیں اور وہ بہت مؤثر عامل کی حیثیت سے وہاں موجود تھے۔ حضور ﷺ کی دُور اندیشی کا یہ شاہکار ہے کہ آپؐ نے مدینہ تشریف لے جاتے ہی فوراً یہود کے تینوں قبیلوں کو معاہدوں میں جکڑ لیا۔ ان سے معاہدہ میں طے پاگیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے' ان کے تمام شہری حقوق محفوظ رہیں گے' اور اگر کبھی مدینے پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو وہ مسلمانوں کے حلیف کی حیثیت سے ان کا ساتھ دیں گے یا بالکل غیرجانب دار رہیں گے۔ وہ اس معاہدے میں ایسے بندھ گئے کہ وہ کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں آسکے۔ اگرچہ بعد میں اسلام کی اشاعت اور استحکام کو دیکھ کر وہ انگاروں پر لوٹتے رہے اور مشرکینِ قریش سے سازباز کرکے پس پردہ ریشہ دوانیاں کرتے رہے لیکن یہ سب کچھ چوری چوری ہو رہا تھا' وہ علی الاعلان مقابلہ میں نہیں آسکتے تھے۔ مختصراً یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں کے تینوں قبیلوں کو معاہدوں کا پابند بنانے کے لئے جو اِقدام فرمایا وہ ہر لحاظ سے دُور اندیشی اور فراست وذہانت کا ایک شاہکار تھا۔ اس اِقدام نے اسلامی تاریخ میں نہایت اہم اور مثبت کردار ادا کیا ہے۔

راست اِقدام کا مرحلہ

ربیع الاول سے لے کر رمضان ۱ھ کے دوران رسول اللہ ﷺ نے کوئی مہم مدینہ منورہ سے باہر نہیں بھیجی۔ یہ چھ مہینے آپؐ نے مدینہ میں اپنی پوزیشن کو مستحکم

کرنے اور ہجرت کی وجہ سے اسلامی انقلابی جماعت کے جو دو عناصر وجود میں آ گئے تھے 'یعنی مہاجرین و انصار' ان کو باہم شیر و شکر کرنے اور بنیانِ مرصوص بنانے میں صرف فرمائے۔ اس کے بعد راست اِقدام کا مرحلہ شروع ہوتا ہے ـــــ وہ مرحلہ کیا ہے؟ اس کو صرف تاریخی اعتبار سے سمجھنے کے بجائے نبی اکرم ﷺ کے منہجِ انقلاب کے نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہئے۔ حضور ﷺ نے آٹھ فوجی مہمات مکّہ کی طرف روانہ فرمائیں' جن میں سے چار میں حضور ﷺ بنفس نفیس شریک ہوئے۔ لہٰذا انہیں غزوات کہا جاتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ وہ غزوات ہیں جو غزوۂ بدر سے پہلے کے ہیں۔ عام طور پر ہمارا تصور اور تأثر یہ ہے کہ پہلا غزوہ غزوۂ بدر ہے۔ پہلی باقاعدہ جنگ یقیناً غزوۂ بدر ہے۔ غَزَا یَغْزُو عربی میں اللہ کی راہ میں نکلنے کو کہتے ہیں اور اصطلاحاً غزوہ خاص ہو گیا اس مہم کے لئے جس میں نبی اکرم ﷺ بنفسِ نفیس نکلے ہوں۔ تو ابتدائی چھ ماہ کے بعد چار فوجی مہمات وہ ہیں جن میں حضور ﷺ خود مدینہ سے باہر نکلے' جبکہ چار سرایا ہیں۔ سریّہ اُس فوجی مہم کو کہا جاتا ہے کہ آپؐ نے کوئی مہم بھیجی یا کوئی لشکر روانہ فرمایا اور کسی صحابیؓ کو اس کا سربراہ یا سپہ سالار مقرر فرما دیا' آپؐ خود اس میں شامل نہیں ہوئے۔ ان آٹھ مہموں کے حالات و واقعات کو ہمارے اکثر سیرت نگار اور مؤرخین نے بمشکل تمام دو یا تین صفحات میں سمیٹ لیا اور اس میں بھی نہایت ایجاز و اجمال سے کام لیا۔ حالانکہ یہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کا وہ اہم اور نازک مرحلہ ہے جس میں اِقدام اور پیش قدمی اب حضور ﷺ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یا بالفاظ دیگر صبرِ محض (Passive Resistance) اب "راست اقدام" (Active Resistance) میں تبدیل ہو رہا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس راست اِقدام کی نوعیت تھی کیا؟ اصل میں رسول اللہ ﷺ نے مکّہ کے خلاف جو اِقدام کیا اس کے دو مقصد سامنے آتے ہیں۔ جدید اصطلاحات کے حوالہ سے پہلا نکتہ کا Economic Blockade یعنی معاشی ناکہ بندی ہے۔ اہلِ مکّہ اور قریش کی معاشی زندگی کا دارومدار تجارت پر تھا۔ مکّہ کا

اپنا حال بالفاظ قرآن "بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ" تھا۔ وہاں کسی نوع کی پیداوار نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو کھانے پینے کی چیزوں کے لئے باہر کی منڈیوں کے محتاج تھے۔ وہاں ایک دانہ تک نہیں اُگتا تھا۔ البتہ ان کے ہاں بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے' جن کا دودھ اور گوشت انہیں حاصل تھا۔ لہٰذا ان کی معیشت کا سارا دارومدار تجارت پر تھا' اور اُس دَور کی مشرقی اور مغربی ملکوں کے مابین تجارت میں قریش کو ایک اہم کڑی اور واسطہ (Link) کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ غور کیجئے کہ آج کل نہر سویز کی کتنی اہمیت ہے۔ اگر یہ کچھ عرصہ کے لئے بند ہو جائے تو تجارت کا کیا حال ہو جائے گا؟ اگرچہ دوسرے راستے موجود ہیں جو بہت طویل ہیں۔ لیکن آپ اُس زمانے کا تصور کیجئے جس زمانہ میں اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ جنوبی افریقہ سے ہندوستان اور مشرقی ایشیا کے بحری راستے تو پندرھویں صدی عیسوی میں دریافت ہوئے ہیں۔ لہٰذا مشرق و مغرب کی تجارت حضور ﷺ کی بعثت کے دَور میں عرب کے راستہ سے ہوتی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ ہندوستان' انڈونیشیا' ملائیشیا اور دوسرے مشرقی ممالک کا سارا سامانِ تجارت بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے یمن کے ساحل تک پہنچتا تھا۔ اُدھر مغرب کے ممالک یعنی یونان' اٹلی اور بلقان کی ریاستوں کا سارا سامانِ تجارت شام کے ساحلوں پر اتر جاتا تھا۔ اس طرح یورپ کے ممالک کا سامانِ تجارت بحیرۂ روم سے ہو کر اِدھر پہنچتا تھا اور اِدھر بحیرۂ عرب اور بحیرۂ ہند سے ہو کر مشرقی ممالک و جزائر کا سامانِ تجارت یمن پہنچ جاتا تھا۔ اب ان کے مابین کاروبار کی جو ساری نقل و حمل (Transfer and Transport) تھی وہ صرف قریش کے ہاتھ میں تھی' جس کا قرآن مجید میں سورۂ قریش میں بڑے اہتمام سے ذکر فرمایا گیا ہے: ﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝﴾ ـــــ ان کے قافلے سردیوں میں یمن کی طرف جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال یعنی شام کے ساحلوں کی طرف سفر کرتے تھے۔ ایک بڑا تجارتی سفر سردیوں میں اور ایک بڑا تجارتی سفر گرمیوں میں ان کے معمولات میں شامل تھا اور انہیں ان دونوں اَسفار میں مکمل امن حاصل رہتا

تھا۔ جبکہ عرب کے دوسرے قبائل کو یہ امن میسر نہ تھا' بلکہ ان کے قافلے اکثر لوٹ لئے جاتے تھے' کیونکہ عرب کے اکثر قبائل کا پیشہ ہی لوٹ مار' رہزنی اور غارت گری تھا۔ تو کسی اور قبیلہ کا قافلہ شاذ ہی لوٹ مار سے بچ کر نکلتا تھا' سوائے قریش کے' کہ ان کے قافلہ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ قریش کعبہ کے متولی تھے جسے تمام عرب اللہ کا گھر تسلیم کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ کعبہ میں جو تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے وہ سارے کے سارے قریش کے تو نہیں تھے۔ بلکہ صورت یہ تھی کہ تمام عرب قبائل کے "خدا" قریش کے پاس بطور "یرغمالی" رکھے ہوئے تھے۔ اگر ان کے قافلہ پر کوئی قبیلہ ہاتھ ڈالے تو قریش اس قبیلہ کے "خدا" کی گردن مروڑ سکتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ قریش کے قافلوں کو تحفظ حاصل تھا ___
سورۂ قریش میں آگے فرمایا گیا : ﴿ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ○ الَّذِيْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ○ ﴾ (بدبختو! تمہیں اللہ کے اس گھر کی وجہ سے رزق مل رہا ہے اور تم نے اس کی حرمت کو بٹہ لگا رکھا ہے۔) تم پر تو لازم ہے کہ اس گھر کے مالک اللہ واحد کی عبادت کرو' جس نے تم کو بھوک سے نجات دلا رکھی ہے اور خوف سے محفوظ کر رکھا ہے۔

تو اس منظر کو سامنے رکھئے کہ مغرب و مشرق کی تجارت میں قریش کو بلا شرکتِ غیرے اجارہ داری حاصل تھی' اس وجہ سے کہ یہ کعبہ کے متولی تھے اور کعبہ میں تمام قبیلوں کے بُت رکھے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے قافلوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ لیکن اب حضور ﷺ نے ان پر ہاتھ ڈالنا شروع فرمایا اور آپؐ نے اب ایک قوت ہونے کے اعتبار سے اپنی موجودگی ثابت فرما دی۔ حضور ﷺ کے اس اِقدام کا ایک مقصد مکہ کی معاشی ناکہ بندی تھا۔ حضور ﷺ نے درحقیقت قریش کی رگِ جان (Lifeline) پر ہاتھ ڈالا اور ان کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنا دیا۔ اس طرح ان کی معاش کے لئے ایک خطرہ پیدا فرما دیا۔ قریش کی معاشی ناکہ بندی کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کا دوسرا مقصد قریش کی سیاسی ناکہ (Isolation or Political containment) تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس علاقے میں جو دوسرے قبیلے آباد تھے ان کے قریش سے معاہدے تھے اور وہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ حضور ﷺ نے اس علاقے میں متعدد سفر کیے جن میں اپنی قوت کا مظاہرہ بھی فرمایا اور دعوت و تبلیغ کا کام بھی کیا۔ دونوں کام ساتھ ساتھ ہو رہے تھے۔ بقول اقبال ؏ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد ___ تو تبلیغ و دعوت کے ساتھ طاقت بھی شامل ہو جائے تو اب یوں سمجھئے کہ جیسے سونے پر سہاگہ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں ہجرت کا ذکر آ رہا ہے وہاں حضور ﷺ کو یہ دعا تلقین کی گئی تھی : ﴿ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا ﴾ "اے اللہ! جہاں تو مجھے داخل کرنے والا ہے وہاں میرا داخلہ سچائی اور راست بازی کے ساتھ ہو اور جہاں سے تو مجھے نکال رہا ہے وہاں سے سچائی اور راست بازی کے ساتھ نکال' اور اپنے خاص خزانہ فضل سے قوت و طاقت کے ساتھ میری مدد فرما۔" یہ ہے وہ قوت اور طاقت جو حضور ﷺ کو مدینہ میں تشریف لانے کے بعد حاصل ہو گئی تھی ___ تو اب حضور ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ نکلتے تھے۔ کسی قبیلہ میں جا کر آپ نے دس بیس دن قیام فرمایا' ان کے ساتھ معاہدے کیے' اوّل تو ان کو اپنا حلیف بنا لیا ورنہ کم از کم انہیں غیر جانب دار ضرور بنا لیا کہ اگر تمہارا قریش کے ساتھ معاہدہ ہے تو ہمارے ساتھ بھی کرو' ہمارے خلاف ان کی مدد نہ کرو اور ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرو' بالکل غیر جانب دار ہو جاؤ۔ یہ ہیں حضور ﷺ کے وہ اقدامات جن کو جدید اصطلاحات کے حوالے سے قریش کی معاشی اور سیاسی ناکہ بندی کہا جا سکتا ہے۔

ان مقاصد کے لئے چار سفر تو حضور ﷺ نے بنفس نفیس فرمائے اور چار مہمات ایسی روانہ کیں کہ جن میں آپؐ شریک نہیں تھے۔ یہاں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ ان مہموں میں آپؐ نے کسی انصاری صحابیؓ کو شامل نہیں فرمایا۔ یہ جملہ مہمات مہاجرینؓ پر مشتمل تھیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بیعتِ عقبہ

ثانیہ کے موقع پر انصارؓ نے عرض کیا تھا کہ "آپؐ مدینہ تشریف لے آیئے۔ اگر قریش نے آپؐ کی وجہ سے مدینہ پر حملہ کیا تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔" دوسری خاص بات یہ کہ کُل ایک سال کے اندر یہ ساری کارروائی عمل میں آ گئی۔ یعنی رمضان ۱ھ سے لے کر رمضان ۲ھ تک کے عرصہ میں حضور ﷺ نے آٹھ مہمّات سرانجام دیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر کم وقت میں کس قدر شدّومدّ اور زور و شور کے ساتھ یہ عمل ہوا۔ ایسا نہیں تھا کہ آپؐ نے بکتربند گاڑیوں پر کوئی مہم بھیج دی ہو' بلکہ یہ تمام مہمات اونٹوں کے ذریعے یا پاپیادہ طے کی گئیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ سیرت نگاروں نے غزوۂ بدر سے قبل کی ان مہموں کا بہت ہی سرسری طور پر ذکر کیا ہے اور اس مقام سے ایسے گزر گئے ہیں کہ جیسے یہ سیرت کے غیر اہم واقعات تھے۔ ان کے نزدیک ہجرت کے بعد پہلا قابل ذکر واقعہ غزوۂ بدر ہے' حالانکہ غور طلب بات یہ ہے کہ غزوۂ بدر ہوا کیوں؟ غزوۂ بدر سے تو اصل میں حضور ﷺ کی انقلابی جدّوجُہد چھٹے اور آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) میں داخل ہوئی ہے۔ لیکن Passive Resistance (یعنی صبر محض) نے ہجرت کے بعد Active Resistance (یعنی راست اِقدام) کی صورت کیسے اختیار کی' جس کے نتیجہ میں مسلح تصادم کی نوبت آئی؟ یہ ہے وہ قریباً ڈیڑھ دو سال کی تاریخ جس پر غور و تدبر سے حضور ﷺ کا منہجِ انقلاب صحیح طور پر سمجھ میں آ سکے گا اور یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ حضور ﷺ کو تلوار کیوں اٹھانا پڑی۔

درحقیقت پہلے چھ مہینوں میں جب کہ نبی اکرم ﷺ نے ابھی کوئی اِقدام نہیں فرمایا تھا ایک واقعہ پیش آیا جو بہت اہم ہے۔ رئیسِ اوس حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مدینہ سے مکّہ گئے۔ ابھی تک مسلمانوں اور کفارِ مکّہ کے مابین کھلا اعلان جنگ نہیں ہوا تھا۔ مکّہ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا حلیف اُمیّہ بن خلف تھا جو کبھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا

آقاہوا کرتا تھا اور اس نے ان کو بہت ستایا تھا۔ حضرت سعدؓ نے اس کے یہاں قیام کیا اور پھر طواف کے لئے حرم گئے۔ وہاں ابو جہل سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اس نے اُمیّہ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اُس نے بتایا کہ یہ اوس کے رئیس سعد بن معاذؓ ہیں۔ ابو جہل انؓ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا اور کہنے لگا "اگر تم اُمیّہ کے حلیف نہ ہوتے تو تم بچ کر نہیں جاسکتے تھے۔ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ تم ہمارے دشمنوں اور بے دینوں کو پناہ دو اور خود آ کر بیت اللہ کا طواف کرو" ــــــ اس کے نزدیک تو جناب محمد ﷺ اور آپ کے ساتھیؓ 'معاذ اللہ' بے دین تھے 'کیونکہ انہوں نے قریش کا بت پرستی کا آبائی دین چھوڑ دیا تھا۔ حضرت سعد بن معاذؓ نے اسی وقت ترکی بہ ترکی جواب دیا "اگر تم نے ہم پر طواف بند کیا تو جان لو کہ ہم تمہارے تجارتی راستوں کو روک دیں گے"۔ یہ واقعہ سیرت النبیؐ میں موجود ہے۔ ان واقعات کی مدد سے حقائق کو سمجھنا ضروری ہے کہ کس طرح انقلابِ محمّدی ﷺ کا منہاج مختلف مراحل سے گزرا ہے ــــــ حقائق اور واقعات کو اس طرح سمجھنا چاہئے جیسے وہ پیش آئے اور ان سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان پر غور کرنا چاہئے۔

آنحضور ﷺ کے منہجِ عمل میں انسانی جدّوجُہد کی اہمیت

انقلابِ نبویؐ کے ضمن میں ایک حقیقت پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ سیرتِ مطہّرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس میں معجزوں کا دخل بہت کم نظر آتا ہے۔ سیرتِ مبارکہ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح نظر آئے گی کہ حضور ﷺ کے منہجِ عمل میں انسانی جدّوجُہد (Human Efforts)' محنت 'کوشش 'کشاکش 'کشمکش 'ایثار و قربانی 'صبر و مصابرت اور جہاد و استقامت کے عناصر غالب نظر آئیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سارا عمل زمین پر قدم بقدم چل کر مصائب و شدائد جھیل کر 'قربانیاں دے کر انجام دیا گیا ہے۔ انقلابِ محمّدیؐ کا یہ سارا راستہ اور فاصلہ انسانی سطح پر ان تمام مرحلوں سے گزر کر طے کیا گیا ہے جو ہر

انقلابی عمل کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ نبی اکرم ﷺ کے بے شمار حسی معجزات' کرامات اور خرق عادت واقعات ہیں' حضور ﷺ کے دستِ مبارک سے متعدد بار عظیم ترین برکات کا ظہور ہوا ہے ـــــ لیکن اس انقلابی جِدّوجُہد میں ان کا کتنا کچھ دخل ہے' اس اعتبار سے کبھی سوچیں اور اس نقطۂ نظر سے سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ درحقیقت اس میں غالب ترین عنصر انسانی سطح کی جِدّوجُہد کا ہے' جس میں مشکلات ہیں' مصائب ہیں' جور و ستم ہے' تعدّی و ظلم ہے' شدائد ہیں۔ خود محبوبِ ربّ العالمین ﷺ کے لئے قید و بند اور معاشی مقاطعہ ہے' رحمۃٌ لِلعالمین ﷺ پر پتھروں کی بارش ہے' جس سے جسمِ اطہر سے اتنا خون بہا ہے کہ نعلین مبارک پیروں میں جم گئے ہیں۔ زخموں سے چور اور نڈھال ہو کر آپؐ طائف کی گلیوں میں کئی بار گرے ہیں اور ظالموں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر پھر کھڑا کر دیا ہے اور چلنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ سب کچھ خود محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوا ہے' لیکن نہ دشمنوں کے ہاتھ شل ہوئے اور نہ وہ زمین میں دھنسائے گئے ـــــ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی بھی وجہ ہے' اور وہ یہ کہ حضور ﷺ نے ان تمام مراحل سے گزر کر اللہ کا دین عرب پر غالب فرمایا' اب حضور ﷺ کی اُمّت کو اللہ کا یہ دین پوری دنیا پر غالب کرنا ہے ـــــ تو اگر نبی اکرم ﷺ کی یہ جِدّوجُہد معجزوں کے ساتھ کامیاب اور غالب ہوئی ہوتی تو بعد والوں کے لئے بھی معجزے ہونے چاہئیں تھے' حالانکہ معجزہ صرف انبیاء و رُسل کے ساتھ مختص ہوتا ہے' اُمت کے لئے معجزات نہیں ہوتے۔ یہ بات سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد وہاں بھی آئی تھی اور جب کبھی بھی حضور ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کی جائے گی' اللہ کی غیبی مدد تب بھی ضرور آئے گی ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور نصرت کا دروازہ بند نہیں ہوا' لیکن معجزہ صرف انبیاء و

رُسل کے لئے مختص ہوتا ہے۔ نبوّت و رسالت کے اختتام کے ساتھ ہی معجزات کا سلسلہ بھی ختم ہوا' اب جو بھی کوشش اور جِدّ وجُہد کرنی ہوگی' وہ زمین پر قدم بقدم چل کر خالص انسانی سطح پر کرنی ہوگی۔ لہٰذا جناب مُحمّدؐ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمّت پر یہ حجت قائم فرمادی کہ آپؐ نے بالکل انسانی سطح پر' زمین پر قدم بقدم چل کر' مصائب و شدائد جھیل کر اور ہر طرح کے موانعات سے نبرد آزما ہو کر جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی انقلاب برپا فرمادیا ـــــ بہرحال سعد بن معاذؓ کا مذکورہ بالا قول بھی پیشِ نظر رہنا چاہئے۔

عبداللہ بن اُبَیّ کی بدبختی

دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبَی خزرج کا بہت بڑا سردار تھا اور اوس و خزرج کے دونوں قبیلے باہمی مشاورت سے اسے مدینہ کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کرچکے تھے۔ اس کیلئے تاج بھی تیار ہوگیا تھا۔ اور یہی بات اس شخص کی بدبختی کا اصل سبب بن گئی کہ وہ منافقین کا سردار بن گیا' کیونکہ اس کی بادشاہت کا آئینہ نبی اکرم ﷺ کی مدینہ میں تشریف آوری کے باعث چکنا چور ہوگیا۔ اب ان بے تاج بادشاہ ﷺ کے درودِ مسعود کے بعد کسی کے باتاج بادشاہ بننے کی گنجائش کہاں رہی! وہ ایمان تو لے آیا' کیونکہ دونوں قبیلے ایمان لے آئے تھے' لیکن پہلے ہی دن سے اس کے دل میں نفاق کا بیج جو پڑا تو وہ پروان چڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کے پاس قریش کے خطوط آرہے تھے کہ تم حضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھ مہاجرین کو مدینہ سے باہر نکالو' تم کھڑے ہو جاؤ' تمہیں اِقدام کرنا چاہئے' ہماری مدد کی ضرورت ہو تو ہم لشکر لے کر آنے کے لئے تیار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس کی ریشہ دوانیاں ابتدا ہی سے شروع ہوگئی تھیں۔ یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ آپؐ بنفسِ نفیس چل کر عبداللہ بن اُبَی کے پاس تشریف لے گئے۔ حالانکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حضور ﷺ اس کو طلب فرماتے اور خود انتظار فرماتے ـــــ لیکن نہیں' معاملہ دین کا ہے۔ اس میں کسی کی کوئی ہیٹی

نہیں ہو جاتی۔ بقولِ غالب ؎ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا ——— یہاں دربدر جانا پڑتا ہے ——— حضور ﷺ نے خالص دنیوی انداز اور دلیل سے اسے سمجھایا اور فرمایا: دیکھو اگر تم نے کوئی اِقدام کیا تو کیا اپنے بھائیوں کے خلاف جنگ کرو گے؟ حضور ﷺ اسے سمجھا رہے ہیں کہ تمہارا سارا قبیلہ ایمان لا چکا ہے۔ اگر تم نے اس طرح کی کوئی حرکت کی جو ہمارے علم میں آئی ہے تو اچھی طرح سوچ لو کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا! تمہیں اپنے بھائی بندوں کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی ——— اسی وجہ سے اسے کوئی عملی اقدام کرنے کی جرأت نہیں ہوئی' اگرچہ وہ ساری عمر سازشیں اور ریشہ دوانیاں کرتا رہا' جیسے یہودی کرتے رہے' لیکن اسے کبھی بھی کھلم کھلا سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

غزوۂ بدر سے قبل آٹھ مہمات

اب غزوۂ بدر سے قبل کی آٹھ مہمات کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ رمضان المبارک ۱ھ میں سب سے پہلا سریّہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بھیجا۔ یہ سریّہ تیس مہاجرین پر مشتمل تھا۔ یہ لشکر ساحلِ سمندر تک پہنچ گیا۔ وہاں ابوجہل تین سو کی نفری کے ساتھ کوئی تجارتی قافلہ لے کر جا رہا تھا۔ وہاں دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ لیکن مجدی بن عمر جہنی ایک شخص تھا جس کا حضور ﷺ سے معاہدہ ہو چکا تھا' وہ بیچ میں پڑ گیا اور اس نے کوئی مسلح تصادم نہیں ہونے دیا۔ لہٰذا کوئی جنگ یا خونریزی نہیں ہوئی۔ ورنہ تیس صحابہ رضی اللہ عنہم کا تین سو مشرکینِ مکہ سے مقابلہ ہوتا۔ گویا ایک اور دس کی نسبت تھی۔ یہ پہلی مہم تھی جو حضور ﷺ نے رمضان ۱ھ میں بھیجی تھی۔ یہ بات تاریخ کے حوالہ سے سامنے رکھئے۔ اس سریّہ کے بارے میں تاریخ میں آیا ہے کہ پہلا جھنڈا جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے بلند فرمایا وہ اس سریہ کے لئے تھا جو حضور ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا تھا۔

دوسری مہم ایک ماہ بعد ہی شوال ۱ھ میں حضرت عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کی

سرکردگی میں مہاجرین کے ساتھ بھیجی گئی۔ اس کا بھی ابو سفیان کے ایک قافلہ کے ساتھ رابغ کے مقام پر آمنا سامنا ہو گیا اور ٹکراؤ کی نوبت آگئی۔ رابغ بھی ساحل بحر پر ہے۔ (حج اور عمرہ کرنے والے حضرات اس مقام سے بخوبی واقف ہیں کیونکہ یہ مدینہ کے راستہ میں آتا ہے)۔ بہرکیف اس موقع پر بھی جنگ نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ ابھی تک کسی فریق کی طرف سے بھی باقاعدہ اعلانِ جنگ نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا مقصد اصل میں یہ تھا کہ اپنی موجودگی ثابت کر دیں کہ اب یہ تجارتی راستہ تمہارے لئے پہلے کی طرح محفوظ و مامون نہیں ہے کہ بے کھٹکے گزرتے رہو' بلکہ یہ اب ہماری زد میں ہے۔ اس موقع پر پہلا تیر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے چلایا' اگرچہ اس سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ یہاں بھی بیچ بچاؤ ہو گیا اور باقاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

رسول اللہ ﷺ نے تیسرا سریہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیر سرکردگی ذو القعدہ میں بھیجا جو تیس مہاجر صحابہ رضی اللہ عنہم پر مشتمل تھا۔ اس طرح حضور ﷺ مسلسل ہر ماہ ایک ایک مہم روانہ فرما رہے تھے۔ اس سریہ کے لئے حضور ﷺ نے ضرار کا مقام متعین فرمایا تھا۔ تاریخ میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرما دیا تھا کہ وہاں تک جاؤ' اس سے تجاوز نہ کرنا۔ ان مہموں کا مقصد در اصل قریش کے تجارتی راستوں پر اپنی موجودگی کا اعلان کرنا اور قریش کو ان راستوں کے مخدوش ہونے کی تشویش میں مبتلا کرنا تھا۔ حضور ﷺ کے یہ اقدامات قریش مکہ کی معیشت کے اعتبار سے نہایت نازک اور پریشان کن (Critical and Cruical) تھے' کیونکہ ان کے شام کے لئے تجارتی قافلے انہی راستوں سے گزرتے تھے۔

اس کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا جن میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ اس سلسلے کا پہلا سفر ۲ھ میں ہوا۔ بنو ضمرہ کا ایک بہت بڑا قبیلہ تھا' وہاں حضور ﷺ نے قیام فرمایا۔ اس سفر کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اپنی موجودگی کا اظہار ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ نبی اکرم ﷺ کا اس قبیلہ کے ساتھ حلیف ہونے کا

معاہدہ طے پا گیا۔ دوسرا سفر ربیع الاول یا ربیع الآخر میں ہوا (اس میں کچھ اختلاف ہے۔) اس میں غزوۂ بواط واقع ہوا، جس میں حضور ﷺ خود شریک تھے۔ سیرت کی کتابوں میں مقام کا نام اور مہینہ تو موجود ہے لیکن اس کی تفاصیل نہیں ملتیں۔

اس کے بعد حضور ﷺ کے ایک نہایت اہم سفر کا ذکر کتب سیرت میں غزوۂ ذی العشیرہ کے عنوان سے ملتا ہے۔ حضور ﷺ کا یہ سفر قریباً دو ماہ پر محیط تھا۔ یعنی جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ ۲ھ ــــــ اور حضور ﷺ نے یہ سفر اُس قافلے کو روکنے کے لئے اختیار فرمایا تھا جو ابو سفیان کی سرکردگی میں شام کو جا رہا تھا۔ یہی وہ قافلہ ہے کہ جب واپس آ رہا تھا تو حضور ﷺ نے اس کو روکنے کا ارادہ فرمایا تو اس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر واقع ہو گیا ــــــ اس قافلہ کا بھی ایک مخصوص تاریخی پس منظر ہے۔ حضور ﷺ کی ہجرت سے متصلاً قبل اور بعد مکّہ سے مہاجرین ؓ نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ لیکن اکثر و بیشتر مہاجرین اپنے اہل و عیال کو ساتھ نہیں لا سکے تھے اور وہ مکّہ ہی میں رہ گئے تھے۔ اسی طرح ان کا ساز و سامان اور اثاثہ و سرمایہ بھی مکّہ ہی میں رہ گیا تھا۔ اس کے بعد مشرکینِ مکّہ نے دار النّدوہ میں یہ طے کیا تھا کہ مہاجرین کی تمام چیزیں ضبط کر لی جائیں اور ان کی فروخت سے ایک بہت بڑا فنڈ قائم کیا جائے، جس سے ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ تشکیل دیا جائے اور اس تجارت سے جو منافع ہو گا اس کو ہم مسلمانوں پر لشکر کشی کے لئے استعمال کریں گے۔ تو گویا یہ محض ایک تجارتی قافلہ نہیں تھا بلکہ آئندہ جو مسلح تصادم ہونے والا تھا اس کے لئے مالی ذرائع فراہم کرنا بھی اوّل روز سے اس قافلہ کی ترتیب و تشکیل میں پیش نظر تھا ــــــ یہ خبر مدینہ پہنچ چکی تھی اور بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت حمزہ ؓ نے حضور ﷺ سے درخواست بھی کی تھی کہ اب ہمیں جنگ کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ ہم جو ساز و سامان اور اثاثہ مکّہ میں چھوڑ کر آئے تھے وہ سارے کا سارا قریش نے ضبط کر لیا ہے اور اس کے منافع سے جنگی تیاری ان کے پیش نظر ہے۔

بہر حال نبی اکرم ﷺ اس قافلے کے تعاقب کے لئے نکلے۔ حضور ﷺ کے

ساتھ ڈیڑھ سو مہاجرین اور تیس اونٹ تھے۔ مجاہدین قافلہ کے تعاقب میں ینبوع تک پہنچ گئے۔ لیکن چند دنوں کا فصل پڑ گیا تھا اور قافلہ چند راتیں قبل شام کی طرف نکل چکا تھا' لہٰذا اس کا راستہ روکا نہیں جاسکا۔ البتہ نبی اکرم ﷺ نے وہاں قیام فرمایا اور وہاں آباد قبیلہ بنی مصطلق کے ساتھ مصالحت کی۔ طے یہ ہوا کہ قبیلہ بنی مصطلق کے لوگ غیر جانب دار رہیں گے' نہ تو قریش مکہ کے خلاف مسلمانوں کی مدد کریں گے نہ مسلمانوں کے خلاف قریش مکہ کی۔ یہ غزوہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس کا بالواسطہ تعلق غزوۂ بدر سے جڑ جاتا ہے۔

غزوۂ بدر سے متصلاً قبل ایک غزوہ اور ہے جسے غزوۂ بدرِ اولیٰ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک شخص عرض بن شعری نے اپنی ذاتی حیثیت سے مسلمانوں پر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور مدینہ کے قرب و جوار میں لوٹ مار کی اور چند مویشی پکڑ کر لے گیا۔ اس میں قریش کا ہاتھ نہیں تھا۔ حضور ﷺ نے تعاقب کیا اور آپؐ بدر تک پہنچے' لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔ حضور ﷺ اس سے آگے تشریف نہیں لے گئے اور مراجعت فرمائی۔ چونکہ یہ بھی حضور ﷺ کا ایک سفر ہے' طاقت اور نفری کے ساتھ' لہٰذا یہ بھی ان غزوات کی فہرست میں شامل ہے۔

مسلّح تصادم کا آغاز : واقعۂ نخلہ

اس سلسلے کا اہم ترین واقعہ نخلہ کا ہے' جس نے اصل میں مکہ میں آگ لگائی۔ یہ واقعہ سریۂ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نام سے سیرت کی کتب میں مذکور ہے۔ اس کا خاص معاملہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش ؓ کو ایک بند خط دیا اور فرمایا کہ مکہ کی طرف جاؤ' اور جب مدینہ سے دو دن کی مسافت طے کر لو تب یہ خط کھولنا' پھر اس میں دیکھنا کہ کیا لکھا ہے' اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا —— اب آپ اندازہ کیجئے کہ رازداری (secrecy) کس درجہ کی ہے! حضور ﷺ نے اس کو اس درجہ مخفی رکھا ہے کہ خود کمانڈر کو معلوم نہیں ہے کہ وہ مہم کیا ہے جو اس کے

سپرد کی گئی ہے! بعض روایات میں بارہ صحابہ اور بعض میں آٹھ کی تعداد کا ذکر آتا ہے جو حضرت عبداللہ بن جحش ؓ کے ساتھ تھے۔ مدینہ سے دو دن کی مسافت کے بعد انہوں نے خط کھولا تو اس میں ہدایت تھی کہ وادیٔ نخلہ [1] پہنچو۔ یہ وادیٔ نخلہ کہاں ہے؟ اب ذرا جغرافیہ کو ذہن میں لایئے۔ مکّہ جنوب میں ہے' مدینہ شمال میں اور طائف مکّہ سے جنوب مشرق میں ہے۔ مدینہ سے وہاں کا فاصلہ کم از کم تین سو میل کا ہے۔ یہاں مہم بھیجنا بغیر کسی اہم منصوبہ کے اور بغیر کسی سوچے سمجھے اِقدام کے ممکن نہیں تھا' یہ تمام کارروائی بلا سبب نہیں تھی۔ تو حضرت عبداللہ بن جحش ؓ کو حکم ہوا کہ مکّہ اور طائف کے درمیان جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کرو اور قریش کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھو اور ہمیں اس کے بارے میں اطلاعات دیتے رہو۔ یمن کی طرف جانے والے قریش کے قافلے یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یمن کا راستہ طائف سے ہو کر گزرتا ہے اور وادیٔ نخلہ طائف اور مکّہ کے درمیان واقع ہے۔ جو قافلے شام کو جاتے تھے ان کے راستوں کے متعلق سات مہمات آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں' جو ان راستوں میں اپنی موجودگی ثابت کرنے اور ان کو مخدوش بنانے کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ لیکن یہ مہم اس راستہ کے لئے تھی جو طائف سے ہو کر یمن جاتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن جحش ؓ نے جب خط پڑھا تو چونکہ مہم بڑی سخت اور کڑی آ پڑی تھی لہٰذا آپ ؓ نے اپنے ساتھیوں پر واضح کر دیا کہ میں تو جاؤں گا' اس لئے کہ حضور ﷺ کا حکم ہے' لیکن تم میں سے جو میرا ساتھ دینا چاہے دے' میں کسی کو مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن ان سب نے کہا جو حضور ﷺ کا حکم ہے وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ ان سب نے جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کیا۔ وہاں ایک مختصر سا قافلہ آ گیا' جس میں قریش کے کُل پانچ افراد شامل تھے' اگرچہ وہ سبھی بڑے اونچے گھرانوں کے لوگ تھے۔ متعدّد اونٹوں پر لدا ہوا کافی سامانِ تجارت انکے ساتھ تھا جو وہ طائف سے مکّہ

---

[1] وادیٔ نخلہ وہ وادی ہے جہاں ۱۰ نبوی میں سفر طائف سے واپس آتے ہوئے آپ نے فجر کی نماز پڑھی۔ اس وقت جنّوں کا ایک گروہ وہاں سے گزرا اور قرآن سن کر ایمان لے آیا۔

لے جا رہے تھے۔ یہ قافلہ جب وہاں سے گزرا تو مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہم کیا کریں۔ اگرچہ حضور ﷺ کے خط میں صراحت نہیں تھی کہ حملہ کیا جائے' لیکن ان کی رائے یہ بنی کہ ہمیں حملہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ مقابلہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ والوں میں سے ایک شخص جس کا نام عمرو بن عبداللہ الحضرمی بیان کیا گیا ہے' وہاں قتل ہو گیا۔ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کا باپ عبداللہ اگرچہ حضرموت کا رہنے والا تھا لیکن مکہ میں امیّہ بن حرب (ابوسفیان کے والد) کا حلیف تھا اور وہاں حلیف کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا تھا۔ اس تجارتی قافلے میں مغیرہ کے دو پوتے اور ایک آزاد کردہ غلام شامل تھے۔ مغیرہ کے خاندان کا شمار قریش کے چوٹی کے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ بہرکیف مقابلہ کے نتیجہ میں عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ دو افراد جان بچا کر فرار ہو گئے اور بقایا دو کو انہوں نے قیدی بنالیا۔ ان دو قیدیوں اور جو بھی مال غنیمت ہاتھ لگا اس کو لے کر یہ حضرات مدینہ واپس آ گئے۔

اس واقعہ کے متعلق ہمیں دو مختلف روایات ملتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش پر کوئی عتاب نہیں فرمایا۔ آپؐ نے مالِ غنیمت میں سے خُمس بھی قبول فرمالیا۔ جو دو قیدی تھے' ان کا فدیہ قبول کر کے انہیں آزاد فرمادیا۔ ان میں سے ایک قیدی حکم بن کیسان رضی اللہ عنہ وہیں مسلمان ہو گئے۔ مغیرہ کے پوتوں میں سے ایک بھاگ گیا تھا۔ دوسرا جو قید ہوا تھا' فدیہ دے کر چلا گیا۔ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں رضی اللہ عنہم کو نہ کوئی سرزنش فرمائی اور نہ ہی کوئی وضاحت طلب فرمائی کہ تم نے میرے حکم سے تجاوز کیوں کیا؟ (یہ ایک روایت ہے جسے عبداللہ بن محمد بن عبدالوہابؒ نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے) ـــــ دوسری روایت جو بہت سی کتابوں میں بیان کی گئی ہے' یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اظہارِ ناراضگی فرمایا' مالِ غنیمت قبول نہیں فرمایا' بلکہ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں حملہ کی اجازت نہیں دی تھی' میری ہدایت صرف یہ تھی کہ وہاں قیام کرو' قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور اس کی ہمیں اطلاع دیتے رہو۔ یہ اِقدام

تم نے خود کیا ہے۔

اس میں ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا تھا' وہ یہ کہ وہ رجب کی آخری تاریخ تھی اور رجب کا مہینہ اشہر حرم میں شامل ہے۔ یعنی اُن چار مہینوں میں سے ایک ہے جن میں مشرک و کافر بھی جنگ نہیں کرتے تھے ـــــ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مہم کے ارکان نے مشورہ کیا کہ ہمارے سامنے دو متبادل صورتیں ہیں۔ اگر ہم قافلہ کو چھوڑ دیتے ہیں تو رجب کی حرمت تو بچ جائے گی لیکن پھر یہ حدودِ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور وہاں ان پر حملہ ممکن نہ ہو گا۔ ہم دو حرمتوں کے مابین آ گئے ہیں۔ رجب کی آخری تاریخ تھی۔ رات شروع ہوئی تو رجب بھی ختم ہوا اور اشہرِ حُرم بھی ختم ہوئے ـــــ بہرحال مشورے سے یہ طے ہوا کہ جنگ کی جائے اور جنگ کا نتیجہ وہ نکلا جو اوپر بیان ہوا۔

اس پوری صورت حال پر غور کرنے کے بعد امکانی نتیجہ یہ ہے کہ اگر حضور ﷺ نے اظہارِ ناراضگی فرمایا تب بھی یہ بات مسلّم ہے کہ انہیں کوئی سزا نہیں دی۔ کیونکہ صورتِ حال (situation) ایسی بن گئی تھی کہ اس میں اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے ہاتھ بندھے رکھتے تو ہو سکتا تھا کہ سب شہید ہو جاتے۔ اس لئے کہ مڈبھیڑ ہوئی ہے' آمنا سامنا ہوا ہے جس کے نتیجہ میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

اب یہ جان لیجئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا! مکہ میں جب یہ خبر پہنچی تو وہاں گویا آگ لگ گئی۔ اس لئے کہ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد پہلا عَلم محمد ﷺ نے بلند فرمایا ـــــ پہلا تیر محمد ﷺ کے جان نثار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طرف سے چلا ـــــ اور اب پہلا قتل بھی اصحابِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ عنہم) کے ہاتھوں سے ہو گیا۔ حضور ﷺ نے حکم دیا تھا یا نہیں' بہرحال بالفعل یہ کام حضور ﷺ کے آدمیوں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اس کی ذمہ داری تو یقیناً آئے گی۔ جماعتی سطح پر تو یہی ہوتا ہے کہ جماعت کا کوئی فرد جب کوئی اِقدام کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری جماعت کے قائد پر آتی ہے۔ یا پھر یہ ہوتا کہ حضور ﷺ اس سے بالکلیہ

براءت کا اظہار فرماتے یا اِقدام کرنے والوں کو سزا دیتے اور مشرکین کے نقصان کی تلافی فرماتے۔ لیکن ایسی کوئی شکل حضور ﷺ نے اختیار نہیں فرمائی۔ گویا آپؐ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے اس اِقدام کو قبول (own) فرمالیا ــــ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکّہ میں چیخ وپکار شروع ہو گئی کہ قتل کا بدلہ قتل' خون کا بدلہ خون! ــــ مکّہ میں جو آگ لگی ہوئی تھی اُس کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ کسی قبائلی معاشرے میں یہ معاملہ کس قدر جذباتی اور اہم ہوتا ہے۔

ایک طرف مکّہ میں ہیجان خیز صورت حال تھی' دوسری طرف ابوسفیان کے قافلہ کی واپسی کا وقت آگیا۔ وہی قافلہ جسے غزوۂ ذی العشیرہ کے موقع پر حضور ﷺ نے روکنے (intercept کرنے) کی کوشش فرمائی تھی مال واسباب سے لدا پھندا واپس آرہا تھا۔ تو ابوسفیان کی طرف سے مکّہ میں یہ ہنگامی پیغام (S.O.S.Call) پہنچ گیا کہ مجھے محمد (ﷺ) کے ساتھیوں سے خطرہ ہے کہ وہ ہمارے قافلہ کو لوٹ لیں گے۔ لہٰذا مجھے فوراً کمک پہنچائی جائے اور قافلہ کی حفاظت کا معقول انتظام کیا جائے ــــ یہ دونوں باتیں تھیں کہ جن کی بنا پر مکّہ میں وہ لوگ جو جنگجو' جوشیلے اور مشتعل مزاج (Hawks) تھے وہ قابو سے باہر ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک دلیل آگئی تھی۔ اس طرح کے نمایاں اشخاص ابوجہل اور ابوسفیان تھے ــــ اس کے ساتھ ساتھ مکّہ میں ٹھنڈے مزاج' بُردبار طبیعت کے حامل اور شریف النفس لوگ (یعنی Doves) بھی موجود تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ خانہ جنگی ہو۔ ان میں نمایاں شخصیتیں عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام کی تھیں۔ آخر الذکر تو بعد میں ایمان لے آئے' جلیل القدر صحابی ہیں' رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ان کی پھوپھی تھیں' اور اس رشتہ سے حضور ﷺ ان کے پھوپھا ہوئے۔ عتبہ بن ربیعہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس نے ہجرت کے بعد قریش سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب تم محمد (ﷺ) کے خلاف کوئی اِقدام مت کرو' اب انہیں عرب کے حوالے کر دو۔ اب ان کا عرب سے ٹکراؤ ہو گا' ہم تو بس تماشا دیکھیں گے۔ اگر محمد (ﷺ) جیت جاتے ہیں

اور پورے عرب پر ان کا قبضہ و تسلط ہو جاتا ہے تو ہماری ہی جیت ہے' آخر وہ قریشی ہیں' ہمارے ہی آدمی ہیں ـــــ وہ بڑا دُور اندیش' سیاست دان اور مدبّر آدمی تھا۔ اس نے مزید کہا کہ "اگر عرب محمد (ﷺ) کو ہلاک کر دیں تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اور تمہیں اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے نہیں پڑیں گے"۔ اِس قدر دُور اندیشی کا مشورہ تھا جو عتبہ نے دیا تھا۔ تو عتبہ اور حکیم بن حزام آپس کی خونریزی سے بچنا چاہتے تھے۔ دوسری جانب ابوجہل Hawks کا سرخیل تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فوری اِقدام کیا جائے ـــــ اب جب یہ صورت حال پیش آ گئی تو یوں سمجھئے کہ ان کے جوشیلے اور جنگ پسند لوگوں کو تقویت حاصل ہو گئی کہ ایک تو ہمارا آدمی عمرو بن عبداللہ الحضرمی وادیٔ نخلہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لٰہذا خون کا بدلہ خون ہو گا اور دوسری طرف ہمارے تجارتی قافلہ کو شدید خطرہ درپیش ہے۔ لٰہذا ان بہانوں سے ایک ہزار جنگجوؤں کا کیل کانٹے سے لیس لشکر مکّہ سے مدینہ روانہ ہوا' جس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر رہوا۔ یہ غزوہ انقلابِ محمّدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کے آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا نقطۂ آغاز ہے۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات!!

خطابِ پنجم

جمعہ ۲ نومبر ۸۴ء

●

تصادم کا آخری مرحلہ: مسلح کشمکش

یعنی

قتال فی سبیل اللہ

●

غزوۂ بدر

"یوم الفرقان یوم التقی الجمعٰن"

★

- خلاصۂ مباحثِ گزشتہ
- غزوۂ بدر کا پس منظر
- غزوۂ بدر سے قبل مشاورت
- حکیم ابن حزامؓ اور عتبہ ابن ربیعہ کی آخری کوشش
  کہ جنگ رُک جائے!
- مشرکین کی دعائیں
- آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعا!
- مطالعہ سیرت سے متعلق ایک اہم نکتہ
- فرار نہیں، ہجرت!
- غزوۂ بدر کا اہم ترین واقعہ:
  اوّلین مبارزت اور مقابلہ!
- سنّت اللہ کا ظہور
- غزوۂ بدر کے اثرات
- مشاورت کی فضا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ مسنونہ 'تلاوتِ آیاتِ قرآنی 'احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لے جاکر حضور ﷺ نے چھ ماہ داخلی استحکام میں لگائے اور اس کے بعد رمضان اھ میں مہمات بھیجنے کا اِقدام فرمایا۔ غزوۂ بدر رمضان ۲ھ میں ہوا ہے۔ اس سے قبل ڈیڑھ سال کے اندر حضور ﷺ نے آٹھ مہمات بھیجی تھیں' جن میں ایک غزوۂ ذوالعشیرہ بہت اہم ہے اور دوسرا وادیٔ نخلہ کا فیصلہ کن واقعہ۔ یہ دونوں واقعات غزوۂ بدر کا اصل سبب بنے ہیں۔ غزوۂ بدر سے حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کا اندرون عرب آخری اور چھٹا مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) شروع ہوا ہے۔

مذکورہ بالا دو واقعات کی وجہ سے مکّہ میں Hawks کی بن آئی اور ایک ہزار جنگجوؤں کا لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکل کھڑا ہوا۔ ابوسفیان کی عدم موجودگی میں قریش کی سرداری عتبہ بن ربیعہ کے پاس تھی 'لہٰذا اس لشکر کا سپہ سالار بھی وہی تھا۔ ابوجہل 'اُمیہ بن خلف 'نضر بن حارث 'عقبہ بن ابی مُعَیط 'شیبہ بن عتبہ اور بہت سے وہ لوگ جو اہل ایمان کے خون کے پیاسے تھے 'سب کے سب نکلے۔ اس لشکر کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ سردارانِ قریش میں سے سوائے ابولہب کے اور کوئی پیچھے نہیں رہا۔ ابولہب بزدل انسان تھا۔ اس نے اپنی جگہ ایک mercenary یعنی کرائے کا فوجی بھیج دیا کہ میری طرف سے یہ لڑے گا۔ اس شخص میں انسانیت کا کوئی جوہر نہیں تھا' وہ بخیل اور بزدل شخص تھا' اس کی اپنے معاشرہ میں کوئی عزت نہیں تھی' لوگ اسے غزالِ زرّیں کا چور سمجھتے تھے۔ چونکہ یہ کعبہ کے بیت المال کا متولّی تھا اور وہاں سے چڑھاوے کے طور پر آیا ہوا سونے کا ہرن چوری ہو گیا تھا تو یہ

اس غزالِ زرین کا چور مشہور ہو گیا تھا۔ پس ابو لہب کے سوا قریش کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں بچا کہ جس کے تمام سربر آوردہ لوگ اس لشکر میں شامل نہ ہوئے ہوں۔ البتہ ابو سفیان رہ گئے تھے جو قافلہ کے ساتھ تھے۔ ان کو بھی ابو جہل نے پیغام بھیج دیا کہ اپنی نفری اور سازو سامان کے ساتھ ہم سے آکر مل جاؤ۔ لیکن ابو سفیان دھیمے مزاج کے حقیقت پسند انسان تھے' محض جذباتی انسان نہیں تھے۔ انہوں نے دو احتیاطیں کیں۔ ایک طرف مدد کے لئے مکہ پیغام بھیج دیا' اور دوسری طرف جب ان کو معلوم ہوا کہ محمد ﷺ کچھ لوگوں کے ساتھ قافلہ کا قصد فرما رہے ہیں تو انہوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔ چنانچہ وہ بدر کی طرف آئے ہی نہیں' بلکہ بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہو کر نکل گئے۔ انہیں ابو جہل کا پیغام مل بھی گیا تھا کہ لشکر کے ساتھ آکر شامل ہو جاؤ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ نہیں میں براہ راست مکہ جا رہا ہوں۔

غزوۂ بدر سے قبل مشاورت

صحیح و معتبر ترین روایات کے مطابق مدینہ میں حضور ﷺ نے کسی جنگ کا اعلان کیا نہ تیاری فرمائی۔ بلکہ پیشِ نظر صرف یہ تھا کہ جو قافلہ آ رہا ہے اسے روکنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ بغیر کسی خاص اہتمام اور تیاری کے نکل کھڑے ہوئے۔ یاد رہے کہ غزوۂ ذوالعشیرہ میں شامل ڈیڑھ سو افراد تمام مہاجرین ہی تھے' جبکہ غزوۂ بدر میں صرف ساٹھ یا تراسی (۸۳) مہاجرین ساتھ تھے۔ تعداد کے متعلق دونوں روایات موجود ہیں۔ اگر حضور ﷺ کے پیش نظر جنگ کا پروگرام ہوتا تو آپؐ خصوصی انتظام فرماتے اور تعداد زیادہ ہوتی۔ پھر یہ پہلی بار ہوا کہ انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ساتھ نکلے' بلکہ تعداد میں وہ زیادہ تھے۔ حضور ﷺ نے مدینہ میں بھی مشورہ کیا تھا اور پھر مدینہ کے باہر بھی ایک مجلسِ مشاورت منعقد فرمائی' لیکن مدینہ کی مشاورت میں جنگ کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا لہٰذا آپؐ نے کسی سے تاکیداً نہیں فرمایا کہ ساتھ چلو۔ انصارؓ بھی خود اپنی مرضی سے ساتھ ہو گئے تھے' حضورؐ کی طرف سے کوئی خصوصی

ترغیب نہیں تھی۔

آپؐ جب مدینہ سے کچھ دور پہنچے تو آپؐ کو معلوم ہوا کہ مکّہ سے ایک ہزار افراد پر مشتمل کیل کانٹے سے لیس لشکر سوئے مدینہ نکل پڑا ہے اور منزل پر منزل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اب یہ دو طرفہ معاملہ ہو گیا کہ شام کی طرف سے قافلہ آ رہا ہے اور جنوب سے لشکر چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ اب یہاں مدینہ سے باہر مشاورت ہوئی جو اہم ترین مشاورت ہے۔ قرآن مجید ایسے معاملات کو عموماً اختصار سے بیان کرتا ہے' للذا سورۃ الانفال کی آیات کے بین السّطور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حضور ﷺ نے ازراہِ مشورہ ہی یہ بات پیش کی ہو گی کہ "مسلمانو! ایک قافلہ شمال سے آ رہا ہے جس کے ساتھ صرف تیس یا پچاس محافظ ہیں' مال تجارت بہت ہے' اور ایک لشکر جنوب سے آ رہا ہے جو کیل کانٹے سے لیس ہے' اور اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک پر فتح کا وعدہ کر لیا ہے' بتاؤ کدھر چلیں؟ ان حالات میں کچھ لوگوں نے اپنی مخلصانہ سوچ کے مطابق تجویز کیا کہ حضورؐ قافلہ کی طرف چلئے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ تجویز پیش کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات ہو گی کہ قافلہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پچاس کی نفری ہے' وہ آسانی سے قابو میں آ جائیں گے' ساز و سامانِ تجارت بھی بہت ہاتھ لگے گا اور اسلحہ بھی' جو آئندہ جنگ میں کام آئے گا۔ لیکن حضور ﷺ جیسے کچھ منتظر سے تھے۔ تب لوگوں نے اندازہ کیا کہ منشائے مبارک کچھ اور ہے' حضور ﷺ کا اپنا رجحان طبع کچھ اور ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر مہاجرین نے تقریریں شروع کیں کہ حضورؐ! آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں' جو آپ کا ارادہ ہو' بسم اللہ کیجئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تقریر کی' لیکن حضور ﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی تقریر کی' لیکن حضور ﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے حضورؐ کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ بھی مہاجرین میں سے تھے' انہوں نے کھڑے ہو کر یہ الفاظ کہے کہ "حضورؐ جو آپؐ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجئے۔ ہمیں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجئے جنہوں نے اپنے

نبی (موسیٰ علیہ السلام) سے یہ کہہ دیا تھا کہ ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ ﴾ (پس آپ اور آپ کا رب دونوں جائیں اور جنگ کریں' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں) آپؐ بسم اللہ کیجئے' ہم آپؐ کے ساتھ لڑیں گے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے ذریعہ آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمادے"۔ لیکن حضور ﷺ پھر بھی کچھ انتظار کی کیفیت میں تھے۔

اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو خیال آیا کہ رسول اللہ ﷺ کا روئے سخن دراصل انصار کی جانب ہے۔ روایات میں اختلاف ہے کہ یہ کون سے سعدؓ ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کا قول یہی ہے۔ ایک روایت ہے کہ یہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ میرا رجحان غالب یہی ہے کہ یہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ انصارؓ کے دو قبیلے تھے' خزرج اور اَوس ــــــ خزرج کا قبیلہ تعداد میں اوس سے تین گنا تھا اور اس کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ خزرج ہی کی ایک شاخ کا سردار عبداللہ بن اُبَی تھا' جو منافقِ اعظم تھا' اور پورے قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ چنانچہ سردار کی طرف سے کسی رائے کا اظہار گویا پورے قبیلہ کی طرف سے اظہارِ رائے کے مترادف تھا۔ اَوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ بہرحال ان دونوں میں سے کسی نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ "حضورؐ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے...."
اس خیال کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ حضورؐ نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر مدینہ (یثرب) تشریف لانے کی جو دعوت قبول کی تھی تو اس میں یہ طے ہوا تھا کہ "اگر قریش مدینہ پر حملہ کریں گے تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں"۔ گویا انصار اس معاہدہ کی رُو سے اس کے پابند نہیں تھے کہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کریں۔ قافلہ کا راستہ روکنا اور بات ہے اور باقاعدہ ایک لشکر جرار سے جا ٹکرانا یہ بالکل دوسری بات ہے۔ حضرت سعدؓ کو فوراً خیال آ گیا کہ ہو نہ ہو حضور ﷺ ہماری تائید کے منتظر ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت سعدؓ نے اپنی تقریر

میں کہا : "اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَ صَدَّقْنَاكَ" یعنی حضورؐ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے' ہم نے آپ کو اللہ کا رسول مانا ہے۔ (اُس وقت معاہدے میں کیا طے ہوا تھا' کیا نہیں ہوا تھا اِس وقت وہ بات غیر متعلق ہے) آپؐ جو بھی حکم دیں گے سر آنکھوں پر سِرْبِنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ.... "اے اللہ کے رسول (ﷺ) لے چلئے ہم کو جہاں بھی لے جانا ہو۔ خدا کی قسم اگر آپؐ ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں ڈال دیں گے۔ اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم برک الغماد تک جا پہنچیں گے (جو یمن کے آخری کونے کا شہر ہے) اور اس کے لئے ہم اپنی سواریوں کو دبلا کر دیں گے۔" حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک کِھل اُٹھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس جماعت میں حضور ﷺ کی بیعت ثانوی چیز تھی۔ اس کی اصل بنیاد تو یہ تھی کہ جو آپؐ پر ایمان لائے اور آپؐ کی تصدیق کرے وہ اس جماعت میں شامل ہے۔ جس نے بھی آپؐ کو اللہ کا رسول مانا ہے اُس پر آپؐ کی اطاعت لازم ہے۔ جیسے فرمایا گیا : ﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ (النساء : ۶۵) "سو تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلافات میں تجھے منصف نہ مان لیں پھر تیرے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کریں"۔ ایمان کہاں رہ جائے گا اگر حضورؐ کا حکم نہ مانیں؟ لہٰذا اُس وقت حضرت سعد بن عبادہ یا حضرت سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہما) نے بڑی پیاری' بڑی بنیادی اور اصولی بات کہی تھی کہ : "اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ" اس بات سے حضور ﷺ کا چہرۂ انور کھل اُٹھا۔ گویا آپؐ انصار کی رائے معلوم کرنے کے منتظر تھے۔

اِس مشاورت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے پیش قدمی فرمائی اور پھر بدر پہنچ کر جب معلوم ہو گیا کہ قریش کا لشکر وادی کے دوسرے سرے تک پہنچ چکا ہے تو وہاں

آپؐ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کے لئے فرمایا۔ وہاں کا ایک واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض تجربہ کار حضرات نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر یہاں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ وحی کی بنا پر ہے تو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا' لیکن اگر یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے تو ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ جنگی مہارت اور حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اِس مقام کے بجائے دوسرے مقام پر کیمپ ہونا چاہئے۔ حضور ﷺ نے ان حضرات کی رائے کو قبول فرمایا۔ جہاں تک خالص دُنیوی امور کی تدابیر اور تجرباتی علوم کا تعلق ہے' جس طرح تابیر النخل کا معاملہ تھا' تو ان میں آپؐ نے ہمیشہ کے لئے اُمت کے لئے یہ ہدایت و تعلیم دے دی ہے کہ "اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ" یعنی اپنے دنیوی معاملات میں تم بہتر جانتے ہو۔ پھر نبی اکرم ﷺ کا مزاج ہی ایسا تھا کہ آپؐ دنیوی تدابیر کے معاملہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھودنے کا فیصلہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر فرمایا تھا۔

حکیم بن حزام اور عتبہ بن ربیعہ کی آخری کوشش

جنگ سے ایک رات قبل خبر پہنچ گئی کہ ابو سفیان کا قافلہ بچ کر نکل گیا ہے۔ اب مکّہ میں چہ میگوئی شروع ہوئی کہ اب جنگ کا کیا فائدہ ہے؟ ہم تو اپنے قافلہ کی حفاظت کے لئے آئے تھے۔ اس صورت حال سے مشتعل مزاج لوگوں (Hawks) کے مقابلہ میں صلح جُو (Doves) کے ہاتھ میں پھر ایک دلیل آ گئی کہ ہمارا مقصد تو قافلہ کی حفاظت تھا' قافلہ بچ کر نکل گیا' پھر جنگ کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ قریش کے دو گھرانے بنو زہرہ اور بنو عدی یہ کہہ کر لشکر کو چھوڑ کر چلے گئے کہ اب ہمیں جنگ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ حکیم بن حزام عتبہ کے پاس گئے جو اِس لشکر کا سپہ سالار تھا اور اس سے کہا: عتبہ! تم اس وقت نیکی کا ایک ایسا کام کر سکتے ہو کہ

تاریخ میں تمہارا نام لکھا جائے کہ تم نے بہت بڑا کام کیا۔ عتبہ کے استفسار پر انہوں نے وہی تجویز رکھی کہ ہمارا قافلہ بچ کر نکل چکا ہے' اب اس ہونے والی خونریزی کو تم روک سکتے ہو۔ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کا باپ عبداللہ حرب بن اُمیّہ کا حلیف تھا۔ اگر تم اس کی دیت یا خون بہا ادا کر دو تو وہ مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ قافلہ بچ کر نکل ہی چکا ہے۔ اس طرح جنگ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ عتبہ بن ربیعہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ بہت مناسب تجویز ہے۔ وہ خود اسی مزاج کا آدمی تھا۔ لیکن وہ جو Hawks کا سرغنہ ابوجہل موجود تھا' فی الاصل تو اس کو سمجھانا مقصود تھا۔ چنانچہ دونوں اس کے پاس گئے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ عتبہ نے کہا کہ دیکھو خونریزی کی کوئی ضرورت نہیں ہے' ہمارا قافلہ بچ کر چلا گیا ہے' عمرو کا خون بہا میں ادا کر دیتا ہوں۔ اب ابوجہل کی چالاکی دیکھئے۔ اس نے ایک تو عتبہ کو بزدلی کا طعنہ دیا اور کہا کہ تم اپنے بیٹے کو سامنے دیکھ کر گھبرا گئے ہو (یاد رہے کہ عتبہ کے بڑے بیٹے حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے' جو سابقون الاولون میں سے تھے' جبکہ عتبہ کا دوسرا بیٹا اس کے ساتھ تھا)۔ ابوجہل نے مزید نمک پاشی کرتے ہوئے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ محبّتِ پدری تمہیں بزدل بنا رہی ہے کہ بیٹا مدِّمقابل ہے' اسی لئے تم جنگ ٹالنا چاہتے ہو۔ اس کا عتبہ نے وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر ایک باغیرت و باحمیت انسان کو دینا چاہئے۔ اُس نے کہا کل کا دن بتا دے گا کہ بزدل کون ہے!۔ وہ اس طعنہ کو برداشت نہیں کر سکا۔

ابوجہل نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کے بھائی کو بلایا اور اس سے کہا کہ دیکھو ہم تمہارے بھائی کے خون کا بدلہ کل لے سکتے ہیں' لیکن یہ صلح پسند لوگ آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جنگ نہ ہو۔ اُس شخص نے عرب جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنے کپڑے پھاڑے' بالکل عریاں ہو گیا اور شور مچا دیا : وَاعَمرواہ' وَاعَمرواہ۔ اسے قبائلی زندگی میں Blood Cry (خونی چیخ) کہتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ مشتعل کرنے والا نعرہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے لشکر میں

آگ سی لگ گئی۔ الغرض مشرکین کے کیمپ میں آخری رات تک یہ کشمکش جاری رہی۔ لیکن بالآخر فیصلہ ہو گیا کہ بہرصورت کل جنگ ہو گی۔ چنانچہ دوسرے دن جنگ ہوئی۔

مشرکین کی دُعائیں

مشرکینِ مکّہ میں سے دو اشخاص کی غزوۂ بدر شروع ہونے سے متصلاً قبل رات کی دُعائیں کتب تاریخ میں نقل ہوئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی شب کو دُعا کی۔ مشرکین میں سے ایک ابوجہل اور دوسرے نضر بن حارث کی دُعا تاریخ میں منقول ہوئی ہے۔ وہ دونوں مشرک تھے' اللہ کے منکر نہیں تھے۔ قرآن میں بار بار آتا ہے کہ جب تم پر کوئی مشکل وقت آپڑتا ہے تو تم اپنی دیویوں اور من گھڑت معبودوں کو بھول جاتے ہو اور صرف اللہ کو پکارتے ہو۔ یہ دلیل آپ کو قرآن میں متعدد بار مل جائے گی۔ چنانچہ ابوجہل کی غزوۂ بدر کی رات کی دُعا منقول ہے : "اَللّٰھُمَّ اَقْطَعُنَا لِلرَّحِمِ وَاَتَانَا بِمَا لَا نَعْرِفُ فَاَحِنْهُ الْغَدَاة" یعنی "اے اللہ (محمدؐ) ہم میں سب سے زیادہ رحمی رشتے کاٹنے والا ہے' اور ایسی چیز لے آیا ہے جس سے ہم واقف ہی نہیں ہیں۔ پس کل تو اسے ہلاک کر دیجئو!" یہ اس شخص کی پکار ہے جس کی گھٹی میں قوم پرستی' نسل پرستی' قبائل پرستی پڑی ہوئی تھی۔ جناب محمد ﷺ کے خلاف قریش کا سب سے بڑا الزام یہی تھا کہ انہوںؐ نے آکر اپنی دعوت و تبلیغ کی بدولت ہمیں تقسیم کر دیا' ہماری اولاد کو ہم سے جدا کر دیا' بھائیوں کو ایک دوسرے سے کاٹ دیا' ہماری جو قوت تھی وہ اس طور پر پراگندہ ہو گئی' ہمارے رحمی رشتے محمدؐ نے منقطع کر دیئے۔

اور نضر بن حارث کی جو دُعا منقول ہوئی ہے اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کی شخصیتیں اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں اور جن کی سوچ اس قدر غلط ہو چکی تھی کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم محمدؐ (ﷺ) کے ساتھیوں سے بہتر

جماعت ہیں۔ اس کی دُعا منقول ہوئی ہے کہ : "اَللّٰھُمَّ انْصُرْ خَیْرَ الْحِزْبَیْنِ" یعنی یہ جو دو حزب بالمقابل آ گئے ہیں ' اے اللہ ! ان میں سے بہتر جماعت کی مدد فرمائیو! غور کیجئے اس مشکل گھڑی میں دونوں اَللّٰھُمَّ کہہ رہے ہیں۔

غزوۂ بدر کے موقع پر آنحضور ﷺ کی دُعا

دوسری طرف اسی رات کو حزب اللہ کے لشکر میں گھانس پھونس کی اس جھونپڑی میں جو آپؐ کے لئے بنائی گئی تھی ' رحمۃٌ لِلعالمین 'خاتم النّبیّین ' سید المرسلین جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے طویل ترین سجدہ کیا' جس میں طویل ترین دُعا کی۔ اس دُعا میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اے اللہ ! کل اگر یہ لوگ یہاں شہید ہو گئے تو پھر قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اور تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا' اب اس کو پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ حضور ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا؟ اس لئے کہ آپؐ آخری نبی اور رسول ہیں اور آپؐ کے بعد تا قیامِ قیامت کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔ حضور ﷺ نے بارگاہِ ربّ العزت میں مزید عرض کیا: بارِ الٰہا! میں نے اپنی پندرہ برس کی کمائی میدان میں لا کر ڈال دی ہے۔ اُس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تلوار لئے پہرے پر کھڑے تھے جس وقت حضورؐ سربسجود تھے۔[1] جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ الفاظ سنے تو انہوں نے عرض کیا : "حسبک حسبک یا رسول اللّٰہ" اے اللہ کے رسول! بس کیجئے' بس کیجئے' یقیناً اللہ آپؐ کی مدد فرمائے گا۔ اس پر حضور ﷺ نے سر مبارک اٹھایا اور زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے : ﴿ سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾ "گویا اللہ کی طرف سے خوشخبری تھی کہ "اس جمعیت کو شکست ہو

---

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آنجنابؓ کے فرزندگان میں سے کسی نے آپؓ سے پوچھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں سب سے زیادہ شجاع ' دلیر اور بہادر کون تھا؟ —— سوالی کا خیال تھا کہ آنجنابؓ اپنا نام لیں گے۔ لیکن حضرت علیؓ نے جواب دیا وہ شخص کہ جس کو نبی اکرم ﷺ نے غزوۂ بدر سے پہلے والی شب کو اپنی جھونپڑی پر پہرے کے لئے معین فرمایا تھا' یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ (مرتب)

کررہے گی اور یہ پیٹھ دکھا کر بھاگیں گے۔"

سیرت نبویؐ سے متعلق بعض اہم نکات

بہرحال اس غزوۂ بدر سے انقلاب نبویؐ کا چھٹا اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) شروع ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ Active Resistance کے مرحلہ میں اِقدام حضور ﷺ کی جانب سے ہوا۔ لیکن پہلی باقاعدہ جنگ جو ہوئی ہے وہ غزوۂ بدر ہے۔ اس معاملہ میں اس بحث میں پڑنے کی بجائے کہ جنگ کس نے شروع کی' کس نے نہیں کی' آیا اسلام میں صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے یا جارحانہ جنگ یعنی خود حملہ میں پہل کرنا بھی درست ہے' غور طلب بات یہ ہے کہ جناب محمد ﷺ باطل کا قلع قمع کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے یا باطل کو acknowledge اور تسلیم کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے؟ حق کبھی باطل کو تسلیم اور برداشت کر سکتا ہے؟ اس کی ایک ہی شکل ہو سکتی ہے کہ حق کے نام لیوا بے حمیت اور بے غیرت ہو گئے ہوں' ان کو زندگی زیادہ عزیز ہو گئی ہو تو وہ حق کو مغلوب دیکھ سکتے ہیں۔ ورنہ غیور' باحمیت' حق کے ماننے والے اور حق کے علمبردار' باطل کا وجود کبھی گوارا نہیں کر سکتے! حق کے پاس اگر طاقت ہو تو وہ یقیناً جارح ہو گا۔ صرف ایک فرق ذہن میں رکھیے۔ کسی فرد (individual) کو نہ کبھی پہلے اپنا دین بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے' نہ آئندہ کیا جائے گا۔ اس کے لئے قرآن حکیم کی نص موجود ہے :
﴿ لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ﴾ "دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہے۔ بیشک ہدایت کی راہ گمراہی سے جدا ہو کر روشن اور واضح ہو چکی ہے"۔ لیکن باطل کا غلبہ گوارا نہیں کیا جائے گا۔ ملک میں تشریعی نظام (Law of the Land) بہرصورت اللہ کا قائم و نافذ ہو گا : ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ﴾۔ اگر اہلِ حق میں کوئی غیرت و حمیت ہے تو وہ حق کا بول بالا کرنے' اسے غالب کرنے اور باطل کو مٹانے' اسے سرنگوں کرنے کی جدوجہد کے لئے تن' من' دھن سب کچھ لگا

دیں گے۔ اس راہ میں جان دینے اور سر کٹانے سے زیادہ دنیا میں ان کو کوئی شے محبوب نہیں ہوگی۔ اقبال نے بڑا پیارا شعر کہا ہے ؂

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

یعنی باطل تو یہ چاہے گا کہ یہ صورت برقرار رہے کہ دو متضاد فکری نظام پُرامن طریق پر پہلو بہ پہلو رہیں۔ اس لئے کہ اسے تو اس طرح اپنے وجود اور بقاء کی ضمانت (Lease of Existance) ملتی ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ حق و باطل کے مابین Peaceful co-existance خود باطل ہے۔ حق اسے کیسے گوارا کرلے گا؟ ــــ چنانچہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مکہ میں بھی تصادم کا آغاز جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا جب آپؐ نے یہ نعرہ لگایا : لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ــــ جس نے ان کے عقائد کی نفی، ان کے نظام کی نفی، ان کے رسم و رواج کی نفی، ان کے رذائل اخلاق کی نفی، ان کے معاشرتی نظام کی نفی، معاشرتی اونچ نیچ کی نفی، نسل پرستی کی نفی، آباء پرستی کی نفی، ہوائے نفس کی نفی کردی۔ یوں سمجھئے کہ اس کلمۂ توحید کی زد سے باطل نظریات کا کوئی پہلو اور گوشہ نہیں بچ سکتا، اور ہر چیز کی نفی اس کلمہ میں موجود ہے۔

ہجرت کے بعد کے اِقدامات بھی حضور اکرم ﷺ نے کئے۔ وادیٔ نخلہ جیسے دُور دراز مقام پر مہم بھیجی۔ ابوسفیان کا قافلہ جارہا تھا تب بھی اس میں خلل اندازی کرنے کے لئے حضورؐ بنفسِ نفیس ڈیڑھ سو مہاجرین کے ساتھ اس کے تعاقب میں نکلے۔ مولانا شبلی مرحوم نے لکھا ہے کہ ابوسفیان کا قافلہ جب واپس آرہا تھا تو ایسے ہی خبر اُڑ گئی کہ حضورؐ شاید اس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دو تین مہینے پہلے خود محمدؐ رسول اللہ ﷺ اس قافلے کو intercept کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ وہ تو ایک دن رات کا فصل پڑ گیا کہ قافلہ بچ کر نکل گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ شبلی مرحوم نے غزوۂ ذوالعشیرہ کا ذکر تک نہیں کیا اور واقعۂ نخلہ کے

بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہمارے سیرت نگاروں نے خواہ مخواہ ایسی باتیں لکھ دی ہیں ـــــ میرے نزدیک شبلی مرحوم ہمدردی کے لائق ہیں۔ اس لئے کہ ان کا دور انگریز کا دور تھا جب مستشرقین کی طرف سے اسلام پر پے بہ پے حملے ہو رہے تھے اور کہا جارہا تھا کہ ؎ "بُوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے!" لہٰذا انہوں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ وادیٔ نخلہ کا واقعہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے اور یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اِس واقعے نے مکّہ میں جوشِ انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی۔

فرار نہیں ہجرت!

ایک اور غلط فہمی بھی دُور ہو جانی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ مکّہ سے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ جان بچا کر نہیں بھاگے تھے۔ جس کسی کا بھی یہ تصور ہو وہ اس کی اصلاح کر لے۔ ہمارے کچھ تجدد پسند دانشور مستشرقین کی تحریروں سے متاثر ہو کر ایسا تصور رکھتے ہیں۔ یہ حضرات ہجرت کے واقعہ کا ذکر Flight to Madinah یعنی "مدینہ کی طرف فرار" کے الفاظ سے کرتے ہیں' وہ اسے ہجرت نہیں کہتے۔ ہجرت اور فرار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حضور ﷺ کے متعلق اس تصور کا ذرا سا شائبہ بھی کسی کے ذہن میں ہو تو وہ اسے کھرچ دے' ورنہ وہ اپنے ایمان کی خیر منائے۔ یہ بالکل ویسے ہے جیسے سورۃ الانفال میں آیا ہے کہ جنگ میں پیٹھ دکھا دینا بہت بڑا جرم اور نا قابلِ معافی گناہ ہے' سوائے اس کے کہ پینترا بدلنا ہو' یا یہ کہ پیچھے جو نفری ہے اس تک پہنچ کر پھر حملہ کرنا مقصود ہو۔ تو ہجرت درحقیقت باطل کے خلاف پینترا بدلنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک متبادل مرکز (Alternate Base) کی حیثیت سے پہلے طائف کا انتخاب کیا تھا' لیکن طائف والوں کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خوش قسمتی اور سعادت یثرب کے لئے رکھی تھی' چنانچہ اہلِ یثرب چل کر گئے اور جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اپنے یہاں آنے کی

دعوت دے آئے' بلکہ اس کی منظوری لے آئے۔ اب حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس گھڑی کی اجازت ملنے کا انتظار تھا جس گھڑی ہجرت کرنا تھی۔ جوں ہی اجازت آئی حضور ﷺ عازم ہجرت ہوئے اور سوئے یثرب کوچ فرمایا۔ لیکن حضور ﷺ یہاں کھجوروں کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام فرمانے نہیں آئے تھے' معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

ٹھنڈی چھاؤں سب کو پسند آتی ہے' لیکن حضور ﷺ تو غزوۂ بدر سے پہلے بنفسِ نفیس چار مہموں میں تشریف لے گئے۔ حضورؐ نے تو ٹھنڈی چھاؤں میں آرام نہیں کیا۔ ابتدائی چھ مہینے ایسے ضرور ہیں جس میں حضور ﷺ نہ خود کسی غزوہ کے لئے تشریف لے گئے نہ کوئی سریّہ بھیجا' لیکن یہ چھ ماہ حضور ﷺ نے داخلی استحکام میں صرف فرمائے۔ اقامتِ صلوٰۃ اور اجتماعاتِ مسلمین کے لئے مسجد نبویؐ کی تعمیر کی' انصار و مہاجرین میں مواخات قائم فرمائی اور آس پاس کے قبائل سے معاہدے کئے۔ ان کاموں کو سنبھالنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فوراً اِقدامات کا آغاز فرما دیا۔ تو یہ ہے اِقدام (Active Resistance) جس کا آغاز نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہوا' جس کے نتیجہ میں آخری اور چھٹے مرحلے یعنی مسلح تصادم کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ غزوۂ بدر اس کا آغاز ہے۔ یوم البدر ۱۷/ رمضان المبارک ۲ھ ہے۔

ابو جہل سے ایک بات اور بھی منسوب ہے کہ اس نے دعا کی تھی کہ "اے اللہ! اس جنگ کو یوم الفرقان بنا دے" اور اللہ تعالیٰ نے اس دن کو واقعتاً حق و باطل میں امتیاز کرنے والا دن بنا دیا اور سورۃ الانفال میں اس کو یوم الفرقان ہی قرار دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہجرت اور غزوۂ بدر ہی دین اللہ کے بالفعل غلبہ کی تمہید بنے۔

غزوۂ بدر کا معرکۂ کارزار

اس خبر کے بعد کہ ابو سفیان کا قافلہ خیر و عافیت سے مکّہ پہنچ گیا ہے' عتبہ بن ربیعہ نے حکیم بن حزام کی تجویز پر یہ کوشش کی تھی کہ جنگ ٹل جائے' اس پر ابو جہل نے اسے طعنہ دیا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو مدِمقابل دیکھ کر تمہاری ہمت جواب دے رہی ہے اور محبتِ پدری سے مغلوب ہو کر تم یہ تجویز لے کر آئے ہو کہ جنگ نہ ہو۔ یہ ایسا طعنہ تھا جو عتبہ کو گھائل کر گیا اور اس طرح صلح جُو لوگوں (Doves) کی جانب سے جنگ کو ٹالنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ چنانچہ اگلی صبح جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو لے کر نکلا اور مبارزت طلب کی۔ اہل ایمان کے لشکر سے تین انصاری صحابی رضی اللہ عنہم مقابلہ کے لئے نکلے۔ عتبہ نے چیخ کر پوچھا : "مَن اَنْتُم؟ مَنِ الْقَوْمُ؟" ـــــ انہوں نے اپنے نام بتائے۔ عتبہ نے کہا کہ تم ہمارے برابر کے نہیں ہو' ہم تم سے لڑنے نہیں آئے۔ پھر چیخ کر پکارا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری توہین نہ کرو' ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ ہمارے مقابلے کے لئے انہیں بھیجو جو ہمارے برابر کے ہیں' جو ہمارے مدمقابل ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر باپ کے مقابلہ میں بیٹا یعنی عتبہ کے مقابلے میں حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے نکلنا چاہا' لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روک دیا۔ پھر حضرت حمزہ' حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب' تین صحابی رضی اللہ عنہم مقابلہ کے لئے نکلے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شیبہ کو جلد ہی واصل جہنم کر دیا' لیکن حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا ولید بن عتبہ سے شدید مقابلہ ہوا۔ دونوں کا بیک وقت ایک دوسرے پر کاری وار ہوا۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کی ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ گر پڑے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے' ولید کو ختم کیا اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو جو جاں بلب تھے' اٹھا کر لے آئے۔ انہوں ؓ نے کہا مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لے چلو۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے متعلق فرمایئے۔ حضور

ﷺ نے فرمایا" تمہیں یقیناً جنت ملے گی" تو ان کے چہرہ پر بشاشت آئی اور ان کی زبان سے نکلا کاش! آج ابو طالب زندہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ میں نے ان کی بات سچ کر دکھائی ہے کہ اپنی جان حضورؐ پر نچھاور کر دی ہے۔ بات یہ تھی کہ جب مشرکینِ مکہ کا جناب ابو طالب پر شدید دباؤ پڑتا تھا کہ تم اور بنو ہاشم محمد (ﷺ) کی حمایت سے دست کش ہو جاؤ تاکہ ہم ان سے نمٹ لیں یعنی (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کو قتل کر دیں تو عام طور پر جناب ابو طالب اُس وقت ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ :

"تم محمد (ﷺ) پر اُس وقت تک قابو نہیں پا سکو گے جب تک ان کی حفاظت میں ہمارا بچہ بچہ کٹ نہ مرے گا۔"

حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا انتقال میدانِ بدر میں نہیں ہوا بلکہ فتح کے بعد جب اسلامی لشکر مدینہ منورہ واپس جا رہا تھا تو راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ ان کی قبر میدانِ بدر سے آگے مدینہ منورہ کے راستے میں ہے۔

بہرحال ۱۷/ رمضان المبارک ۲ھ میں میدانِ بدر میں باقاعدہ اور دُو بدو جنگ کی صورت میں اندرونِ عرب انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے چھٹے اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا آغاز ہو گیا۔ اس غزوہ میں قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے ابو سفیان اور ابو لہب کے علاوہ باقی قریباً تمام ہی کھیت رہے۔ واضح رہے کہ ابو سفیان چونکہ تجارتی قافلے کے ہمراہ تھے' لہٰذا وہ اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ابو لہب بھی جنگ میں شریک نہیں تھا اور اُس نے اپنی جگہ کرائے کا فوجی بھیج دیا تھا۔ قریش کے کُل ستّر سربر آوردہ لوگ مقتول ہوئے۔ ابو جہل مارا گیا۔ عتبہ بن ربیعہ' اس کا بھائی اور بیٹا قتل ہوئے۔ اسی طرح نضر بن حارث' اُمیّہ بن خلف' عتبہ بن اُبی معیط جیسے مشرکین جو نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے خون کے پیاسے تھے' گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیے گئے۔

سُنّتُ اللہ کا ظہور

غزوۂ بدر میں مٹھی بھر مسلمانوں کے ہاتھوں قریش کی شرمناک ہزیمت اور ان کے ستر(۷۰) سربرآوردہ لوگوں کا کھیت رہنا اصل میں یہ عذابِ الٰہی تھا۔ اللہ تعالیٰ کی سُنّت یہ رہی ہے کہ جب وہ کسی قوم یا ملک کی طرف کسی رسول کو بھیجتا اور وہ قوم انکار پر اس درجہ اَڑ جاتی تھی کہ رسول کی جان لینے کے درپے ہو جائے' یہاں تک کہ رسول کو وہاں سے ہجرت کرنی پڑے' تو رسول اور ان کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد اس قوم پر عذاب کا آنا لازم ہوتا تھا۔ رسول اور ان کے اصحاب کو بچالیا جاتا تھا اور پوری قوم ہلاک کردی جاتی تھی۔

البتہ عذابِ الٰہی کی صورتیں اور نوعیتیں مختلف رہی ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ پوری قوم کو ایک عظیم طوفان باد و باراں کے ذریعہ غرق کر دیا گیا۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ معاملہ ہوا اور کہیں ایسا ہوا کہ پوری کی پوری قوم کو ان کی بستیوں کے اندر ہی ختم کر دیا گیا جیسے قومِ لوط' قومِ عاد اور قومِ ثمود کی بستیاں : ﴿ تُدَمِّرُ كُلَّ شَیْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ﴾ کہیں ایسا ہوا کہ اہلِ تمرّد کو زمین میں دھنسا دیا گیا جیسے قارون کے ساتھ معاملہ ہوا' اور کہیں ایسا بھی ہوا کہ کفّار و مکذّبین کے سربرآوردہ اور چیدہ چیدہ لوگوں کو ان کی بستیوں سے باہر نکالا گیا اور ان کو عذابِ الٰہی نے ملیامیٹ کر دیا' جیسے آلِ فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکالا گیا اور ان کو سمندر میں غرق کر دیا گیا : سورۃ العنکبوت میں ان چاروں انواع کے عذاب کا ذکر بایں الفاظ فرمایا گیا ہے :

﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ... ﴾ (آیت ۴۰)

"آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی' اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا'

اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسادیا' اور کسی کو غرق کردیا...."

آلِ فرعون کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس سے ملتا جلتا معاملہ قریش مکّہ کے ساتھ کیا گیا۔ یہاں اسی سنت اللہ کا ظہور ہمیں صرف اس فرق کے ساتھ ملتا ہے کہ آلِ فرعون کو تو سمندر میں غرق کردیا گیا لیکن قریش کے جو نامی گرامی سردار نبی اکرم ﷺ کو ایذا پہنچاتے رہے تھے' جو حضور ﷺ کے خون کے پیاسے تھے' جو توحید کی انقلابی دعوت کے شدید مخالف تھے' ان سب کو میدانِ بدر میں کھینچ لایا گیا اور انہیں اہلِ ایمان کے ہاتھوں قتل کرا دیا گیا۔ اسی سُنّت اللہ کی جانب اشارہ سورۃ الانفال کی آیت ۱۷ کے آغاز میں ہے کہ ﴿ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ﴾ "(اے مسلمانو!) تم نے ان (مشرکینِ مکّہ) کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا ہے۔"

ابولہب میدان میں نہیں آیا تھا' لیکن عذابِ الٰہی سے وہ بھی نہ بچ سکا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے کچھ ہی دنوں بعد وہ مکّہ کے اندر ہی پلیگ جیسی کسی بیماری میں مبتلا ہو کر نہایت عبرت ناک موت سے دوچار ہوا۔ اس کا تمام جسم سڑ گیا تھا اور اس میں شدید تعفّن پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے اپنے قریبی رشتہ داروں نے بھی اس کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ اس کی نعش کو لکڑیوں سے دھکیل دھکیل کر ایک گڑھے میں دفن کردیا۔

پس دراصل غزوۂ بدر میں صنادید مشرکین کی ہلاکت اس سُنّت اللہ کے مطابق دُنیوی عذابِ الٰہی تھا جو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی تکذیب اور ان کو دیس سے نکلنے پر مجبور کرنے والے کفار و مکذبین کے لئے طے کر رکھا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تیرہ حضرات نے میدانِ بدر میں جامِ شہادت نوش فرمایا' اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ جو زخمی تھے' واپسی کے سفر میں اثنائے راہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے چودہ افراد نے اپنے رب کے حضور جان کا نذرانہ پیش کردیا' جبکہ کفار و مشرکین کے ستّر صنادید خاک و خون میں مبتلا ہو کر واصلِ جہنم ہوئے۔ مزید یہ کہ ستّر مشرکین کو اہلِ ایمان نے قید کر لیا۔

غزوۂ بدر کے اثرات

غزوۂ بدر کے نتیجہ میں پورے عرب میں' خاص طور پر بدر کے قریب کے علاقہ پر اہل ایمان کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور اس طرح اس غزوہ میں فتح و کامرانی کی بدولت دعوت توحید اور اسلامی تحریک کی انقلابی جدّوجُہد کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ پورے عرب میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ قریش کا کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا لشکر جناب محمد ﷺ کے تین سو تیرہ قریباً نہتے اور بے سرو سامان ساتھیوں سے شکست کھا گیا ــــــ یہ نفوسِ قدسی جنگ کے ارادے سے تو نکلے ہی نہیں تھے' یہ تو اولاً صرف ابوسفیان کے قافلہ کا راستہ روکنے کیلئے نکلے تھے۔ مدینہ سے روانگی کے وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک ہزار کے مسلح لشکر سے مڈبھیڑ ہو جائے گی ــــــ سیرتِ نبویؐ پر جناب محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ کے صاحبزادے شیخ عبداللہ کی تالیف "مختصر سیرۃ الرسول ﷺ" میں یہ واقعہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت صرف اس قافلہ پر یورش کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا جو مالِ تجارت لے کر شام سے واپس آ رہا تھا' لہٰذا کوئی نفیرِ عام نہیں تھی' کوئی اعلانِ جنگ نہیں تھا۔ قافلہ کے ساتھ محافظوں کی تعداد کا اندازہ کر کے حضور ﷺ مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ یہ تو مدینہ سے باہر نکل کر حضور ﷺ کو خبر ملی کہ قافلہ پر مسلمانوں کی یورش کے ارادہ کی خبر قریش کو مل چکی ہے اور قریش کا کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا لشکر مدینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

یہ خبر ملنے کے بعد حضور ﷺ نے مشورہ فرمایا کہ قافلہ کی طرف چلیں یا لشکر کی طرف! اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن حضرات نے قافلہ کی طرف چلنے کا مشورہ دیا تھا تو اصل میں ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم جنگ کیلئے تو تیار ہو کر نکلے ہی نہیں' نہ ہم نے اس اعتبار سے اپنی نفری بنائی ہے اور نہ ہی اس کیلئے ساز و سامان ساتھ لیا ہے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ غزوۂ ذوالعشیرہ میں ڈیڑھ سو مہاجرینؓ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے' جبکہ غزوۂ بدر کے موقع پر صرف تریسٹھ یا تراسی مہاجرینؓ حضور ﷺ کے

ہمراہ تھے۔ گویا مہاجرین کی نفری بھی پوری نہیں تھی۔ لہٰذا یہ رائے نہ تو بزدلی کی بنیاد پر تھی اور نہ منافقت کی بنیاد پر' بلکہ جو بھی احوال واسباب تھے ان کی بنیاد پر صحیح تھی کہ ہم اس ارادہ سے نہیں نکلے' لہٰذا قافلہ کی طرف چلنا بہتر اور مناسب ہوگا۔ لیکن حضور ﷺ کا منشا کچھ اور تھا۔ حضور ﷺ اللہ کی مشیت کے مطابق چاہتے تھے کہ فیصلہ ہو جائے: ﴿ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ﴾ "کہ جو مرے وہ دلیل کے ساتھ مرے اور جو جئے وہ دلیل کے ساتھ جئے۔"

اب عالمِ عرب میں جب یہ خبر پہنچی کہ قریش کی ایک ہزار کی جمعیت تین سو تیرہ مسلمانوں سے شکست کھا گئی اور غزوۂ بدر کے میدان میں ان کے ستّر بڑے بڑے سورما کھیت رہے تو عالمِ عرب میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ غزوۂ بدر میں سردارانِ قریش کے جسم اس طرح کٹ کر گرے ہوئے تھے جس طرح سورۃ الحاقہ میں قومِ عاد کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ﴿ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴾ یعنی مشرکینِ مکہ میدانِ بدر میں ایسے پڑے ہوئے تھے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے۔ ابو جہل میں ابھی جان باقی تھی جب نبی اکرم ﷺ نے پاس آکر اس کی گردن پر اپنا پاؤں مبارک رکھا اور فرمایا: ((هٰذَا فِرْعَوْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ)) "یہ شخص اِس اُمّت کا فرعون ہے۔" پس اس فتح سے اہلِ ایمان کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ایک طرف ان کا حوصلہ (Morale) بہت بلند ہوا تو دوسری طرف تمام عرب پر مسلمانوں کی ہیبت اور رُعب پڑ گیا۔ لہٰذا غزوۂ بدر کے بعد مسلمانوں کے تیرہ ماہ شادمانی اور مسرت کے گزرے اور اس دوران اسلام کی دعوت کے اثرات میں وسعت پیدا ہوئی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اب کچھ کچے اور ضعفِ ارادہ کے حامل لوگ بھی آکر مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ اس سے پہلے تک تو معاملہ یہ تھا کہ جو آتا تھا وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دعوتِ اسلام قبول کرنے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہو جائیں گی اور اسے کن کن خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اسے ہر لمحہ جان ہتھیلی پر رکھنی ہوگی' اس راہ میں مشکلات کے

پہاڑ آئیں گے' مصائب و شدائد سے سابقہ پیش آئے گا۔ لیکن بدر کی فتح سے جب صورت حال بدل گئی تو کچھ کچے اور ناپختہ لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اقول قولی ہذاواستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات OO

"نَحْنُ الَّذِیْنَ بایَعُوْا مُحَمَّداً
علی الجهادِ مابقینا ابَداً"

سابقہ گفتگو کا خلاصہ

غزوۂ اُحد

- قریش کی پیش قدمی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشاورت
- اُحد کی جانب کوچ اور منافقین کا طرزِ عمل
- اللہ کے وعدے کی صداقت اور فوری فتح
- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی حکمتِ عملی اور ماہرانہ پیش بندی
- چند صحابہؓ کی غلطی
- صورتِ حال بدل گئی
- نعروں کا تبادلہ
- اسلام کا نظمِ جماعت
- حکم عدولی کی سزا
- شکست کے اسباب
- اللہ کی طرف سے تسلی وتشفی

غزوۂ احزاب

- یلغار کا نقشہ
- اہلِ ایمان کی کیفیات
- دو اشعار
- حضورؐ کا تاریخی ارشاد
- عمرہ کی تیاری
- منافقین کی کیفیت
- ایک عجیب نقشہ
- نصرتِ الٰہی
- حضورؐ کا اہم اقدام
- مکہ کی طرف کوچ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزوۂ اُحد

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیاتِ قرآنی' احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

غزوۂ بدر رمضان المبارک ۲ھ میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ تیرہ ماہ بعد شوال ۳ھ میں مشرکین مکّہ کے ایک لشکرِ جرّار نے مدینہ پر چڑھائی کر دی جو جوشِ انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت ان کے سینوں میں انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جن حضرات کو قبائلی زندگی کا کچھ تجربہ ہے اور جنہیں عرب کے انتقامی جذبات و احساسات سے کچھ واقفیت ہو اور جنہوں نے ان کی اس دور کی شاعری اور خطبات پڑھے ہوں وہ کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت ان کی زندگی کس طور پر اجیرن ہو گئی تھی۔ مکّہ والوں نے غزوۂ بدر کے بعد ایک دن بھی چین اور آرام سے نہیں گزارا۔ انتقامی جذبات لاوے کی طرح ہر دل میں کھول رہے تھے۔ ابو سفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک مقتولینِ بدر کا انتقام نہیں لے لیا جائے گا نہ خوشبو لگاؤں گا نہ چارپائی پر سوؤں گا۔ اسی طرح اس ایک سال کے دوران ہندہ کا جو حال رہا ہے وہ بھی ناقابلِ تصور ہے' جس کا باپ مارا گیا' چچا مارا گیا' بھائی مقتول ہوا۔ یہ ہندہ ابو سفیان کی بیوی' عتبہ کی بیٹی اور حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ' جو سابقون الاولون میں سے ہیں' کی بہن ہیں۔ ہندہ بھی فتح مکّہ کے موقع پر ایمان لے آئی تھیں اور مؤمنہ صادقہ ثابت ہوئیں۔

قریش کی پیش قدمی اور حضور ﷺ کی مشاورت

بہرحال اب جو لشکر مدینہ پر چڑھ دوڑا تھا وہ تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔

قریش اپنی اور اپنے حلیفوں کی جو ممکنہ قوت اور طاقت جمع کر کے لاسکتے تھے وہ لے کر میدان میں آ گئے۔ اس موقع پر بھی نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک مشاورت منعقد فرمائی کہ اس موقع پر کیا حکمتِ عملی اختیار کیا جائے' جبکہ تین ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کرنے آ رہا ہے۔

حضور ﷺ کی ذاتی رائے تھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عجیب اتفاق ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی کی رائے بھی یہی تھی۔ آخر جھوٹا انسان ہر موقع پر تو جھوٹ نہیں بولتا' کبھی وہ سچ بھی بولتا ہے۔ عبداللہ بن ابی مدینہ کا رہنے والا تھا' لہٰذا وہ اپنے حالات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس طرح کی صورت حال میں مدینہ والے محصور ہو کر مدافعت کیا کرتے تھے تاکہ مَرد گلیوں میں دُو بدو لڑیں اور عورتیں اوپر سے دشمن پر پتھراؤ کریں۔ اس طرح گویا کہ ان کی دوہری طاقت روبکار آجاتی تھی۔ چنانچہ انہی مصلحتوں کے پیش نظر عبداللہ بن ابی کی رائے بھی یہ تھی کہ ہمیں کھلے میدان میں جنگ کرنے کی بجائے محصور ہو کر اپنی مدافعت کرنی چاہئے۔ بعض قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا رجحان بھی یہی تھا۔

لیکن ایک تو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض حضرات کھلے میدان میں جنگ کرنے کے حامی تھے' جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا بھی نام شامل ہے —— اب یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے تھا کہ اسی جبلِ اُحد کے دامن میں ان کی شہادت ہونی ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے خصوصی جوش و خروش کا مظاہرہ ہو رہا تھا کہ ہمیں محصور ہو کر نہیں بلکہ مردانہ وار دُوبدو جنگ کرنی چاہئے' ہمیں تو شہادت درکار ہے —— دوسرے یہ کہ نوجوانوں کی طرف سے بھی یہی مطالبہ تھا' خاص طور پر ان حضرات کی طرف سے جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے' کیونکہ غزوۂ بدر کے موقع پر نفیرِ عام تو تھی ہی نہیں۔ اُس وقت نبی اکرم ﷺ اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم جو نکلے تھے وہ جنگ کے ارادے سے تو نکلے ہی نہیں تھے۔ تو اندازہ کیجئے کہ جو لوگ اس غزوہ میں شریک ہونے سے رہ گئے تھے ان کے سینوں میں کتنی حسرت ہو گی کہ وہ کتنی بڑی سعادت

سے محروم رہ گئے۔ لہٰذا ان کا جوش و خروش بھی دیدنی تھا کہ کھلے میدان میں جا کر جنگ کرنی چاہئے۔ پھر اس تیرہ ماہ کے عرصہ میں جو لوگ ایمان لائے تھے' ان کے ذہنوں میں ہو سکتا ہے یہ بات ہو کہ جب تین سو تیرہ اہلِ ایمان نے بدر میں اتنی بڑی فتح حاصل کی ہے تو اللہ کی مدد آخر یہاں بھی تو ہمارے شامل حال ہو گی' لہٰذا فتح تو ہمیں ہونی ہی ہونی ہے' ہم اپنے دامن پر یہ داغ کیوں گوارا کریں کہ ہم نے مَردوں کی طرح کھلے میدان میں جا کر جنگ نہیں کی۔ پس یہ مختلف اسباب تھے جن کی وجہ سے محسوس ہوا کہ زیادہ لوگوں کی خواہش ہے کہ کھلے میدان میں جنگ ہو۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور اپنے ساتھیوں کی رائے کے مطابق فیصلہ فرما دیا کہ کھلے میدان ہی میں مقابلہ کیا جائے گا۔ اس طرح جماعتی زندگی کا ایک اہم اصول سامنے آگیا۔ مشورہ اور اس کی اہمیت سامنے آ گئی۔ اگرچہ اسلامی نظم جماعت میں فیصلہ کا آخری اختیار امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے' وہ اکثریت کی رائے کا پابند نہیں ہوتا' لیکن تدبیر کے معاملہ میں اپنے ساتھیوں کی دلجوئی کے لئے اور ان کے اندر ایک باہمی اعتماد کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے امیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بعض مواقع پر اپنے ساتھیوں کا احترام کرتے ہوئے ان کی رائے کے مطابق فیصلہ دے' جیسا کہ حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے سامنے آتا ہے۔ البتہ یہ طرزِ عمل صرف تدبیر کے معاملہ میں اختیار کیا جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ نص میں' یعنی ایسے معاملے میں جہاں اللہ اور اس کے رسول کا صریح حکم موجود ہو یہ طرزِ عمل ہرگز اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ تدبیر کے معاملہ میں بھی یہ بات ذہن نشین رکھنی ہو گی کہ گو تدبیر ہماری ہے لیکن مآلِ کار تمام معاملات کا اختیار تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے' جو وہ چاہے گا نتیجہ اس کے مطابق ظاہر ہو گا۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کی اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے فیصلہ فرما دیا کہ کھلے میدان میں جنگ ہو گی۔ اس کے بعد غیر معمولی واقعہ یہ ہوا کہ نبی اکرم ﷺ اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے۔ جب آپ باہر تشریف

لائے تو آپؐ نے زرہ زیب تن فرمائی ہوئی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ماتھا ٹھنکا ـــــ قبل ازیں حضور ﷺ نے خواب بھی دیکھا تھا کہ ایک گائے ذبح ہوئی ہے' اور بھی چند باتیں خواب میں ایسی دیکھی تھیں جن کی بنا پر حضور ﷺ کو اندازہ تھا کہ میدانِ اُحد میں چند غیر معمولی اور ناخوشگوار واقعات ظہور پذیر ہوں گے۔ حضور ﷺ کو زرہ پہنے دیکھ کر لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں' آپؐ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کیجئے اور انتظام فرمائیے۔ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں' یہ فیصلہ برقرار رہے گا۔ نبی کو یہ زیبا نہیں ہے کہ ہتھیار باندھنے کے بعد بغیر جنگ کئے انہیں اتار دے۔

قریباً یہی بات سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں فرمائی گئی ہے جو گویا حضور ﷺ کے اس طرزِ عمل کی توثیق میں نازل ہوئی ـــــ یہ بات متفق علیہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران کا بیشتر حصہ غزوۂ اُحد کے بعد نازل ہوا ہے ـــــ محولہ بالا آیت میں بالکل وہی نقشہ ہے جس پر حضور ﷺ نے عمل فرمایا تھا۔ گویا جو کام نبی اکرم ﷺ نے اپنے ذاتی اجتہاد سے کئے' بعد میں اللہ کی طرف سے قرآن مجید میں ان کی توثیق آ گئی ـــــ وہ آیتِ مبارکہ یہ ہے کہ : ﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ "(اے نبیؐ!) یہ اللہ تعالیٰ کا آپؐ پر بڑا فضل و کرم اور بڑی رحمت ہے کہ آپؐ اپنے ان ساتھیوں کے حق میں بڑے نرم ہیں (جو ان کی دلجوئی فرماتے ہیں)۔ اگر آپؐ کہیں سخت دل اور تُند خُو ہوتے تو یہ لوگ منتشر ہو گئے ہوتے (آپ کے پاس سے چھٹ گئے ہوتے)"۔ اقبال نے اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے ایک شعر میں سمو دیا ہے کہ ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

یہ خوئے دلنوازی جناب محمد رسول اللہ ﷺ میں بتمام و کمال موجود تھی۔ یہی بات اللہ

تعالیٰ نے اس اسلوب سے فرمائی : ﴿ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ ﴾ "پس آپ ان کی خطاؤں سے درگزر کیجئے' ان کے لئے استغفار بھی کرتے رہا کیجئے اور ان سے معاملات میں مشورہ بھی لیجئے"۔ ﴿ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ﴾ "پس جب آپ فیصلہ کرلیں تو پھر اللہ پر توکّل کیجئے"۔ یعنی پھر فیصلے کا بار بار بدلنا درست نہیں۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے ان عظیم ترین الفاظ مبارکہ پر : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ ○ ﴾ "بلاشبہ اللہ توکّل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔ جن کو اللہ محبوب قرار دے ان سے خوش بخت و خوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے!

اُحد کی جانب کوچ اور منافقین کا طرزِ عمل

نبی اکرم ﷺ نے ایک ہزار کی نفری لے کر مدینہ سے جبل اُحد کی جانب کوچ فرمایا' لیکن راستے ہی میں عبداللہ بن اُبی تین سو افراد کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ واپس لے کر چلا گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا اور ہماری بات نہیں مانی جاتی تو ہم ساتھ کیوں دیں اور اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالیں؟ اب آپ اندازہ کیجئے کہ مدنی دَور کے قریباً اڑھائی سال کے اندر اندر جنگ کے قابل مسلمانوں کی کُل نفری کا لگ بھگ ایک تہائی حصّہ منافقین پر مشتمل ہو چکا تھا۔ معاملہ کی نزاکت کا اندازہ کیجئے کہ جو تین سو واپس چلے گئے ان کے منافق ہونے میں تو کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ جو سات سو افراد باقی رہ گئے تھے' ان میں کمزور اور ضعیف ایمان والے بھی تھے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ دامن اُحد میں پہنچ کر مدینہ کے دو خاندانوں کے افراد نے کم ہمتی کے باعث واپس لوٹنا چاہا ـــــ سورۂ آل عمران میں اس کا ذکر بھی موجود ہے : ﴿ اِذۡ هَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ مِنۡكُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ﴾ "یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ ڈھیلے پڑ گئے تھے (کمزوری دکھانے والے تھے) حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا"۔ وہ ان کا پشت پناہ تھا' اس نے ان کو سنبھال لیا اور وہ میدان میں ڈٹے رہے ـــــ چنانچہ یہ دونوں گروہ بعد میں کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو

"مِنکُمْ" قرار دیا ہے۔ یعنی اُمّتِ مُحمّدیہ علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام ہی میں شامل قرار دیا ہے اور اپنی ذات سبحانہ کو ہمارا ولی' دوست اور پشت پناہ فرمایا ہے ـــــ البتہ اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ ان دو گروہوں میں کمزوری پیدا ہوئی تھی اور ان کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ لیکن وہ تھے بہرحال اصحابِ ایمان! جب ہی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سنبھال لیا۔ لیکن جو مُحمّدٌ رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر راستہ ہی سے عبداللہ بن اُبی کے ساتھ واپس مدینہ چلے گئے' ظاہر ہے ان کے نفاق میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ گویا ایک ہزار میں سے تین سو کی نفری منافقین پر مشتمل تھی۔

فوری فتح

بہرحال جنگ شروع ہوئی اور پہلے ہی ہلے میں اللہ کی مدد و نصرت آئی اور بالکل بدر کا سا نقشہ سامنے آگیا۔ کہاں وہ تین ہزار کا لشکر اور کہاں یہ سات سو افراد! قریش کے ساتھ دو سو گھوڑوں کا رسالہ تھا۔ عرب کے اس دور کے حالات کے اعتبار سے یہ بہت بڑی بات تھی۔ واضح رہے کہ میدانِ بدر میں ان کے پاس سو گھوڑے جبکہ اور اہل ایمان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے' ایک حضرت مقداد بن الاسود اور ایک حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہما کے پاس۔ اسی طرح قریش کے ساتھ سات سو اونٹ تھے جبکہ نبی اکرم ﷺ کے لشکر کے ساتھ ستر تھے۔ اسی کے متعلق حفیظ جالندھری نے شاہنامۂ اسلام کی ایک نظم "بدر کی فریاد" میں بڑے پیارے انداز میں نقشہ کھینچا ہے :

یہ ستّر اُونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے' نہاتے غسل فرماتے

نبی اکرم ﷺ کی جنگی حکمتِ عملی

اُحد میں قریش کی جو فوج آئی تھی ان کے ساتھ دو سو گھڑ سواروں کا دستہ تھا اور ان پر خالد بن ولید بن مغیرہ سپہ سالار تھے ـــــ نبی اکرم ﷺ نے اُحد پہاڑ کو اپنی

پشت پر رکھااور اس کے دامن میں صفیں بنوائیں۔ سامنے مشرکین تھے۔ جبلِ اُحد کے ساتھ ایک دَرہ ایسا تھا کہ اُحد کے پیچھے سے چکر لگا کر اس دَرہ سے گزر کر مسلمانوں کے لشکر پر حملہ ہو سکتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں اِدھر سے حملہ نہ ہو جائے اور کہیں ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپے جانے والا معاملہ نہ ہو جائے' اس دَرہ پر پچاس تیر اندازوں کو حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں تعینات فرمایا۔ حضور ﷺ نے نہایت تاکیدی اسلوب سے فرمایا کہ تم لوگوں کو یہاں سے نہیں ہلنا۔ اگر ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم یہ دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم لوگ یہاں سے نہ ہٹنا۔ آپ اس تاکید اور شدت کا اندازہ کیجئے جو اس حکم میں نظر آتی ہے۔

ایک خوفناک غلطی

بہرحال جنگ ہوئی تو پہلے ہلے ہی میں مشرکین کے قدم اکھڑ گئے اور مسلمانوں نے ان کا پیچھا شروع کیا۔ چند کفار کا تعاقب کر رہے تھے اور چند مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے تھے۔ ادھر جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دَرہ پر تعینات تھے ان میں اختلاف رائے ہو گیا۔ ان پچاس تیر اندازوں میں سے اکثر نے کہا کہ چلو ہم بھی چلیں' مالِ غنیمت جمع کریں' اب تو فتح ہو گئی ہے۔ ان کے کمانڈر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہرگز نہیں' حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہاں سے نہ ہلنا' لہٰذا میں کسی کو اجازت نہیں دیتا"۔ لیکن ہوا یہ کہ اکثر نے اپنے کمانڈر کی بات نہ مانی اور اس دَرے کو چھوڑ کر مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسی غلطی کے باعث فتح شکست میں بدل گئی۔

یہاں یہ سمجھ لیجئے کہ اس غلطی کی نوعیت کیا تھی۔ ان حضرات نے جو دَرے کو چھوڑ گئے اپنے نزدیک غالباً یہ تاویل کی ہو گی کہ حضور ﷺ نے تو شکست کی صورت میں اتنا زور دیا تھا کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم دیکھو کہ پرندے ہماری

بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے مت ہٹنا۔ اب تو فتح ہو گئی ہے' لہٰذا اب یہاں سے ہلنے میں کیا ہرج ہے۔ درہ میں متعین سب کے سب مومنین صادقین تھے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے غلطی خلوص سے بھی ہو جاتی ہے' نیک نیتی سے بھی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا میری تعبیر یہ ہے کہ ان سے تاویل میں غلطی ہوئی ہو گی۔ واللہ اعلم!

نظم کی اہمیت

درّہ چھوڑ کر چلے جانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اصل غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اپنے مقامی امیر کی حکم عدولی کی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ جو اس دستہ کا امیر ہے وہ تو اجازت نہیں دے رہا۔ چلئے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے حکم کی تاویل کر لی۔ لیکن یہاں ان کے اور حضور ﷺ کے مابین ایک لوکل کمانڈر موجود ہے جس کو محمد رسول اللہ ﷺ نے امیر مقرر فرمایا ہے ـــــ اس امیر کی تو نافرمانی ہو گئی! ڈسپلن تو بہرحال ٹوٹ گیا! نظم کی اہمیت کے بارے میں بیعت عقبہ ثانیہ کے وہ الفاظ یاد کیجئے جو حضرت عبادہ بن الصّامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ اپنی اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ سند کے اعتبار سے حدیث کے صحیح ہونے کا اس سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے۔ حدیث یہ ہے :

((عَنْ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِت رضی اللہ عنہ قَالَ بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِى الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ' وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا' وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ ' وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا' لَانَخَافُ فِى اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ))

"حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی کہ ہم حکم سنیں گے اور مانیں گے' خواہ مشکل ہو خواہ آسان' خواہ ہماری طبیعت کو خوش گوار لگے خواہ ناگوار ہو' خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے۔ اور جس کو بھی ہم پر امیر بنا دیا جائے

گا ہم اس سے جھگڑیں گے نہیں' اور ہم حق بات کہتے رہیں گے جہاں کہیں
بھی ہوں اور اللہ کے معاملہ میں (حق کہنے سے) کسی ملامت گر کی ملامت سے
ہرگز نہیں ڈریں گے۔"

ظاہر بات ہے کہ نبی ﷺ ہر جگہ بنفسِ نفیس تو موجود نہیں ہو سکتے تھے۔ آپؐ کسی مہم پر کسی لشکر کو بھیجتے تھے تو اس کا ایک کمانڈر یا امیر مقرر فرما دیتے۔ اب وہ امیر نبی اکرم ﷺ کا قائم مقام ہے' اور معروف میں سمع و طاعت کے اعتبار سے اس کا حکم بالکل اسی طرح مانا جائے گا جیسے نبی اکرم ﷺ کا حکم مانا جائے گا۔ یہی Army Discipline ہے۔ اس کے لئے حضورؐ کی ہدایت بایں الفاظ موجود ہے :

((مَنْ اَطَاعَنِی فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ' وَمَنْ عَصَانِی فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ'
وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِی فَقَدْ اَطَاعَنِی وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِی فَقَدْ
عَصَانِی))

اور بعض احادیث میں "امیری" کی جگہ "الامیر" کا لفظ ہے۔ یعنی :

((وَمَنْ یُّطِعِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِی وَمَنْ یَّعْصِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ
عَصَانِی)) (بخاری و مسلم)

"جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری
نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے میرے معین کردہ امیر کا کہا
مانا' اس نے میرا کہا مانا اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری
نافرمانی کی"۔

اسلام کا نظمِ جماعت

اسلامی جماعت کا نظم ملاحظہ ہو کہ پچاس کی نفری میں سے کمانڈر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا اور ایسے چودہ حضرات مزید بھی تھے جنہوں نے اپنے کمانڈر کے حکم کے مطابق جگہ نہیں چھوڑی' لیکن پینتیس افراد وہاں سے چلے گئے۔ سات سو کی نفری میں پینتیس پانچ فی صد ہوتے ہیں' لیکن پانچ فی صد اشخاص کی یہ غلطی جس کو آپ

indiscipline کہیں گے ‘یعنی نظم کو توڑا گیا‘ اس کی کتنی بڑی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اس سے نظم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ یہ امت ناقہ بے زمام بن گئی ہے‘ سمع و طاعت کا نظام کہیں قائم نہیں ہے۔ اور جب نظام ہی نہ ہو تو امت سمع و طاعت اور نظم کی خوگر بنے تو کیسے بنے! ہر شخص انانیت کا شکار ہے! کوئی دوسرے کو امیر مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرے! یہ جذبہ سرد پڑ چکا ہے۔

آج ہماری اُمّتِ مسلمہ میں انتشار کی جو انتہا ہے ذرا اس کو سامنے رکھئے اور یہ واقعہ نوٹ کیجئے۔ کیا (معاذ اللہ) اس میں حضور ﷺ کی کوئی غلطی تھی؟ ہرگز نہیں! صرف پینتیس صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ کے ایک حکم کی غلط تاویل کر لی تھی‘ لیکن اپنے کمانڈر کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے یقیناً ڈسپلن توڑ دیا تھا۔ نظم کی خلاف ورزی کی تھی اور موجود الوقت امیر کی نافرمانی کی تھی ـــــ اس کی سزا کیا ملی! یہ کہ خالد بن ولید جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے ان کی عقابی نگاہ نے تاڑ لیا کہ وہ دَرہ خالی ہے۔ اصل جنگ تو پیدل فوج (Infantry) کی ہوتی تھی‘ وہ مار کھا چکی تھی۔ بھگدڑ مچ چکی تھی۔ اب انہوں نے اُحد کی پشت کا چکر کاٹا اور دو سو گھڑ سواروں کا دستہ لے کر اس درہ سے مسلمانوں کی پیٹھ سے جو حملہ آور ہوئے تو یکلخت جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ درہ پر صرف پندرہ تیر انداز رہ گئے تھے‘ ان کے لئے دو سو گھڑ سواروں کو اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے یا تلواروں سے روکنا ممکن نہیں تھا۔ پچاس کی نفری برقرار رہتی تو خالد بن ولید کا اپنے دستہ کے ساتھ درہ کو کراس کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہاں پندرہ کے پندرہ اصحاب رسولؐ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم!

صورتِ حال کی تبدیلی

خالد بن ولید کے اس عقبی حملہ نے مسلمانوں کو سراسیمہ کر دیا۔ ان کی صفیں تو پہلے ہی درہم برہم تھیں‘ کچھ لوگ کفّار کا پیچھا کر رہے تھے اور اکثر مالِ غنیمت اکٹھا کر

رہے تھے۔ بھاگنے والے کُفّار نے جب خالد بن ولید اور ان کے دستہ کے لوگوں کے نعرے سنے تو انہوں نے پلٹ کر زوردار حملہ کر دیا۔ اب مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گئے اور فتح شکست سے بدل گئی۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۲ میں اس صورتِ حال پر تبصرہ موجود ہے :

﴿ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ﴾

" (مسلمانو! تم اپنی شکست کا اللہ کو کوئی الزام نہیں دے سکتے) اللہ نے تو (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ پورا کر دکھایا تھا' جبکہ (ابتداء میں) تم اس کے حکم سے اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ مگر جب تم ڈھیلے پڑے (تم نے کمزوری دکھائی) اور تم نے معاملہ میں اختلاف کیا' اور تم (اپنے امیر کی) حکم عدولی کر بیٹھے' بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی (یعنی فتح) جو تمہیں محبوب تھی ـــــ اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا' کیونکہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ "

دَرّے پر متعین تیر اندازوں نے اپنے مقامی امیر کی جو حکم عدولی کی تھی تو یہ اصل میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی تھی' کیونکہ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کے دستہ پر امیر اور کمانڈر مقرر کیا تھا۔ لہٰذا نظم کے اعتبار سے کمانڈر کی نافرمانی خود حضورؐ کی نافرمانی ہو گئی۔ بعض مفسرین نے "مَاتُحِبُّوْنَ" سے

مراد مالِ غنیمت کی چاہت لی ہے اور بعض نے سورۃ الصّف کی آیت ۱۳ کے اس حصہ سے کہ : ﴿ وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ﴾ استدلال کرتے ہوئے وہ فتح مراد لی ہے جو پہلے ہلے میں اہل ایمان کے لشکر کو حاصل ہو گئی تھی۔ میں اس آخر الذکر رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔

حکم عدولی کی سزا

غزوۂ اُحد کی فتح کا شکست میں بدلنا درحقیقت فشل ' تنازع فی الامر اور معصیت امیر کے جرم کی پاداش میں اللہ کی طرف سے سزا تھی۔ تصور کیجئے کہ سزا کتنی کڑی تھی کہ سات سو میں سے ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ یعنی دس فیصد نفری شہید ہو گئی ' حالانکہ خطاء صرف پانچ فی صد کی تھی۔ پھر شہداء میں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسے کیسے جان نثار اور کیسے کیسے ہیرے اور موتی تھے جو کیسی کیسی محنت سے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کئے تھے۔ ان ہی میں اَسَدُ اللّٰهِ وَاَسَدُ رَسُوْلِهٖ حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ ہیں ' ان ہی میں الْمُقْرِی یعنی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں کہ جن کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم قرآنی سے مدینہ منورہ میں اسلامی انقلاب آیا اور اوس و خزرج کے قبیلوں کے اکثر لوگ دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔ مہاجرین وانصار میں سے اڑسٹھ (۶۸) دوسرے مجاہدین فی سبیل اللہ اور جان نثارانِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے جامِ شہادت نوش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی مجروح ہوئے ' دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ خود کی دو کڑیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک میں اس طور سے گھس گئیں کہ نکالنے کے لئے زور لگایا تو نہیں نکلیں۔ پھر دوسرے اصحابؓ نے بمشکل ان کو نکالا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی بھی طاری ہوئی۔ کفار نے ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نرغے میں لے لیا اور تیروں کی بارش برسائی۔ جان نثاروں نے اپنے جسموں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بنایا کہ جو تیر آئیں وہ ہمارے سینوں میں ترازو ہوں ' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک تک نہ پہنچیں۔ حضرت سعد بن ابی وقّاص رضی اللہ عنہ

بڑے ماہر تیر انداز تھے۔ حضور ﷺ ان کو تیر دیتے اور فرماتے جاتے "سعد تم پر میرے ماں باپ قربان' تیر چلاتے جاؤ" ـــــ صرف حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہی وہ خوش بخت صحابی ہیں جن کے لئے حضور ﷺ نے یہ محبت بھرا کلمہ ارشاد فرمایا۔

الغرض مسلمانوں کو بڑی واضح شکست ہوئی۔ افراتفری پھیلی۔ نبی اکرم ﷺ کی شہادت کی افواہ پھیل گئی۔ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ بہرحال ان حالات میں سیرت نگاروں کے سامنے ایک عجیب سا سوال اور مسئلہ آتا ہے کہ اس صورت حال میں قریش واپس کیوں چلے گئے! ایک حدیث شریف کے مطابق انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے مابین ہوتا ہے' وہ اسے جس طرف چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ اس نے قریش کے دل پھیر دیئے۔ ورنہ وہ اس پوزیشن میں آگئے تھے کہ اُحد میں موجود تمام مسلمانوں کا صفایا کر دیتے۔ بہرحال بعض ذرائع سے اس کی یہ توجیہہ ملتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے تھے۔ اگرچہ خالد بن ولید رئیس لشکر ابوسفیان سے اصرار کر رہے تھے کہ ہمیں پہاڑ پر چڑھ کر اس معاملہ کو ختم کر دینا چاہئے' اس قضیہ کو ہمیشہ کے لئے چکا دینا چاہئے' لیکن ابوسفیان بڑے حقیقت پسند' زیرک اور حالات کا بہت صحیح صحیح جائزہ لینے اور ان پر نظر رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ نہیں' اس لئے کہ مسلمان بلندی پر ہیں' وہاں سے تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ ہو گی تو ہمارا بہت جانی نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہرحال ہم نے بدلہ لے لیا ہے' یہی بہت ہے۔

نعروں کا تبادلہ

ابوسفیان نے دامن کوہ سے نعرہ لگایا کہ محمد (ﷺ) زندہ ہیں یا فوت ہو گئے؟ حضورؐ خاموش رہے۔ اِدھر سے تین بار اسی نعرے کی تکرار ہوئی۔ تیسرے نعرے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا' انہوں نے نعرہ کا جواب نعرہ سے دیا کہ "اے دشمنِ خدا! رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں"۔ پھر ابوسفیان نے کہا : "دیکھو یہ یومِ بدر کا

بدلہ ہے جو آج ہم نے چکالیا"۔ حضرت عمرؓ نے جواباً کہا: "تمہارے مقتول جہنّم میں ہیں جبکہ ہمارے شہداء جنّت میں ہیں"۔ ابو سفیان نے پھر نعرہ لگایا "اعلٰی هُبَل"۔ اس موقع پر ہمیں یہ ملتا ہے کہ مشرکین نے کسی بُت کا نعرہ لگایا۔ یہ دراصل خوشی کا موقع تھا۔ ورنہ جب مشکل کا وقت ہوتا تھا تو مشرکین بھی صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے۔ یہاں تو انہیں فتح ہو گئی تھی اسی لئے ابو سفیان نے نعرہ لگایا "اعلٰی هُبَل"۔ حضور ﷺ نے فرمایا جواب دو: "اَللّٰهُ اَعَزُّ وَ اَجَلُّ" مسلمانوں نے اِدھر سے یہ نعرہ بلند کیا۔ اُدھر سے ابو سفیان پھر پکارا "لَنَا عُزّٰی وَ لَا عُزّٰی لَکُمْ" (ہمارے لئے تو عُزّٰی ہے جس کا سایہ ہمارے سروں پر ہے' تمہارے لئے کوئی دیوی نہیں ہے)۔ حضور ﷺ نے فرمایا جواب دو "اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَ لَا مَوْلٰی لَکُمْ" (اللہ ہمارا مولا ہے' ہمارا پشت پناہ اور مددگار ہے' تمہارا کوئی مولا نہیں)۔ پھر ابو سفیان یہ کہہ کر اپنے لشکر کو ساتھ لے کر واپس ہو گئے کہ "اگلے سال یہیں پھر مقابلہ کے لئے ملاقات ہو گی"!

غزوۂ اُحد کی شکست کے اثرات

غزوۂ اُحد کے بعد کے دو سال نبی اکرم ﷺ اور اہل ایمان کے لئے نہایت پریشان کُن اور تکلیف دِہ رہے ہیں۔ اس لئے کہ اہل عرب پر مسلمانوں کے رعب' ہیبت اور دھاک کی جو فضا بن گئی تھی وہ بہت حد تک ختم ہو گئی۔ اب عین مدینہ کے قریب آکر قریش جو اتنا بڑا چرکہ لگا گئے تو اس سے ایک تو مسلمانوں کے دل زخمی تھے۔ ان کا حوصلہ (morale) اب اتنا اونچا نہیں رہا جتنا غزوۂ بدر کے بعد ہو گیا تھا۔ دوسرے گرد و پیش کے مشرکین کے قبائل پر مسلمانوں کی جو دھاک بیٹھ گئی تھی وہ باقی نہیں رہی' بلکہ وہ اسلامی انقلاب کی دعوت و تحریک کے مقابلہ میں دلیر ہو گئے اور ان کی طرف سے مخالفت و مزاحمت کے اندیشے پیدا ہو گئے۔

اللہ کی طرف سے تسلّی و تشفّی

ان تمام ناموافق و ناسازگار حالات میں اہل ایمان کی تسلی کے لئے فرمایا گیا :

﴿ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ﴾ مسلمانو! کیوں دل شکستہ ہوتے ہو، اگر تمہیں چرکہ اور زخم لگا ہے تو تمہارے دشمنوں کو بھی ایسا ہی چرکہ اور زخم لگ چکا ہے۔ انہوں نے تو ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ میدانِ بدر میں اپنے ستر مقتول چھوڑ کر گئے تھے اور ستر قیدی۔ اس کے باوجود وہ تین ہزار کی نفری لے کر مدینہ پر چڑھائی کیلئے آ گئے۔ تم کیوں ہمت ہار رہے ہو؟ کیوں تنگ دل ہو رہے ہو؟ ﴿ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ "یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں"۔ گھبراؤ نہیں : ﴿ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ "دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔" یہ تو تمہاری غلطی تھی جس پر غزوۂ اُحد میں تمہیں شکست کی صورت میں سزا دے کر ہم نے تمہیں سبق سکھایا ہے۔ ورنہ یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری پشت پر نہیں ہے، تمہارا مددگار اور حامی نہیں ہے۔ یہ تو ابھی اندرون عرب کا معاملہ ہے، تمہیں تو ابھی قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو تہ و بالا کرنا ہے۔ اگر آج تمہارا نظم اور ڈسپلن ڈھیلا رہا تو آئندہ کیا ہو گا۔ لہٰذا سبق سکھانا ضروری تھا۔ تمہارے اندر اس کے بغیر نظم کی اہمیت کا احساس کہاں سے آتا! اگر اللہ چاہتا تو اس خطا کو نظر انداز (condone) کر دیتا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ تمہاری اس خطا کے باوجود تمہیں فتح دے دیتا۔ لیکن اس طرح تمہاری اُس موقع کی کمزوری اور غلطی کی اصلاح نہ ہوتی، بلکہ اس میں مزید اضافہ ہوتا۔ لہٰذا ایک وقتی سی شکست کی صورت میں ہم نے تمہیں متنبہ کر دیا کہ اپنی صفوں (ranks) کا جائزہ لے لو، جہاں جہاں کمزوریاں ہیں انہیں دور کرنے کی فکر کرو، اپنی جمعیت کو اور مضبوط کرو، جو نئے نئے لوگ مشرف بایمان ہوئے ہیں ان کی تربیت کی کمی کو دور کرو تاکہ یہ بھی اسی طرح کندن بن جائیں جیسے مکّہ سے آئے ہوئے مہاجرین اور السابقون الاولون انصار

—— تمام اہل ایمان کو نظم کی پابندی کا خوگر بناؤ۔ تم یہ سب کچھ کر لو تو تم سے استخلاف اور تمکّن فی الارض کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پختہ وعدہ ہے :

﴿ وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ ﴾ (النور : ۵۵)

غزوۂ احزاب

غزوۂ اُحد کے بعد کے دو سال کے عرصہ میں تشویش اور خوف کی حالت رہی' جو غزوۂ خندق کے موقعہ پر اپنے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچی۔

رمضان المبارک ۲ھ میں غزوۂ بدر ہوا۔ پھر شوال ۳ھ میں معرکۂ اُحد پیش آیا۔ ذیقعدہ ۰۵ھ میں یعنی دو سال اور ایک ماہ بعد اب قریش اور دیگر قبائل جن میں یہود بھی شامل تھے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ عرب میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا لشکر جمع نہیں ہوا تھا۔ بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لئے جمع ہو گیا۔ جنوب سے قریش آ گئے۔ مشرقی جانب سے کئی قبائل آ گئے جن میں بنو فرازہ اور بنو غطفان بھی تھے جو نجد کے علاقے کے بڑے جنگ جُو اور خونخوار قبیلے تھے۔ شمال سے وہ یہودی قبائل حملہ آور ہو گئے جو خیبر میں آباد تھے۔ اس طرح ان قبائل نے مدینہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کا نقشہ سورۃ الاحزاب میں کھینچا گیا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں غزوۂ احزاب کا ذکر پورے دو رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے۔

مدینہ پر یلغار کا نقشہ

کُفّار و مشرکین کی ہمہ جہت یلغار اور کمزور ایمان والوں اور منافقین کے خوف و بے اطمینانی کا نقشہ سورۃ الاحزاب میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے : ﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ﴾ "یاد کرو جب لشکر آ گئے تھے تم پر تمہارے اوپر سے بھی

اور تمہارے نیچے سے بھی" ـــــ چونکہ مدینہ سے مشرق کی طرف اونچائی ہوتی چلی جاتی ہے' اسی لئے اس علاقہ کو نجد کہتے ہیں' جس کے معنی ہیں اونچائی والا علاقہ۔ لہٰذا جو مشرق سے آئے ان کے لئے "مِنْ فَوْقِكُمْ" کے الفاظ آئے ـــــ اور مغربی ساحل کی طرف ڈھلان اور اترائی ہے۔ چنانچہ قریش اور ان کے حلیف مغرب یعنی نچائی اور اتار کے راستہ سے آئے۔ لہٰذا ان کے لئے "مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ" فرمایا گیا۔ مزید برآں مدینہ کے شمال مغرب کی جانب سے یہودی قبائل جمع ہو کر آ گئے تھے ـــــ اس کٹھن موقع پر منافقین اور کمزور ایمان والوں کی کیفیت اسی آیت میں آگے ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ : ﴿ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا٥ ﴾ "اور یاد کرو جب آنکھیں (وحشت و حیرت سے) پھرنے لگیں اور (خوف و ہراس سے) دلوں کا یہ حال تھا کہ وہ گویا گلوں میں آ اٹکے ہیں اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے" ـــــ یہ تبصرہ ہے اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے اس امتحان پر جو غزوۂ احزاب کی صورت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا ـــــ راقم کی رائے ہے کہ ذاتی طور پر نبی اکرم ﷺ پر سب سے سخت دن "یومِ طائف" گزرا ہے اور مسلمانوں پر بحیثیت جماعت سب سے سخت اور شدید ایام غزوۂ احزاب کے گزرے ہیں۔

غزوۂ اُحد کے موقع پر تین سو افراد تو بطورِ منافقین منظرعام پر آ چکے تھے۔ اب غزوۂ احزاب تک ان کی تعداد کتنی ہو گی' واللہ اعلم۔ بہرحال قرآن مجید سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ان کی معتدبہ تعداد موجود تھی۔ ان کے دل ہمارے محاورہ کے مطابق بلیوں اچھل رہے تھے اور ان کو ہر چہار طرف موت نظر آ رہی تھی۔ اور بظاہر احوال بچنے کی کوئی شکل سامنے نہیں تھی۔

میں جب بھی غزوۂ احزاب کا ذکر کرتا ہوں تو جناب نعیم صدیقی کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ جاتا ہے ؎

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
اُمّید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم!

ہدایت کا ایک چراغ تھا جو مدینہ میں روشن تھا اور اس کو بجھانے کے لئے اتنی بڑی بڑی آندھیاں آرہی تھیں کہ الامان والحفیظ!

منافقین کی کیفیت

امتحان یقیناً شدید تھا۔ نتیجتاً منافقین کے دلوں میں جو خُبث' نجاست اور گندگی تھی' وہ اس ابتلاء و آزمائش کو دیکھ کر ان کی زبانوں پر آگئی' جس کا ذکر قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کیا ہے : ﴿ وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ ﴾ "اور جب کہنے لگے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سب فریب تھا ـــــ انہوں نے کہا کہ ہمیں تو دھوکا دے کر مَروا دیا گیا۔ ہم سے تو کہا گیا تھا کہ قیصرو کسریٰ کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی' جبکہ اس وقت حالات یہ ہیں کہ ہم رفع حاجت کے لئے بھی باہر نہیں جاسکتے۔ کھانے کو کچھ نہیں۔ ہمارے باغات حملہ آوروں نے اجاڑ دیئے۔ چاروں طرف سے محاصرہ ہے' اندر کوئی چیز نہیں ہے۔ فاقوں پر فاقے آرہے ہیں۔ غضب کی سردی نے الگ زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ منافقین کی یہ وہ باتیں ہیں جو ان کے دلوں سے اچھل کر زبانوں پر آگئیں۔ ان باتوں کا تذکرہ سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور کتب احادیث میں ملتا ہے۔

اہلِ ایمان کی کیفیات

ادھر مؤمنین صادقین کی کیفیت کیا تھی؟ ملاحظہ ہو : ﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ "اور حقیقی مؤمنین کا اُس وقت حال یہ تھا کہ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ

پکار اُٹھے کہ یہی تو وہ بات ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے ہم سے وعدہ کیا تھا' اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی"۔

یہ کون سا وعدہ ہے جس کی طرف یہ صادق القول مؤمنین اشارہ کر رہے ہیں؟ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش و امتحان اور ابتلاء کے وعدوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ العنکبوت کی آیات ۲۔۳ میں فرمایا :

﴿ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ○ ﴾ (العنکبوت : ۲۔۳)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں!"

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۵۵ میں فرمایا :

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ○ ﴾

"اور ہم البتہ تم کو خوف و خطر اور بھوک اور مال و جان اور فصلوں کی تباہی میں مبتلا کر کے تمہارا امتحان لیں گے' جو ان حالات میں صبر کریں تو ان کو (اے نبیؐ) بشارت دے دیجئے۔"

چنانچہ غزوۂ احزاب کے مصائب کو دیکھ کر مؤمنین صادقین کے ذہن ان پیشگی تنبیہات کی طرف منتقل ہو گئے اور ان کی زبانوں پر فی الفور آگیا : ﴿ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾

خندق کی تیاری کا عجیب نقشہ

غزوۂ احزاب میں کفار و مشرکین کے لشکروں کا محاصرہ خاصا طول پکڑ گیا اور اس

دوران اہلِ مدینہ پر بڑے ہی سخت قسم کے حالات پیش آئے۔ جب خندق کھودی جا رہی تھی تو نبی اکرم ﷺ بھی اس کام میں بنفس نفیس شریک تھے اور پتھر اٹھا اُٹھا کر خندق سے باہر پھینک رہے تھے۔ چونکہ ان دنوں شدید قحط کا عالم تھا لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے پیٹوں پر چادروں کے ساتھ کس کر پتھر باندھ رکھے تھے تا کہ کمریں دوہری نہ ہو جائیں۔ اس لئے کہ شدید بھوک کی وجہ سے معدہ تشنج میں آتا ہے۔ دراصل یہ اس معدے کو بہلانے کی ایک شکل ہے کہ اگر اس پر بھاری بوجھ باندھ دیا جائے تو اس کو وہ بھوک کا تشنج (Hunger Pain) نہیں ہو گا۔ اس موقع پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کرتے اٹھا کر اپنے پیٹ دکھائے اور عرض کیا کہ حضور ﷺ اب فاقہ ناقابل برداشت ہو رہا ہے، ہم نے اسی لئے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے اپنا کرتہ اُٹھا کر دکھایا تو وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

یہ دراصل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا کہ مدینہ منورہ کے دفاع کیلئے خندق کھودی جائے۔ عرب تو جانتے ہی نہیں تھے کہ خندق کس بلا کا نام ہے۔ پرانی جنگوں میں دفاع کے جو طریقے اختیار کئے جاتے تھے ان میں شہر پناہ کے گرد اگرد خندق کھودنے کا رواج بھی تھا۔ اہل ایران دفاع کے اس طریقہ سے بخوبی واقف تھے۔ ایران اور روم کی تو کئی سو سال سے جنگ چل رہی تھی۔ تاریخ دونوں کے مابین جھولا جھول رہی تھی۔ کبھی رومی ایران کے دارالسلطنت مدائن تک چڑھ دوڑتے تھے تو کبھی ایرانی ان کو ایشیائے کوچک میں دھکیل دیتے تھے۔ جب مدینہ میں خبر پہنچی کہ تین اطراف سے کفار و مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کیلئے چلا آ رہا ہے تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ مدینہ کو پشت پر رکھتے ہوئے خندق کھودی جائے تاکہ خندق کی وجہ سے دشمن براہ راست مدینہ پر یورش نہ کر سکیں۔ چنانچہ خندق کھودنے کا کام تیزی سے شروع ہو گیا۔ یہ سخت سردی کا موسم تھا۔

روایات میں خندق کی کھدائی کے وقت دو اشعار کا ذکر ملتا ہے۔ محبتِ الٰہی میں

سرشار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے سالارِ اعظم جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ خندق کی کھدائی کے لئے اس سنگلاخ زمین پر جرأت مومنانہ اور ہمت مردانہ کے ساتھ کدالیں چلا رہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ضرب لگاتے ہوئے کورس کے انداز میں کہتے جاتے تھے : "اَللّٰھُمَّ لَاعَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ" اے اللہ! آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے' آخرت کا عیش ہی اصل عیش ہے۔ گویا ان کے نزدیک اس وقت کی کلفتیں' تکالیف اور مصائب ہیچ ہیں' انہیں تو آخرت کی فوز و فلاح چاہئے۔ اور رسول اللہ ﷺ جواب دے رہے تھے : "فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃَ" اے اللہ! پس تو بخشش فرما دے ان انصار و مہاجرین کی!

دوسرا شعر جس کا تذکرہ روایات میں ملتا ہے وہ نظمِ جماعت کی اساس و بنیاد بیعت کے ضمن میں بہت اہم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ترانہ کے انداز میں کدالوں کی ضرب کے ساتھ یہ شعر پڑھ رہے تھے :

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوا مُحَمَّدا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدا!

"ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد (ﷺ) سے جہاد کی بیعت کی ہے۔ اب یہ جہاد
اس وقت تک جاری رہے گا جس وقت تک جان میں جان ہے۔"

جسم و جان کا تعلق منقطع ہو جائے تو بات دوسری ہے۔ جب تک یہ تعلق باقی ہے جہاد جاری رہے گا۔ یہ ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کی وہ شان جس کی بنیاد بیعت ہے۔

نصرتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد اور نصرت و تائید سے اہلِ ایمان کو اس نرغہ اور محاصرہ سے نجات دلائی جو بیس دن تک جاری رہا تھا۔ ایک شب بہت زبردست آندھی آئی جس سے کفار و مشرکین کے لشکر تلپٹ ہو گئے۔ اکثر خیمے اکھڑ کر آندھی کے ساتھ تتر بتر ہو گئے۔ بڑے بڑے چولہوں پر چڑھی ہوئی بڑی بڑی دیگیں تھیں'

اُلٹ گئیں۔ ان چولہوں کی وجہ سے ان کے خیموں میں آگ لگ گئی۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک غیبی تدبیر تھی جس سے ان کے حوصلے اس درجہ پست ہو گئے کہ صبح تک تمام لشکر منتشر ہو چکا تھا۔ تمام قبائل اپنے اپنے علاقوں کی طرف کوچ کر گئے ــــــ اسی کا ذکر ہے سورۃ الاحزاب کی آیت ۹ میں :

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۟ ﴾

"اے اہل ایمان! اللہ کا احسان یاد کرو جو تم پر ہوا' جب چڑھ آئیں تم پر فوجیں پھر ہم نے ان پر بھیج دی ہوا (آندھی) اور (فرشتوں کی) وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں۔ اور اللہ تمہارے تمام اعمال کو دیکھنے والا ہے۔"

نبی اکرم ﷺ نے چند اور تدابیر بھی اختیار فرمائی تھیں' لیکن ان کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس غزوۂ احزاب کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کو اہلِ ایمان کا امتحان لینا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دینا مقصود تھا' تاکہ نظر آجائے کہ کون کتنے پانی میں ہے! سب جان لیں کہ کون ان میں سے منافق ہیں اور کون وہ ہیں جو کڑی سے کڑی آزمائش اور سخت سے سخت امتحان میں بھی ثابت قدم رہ سکتے ہیں!! ــــــ جب یہ امتحان ہو گیا تو مدِّمقابل دشمنوں کے لئے ایک آندھی اور فرشتوں کا ایک لشکر کافی تھا۔ کفار و مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر اللہ کی قدرت کے مقابلہ میں تو پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ بارہ ہزار کیا بارہ لاکھ کا لشکر بھی ہوتا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایک آندھی نے معاملہ تلپٹ اور تتر بتر کر دیا اور کفّار و مشرکین جو ایک زبردست جمعیت کی شکل میں بڑے ارمانوں اور بڑی تیاریوں کے ساتھ دُور دراز کا سفر کر کے ہدایت کے چراغ کو بجھانے آئے تھے ایک ہی رات میں منتشر ہو گئے۔ معاملہ ختم ہو گیا اور صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح مسلمانوں نے دیکھا تو میدان خالی تھا۔

نبی اکرم ﷺ کا تاریخی ارشاد

اس موقع پر نبی اکرم ﷺ نے جو تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو کتنی دوررس نگاہ اور کتنی بصیرت و فراست عطا فرمائی تھی۔ کسی انقلابی رہنما کے لئے یہ وصف (Quality) اشد ضروری ہے کہ وہ حالات پر صحیح صحیح نگاہ رکھے ـــــ چند اصولوں کو جان لینا اور ان کو بیان کرتے چلے جانا ہی سب کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی صلاحیت اور نگاہ دُور رَس کی بھی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ حالات کی نبض پر بھی ٹھیک ٹھیک ہاتھ ہو۔ صحیح اندازہ ہو کہ حالات کا رُخ کیا ہے' وہ کدھر جا رہے ہیں! صحیح صحیح تشخیص (Assessment) ہو کہ ہم کتنے پانی میں ہیں اور ہمارا دشمن کتنے پانی میں ہے! اس کی طاقت کیا ہے! اس کے اور ہمارے اثرات کا تناسب کیا ہے! ظاہر بات ہے کہ ایک انقلابی عمل میں ان سب امور پر گہری نگاہ رکھنی ناگزیر ہے۔ اگر صرف ایک خانقاہ ہے اور اس میں لوگوں کی تربیت کرنی ہے تو اس کے لئے بھی ایک خاص صلاحیت درکار ہے۔ لیکن اس میں ان چیزوں پر نگاہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح ایک دارالعلوم ہے' جہاں درس دینا ہے' قرآن پڑھانا ہے' حدیث و فقہ پڑھانی ہے تو ان کاموں کے لئے ایک خاص صلاحیت کی ضرورت ہے' مگر وہاں بھی مذکورہ بالا امور پر نظر ہونی ضروری نہیں ہے ـــــ لیکن انقلابی عمل میں اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اس امر پر نگاہ ہو کہ انقلابی دعوت اور تحریک کو مختلف مراحل سے گزار کر کامیابی تک کیسے پہنچا دیا جائے!۔ یہ شے دگر ہے۔ اس کے لئے اور قسم کی صلاحیتیں چاہئیں۔ اس کی ایک عظیم مثال ہے جو غزوۂ احزاب کے متصلاً بعد سیرتِ مطہرہ میں نظر آتی ہے۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر' جس کا دوسرا نام غزوۂ خندق بھی ہے' اگرچہ قریش بارہ ہزار کا لشکر لے آئے تھے' اور عرب کی حد تک اُس وقت تک کی تاریخ میں اتنا بڑا لشکر پہلی بار جمع ہوا تھا' لیکن اب جو یہ لشکر منتشر ہوا اور بھیڑ چھٹی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان الفاظ میں خوش خبری سنا دی کہ : ((لَنْ تَغْزُوكُمْ قُرَيْشٌ

بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) "اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکتے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے"۔ میرے نزدیک سورۃ الصف بھی اسی موقع پر نازل ہوئی ہے جس میں یہ آیت مبارکہ موجود ہے : ﴿ وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ﴾ "اور (اے مسلمانو!) ایک دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے' یعنی اللہ کی مدد' تو وہ آیا ہی چاہتی ہے اور اب فتح دور نہیں ہے (تمہارے قدموں کو چومنے والی ہے) اور اے نبیؐ! اہلِ ایمان کو بشارت سنا دیجئے" ـــــ نبی اکرم ﷺ نے جو یہ الفاظ فرمائے کہ : ((لَنْ تَغْزُوكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) تو راقم کے نزدیک یہ الفاظ حضور ﷺ نے سورۃ الصف کے اس حکم ﴿ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ کے امتثالِ امر میں فرمائے تھے۔ واللہ اعلم!

نبی اکرم ﷺ کو بخوبی اندازہ تھا کہ قریش نے کتنی محنتوں اور کوششوں سے اس عظیم لشکر کی تیاری کی ہوگی اور اپنے حلیف قبائل کو اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کیا ہوگا۔ بنو غطفان' بنو فزارہ اور خیبر کے یہود کے قبائل کو آمادہ کرنے کے لئے کتنی سفارتیں بھیجی ہوں گی' کتنی خط و کتابت کی ہوگی اور اس کام کے لئے پیامبری کے سلسلہ میں کتنے سوار دوڑائے ہوں گے ـــــ یہ سارے پاپڑ بیل کر قریش نے اتنی طاقت جمع کی تھی اور اسے لے کر وہ مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے' لیکن نتیجہ کیا نکلا! یہ کہ بے نیل و مرام واپس جانا پڑا' ساری محنتیں اور کوششیں اکارت گئیں۔ اتنی بڑی جمعیت ـــــ لیکن قدرتِ الٰہی کے سامنے اس کی حیثیت کیا تھی! اللہ تعالیٰ نے ایک آندھی بھیج دی اور ان کے تمام ارمان ملیا میٹ ہو گئے۔ حضور ﷺ کو اندازہ تھا کہ اس ہزیمت سے قریش کے حوصلے اس قدر پست ہو گئے ہیں کہ اب قریش یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ مدینہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے متعلق سوچیں۔ لہٰذا حضور ﷺ نے اہل ایمان کو بشارت سنا دی کہ اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ نہیں کر سکتے' بلکہ اب تم چڑھائی کر کے جاؤ گے' اب پیش قدمی تمہاری طرف سے ہوگی۔ اب جنگ کے لئے اقدام ہماری طرف سے ہوگا جو اب تک قریش کے ہاتھ میں تھا۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین ○○

خطابِ ہفتم
اندرونِ عرب
تکمیلِ انقلاب کی تمہید
فراستِ نبویؐ کا شاہکار اور
فتحِ مبین یعنی
صلح حدیبیہ
ذی قعدہ سنہ ۶ھ

- آنحضورؐ کا خواب، عمرہ کا قصد اور اہلِ مکہ کا ردِ عمل
- عروہ ابن مسعود ثقفی کا تدبرانہ رویہ اور آنحضورؐ سے گفت و شنید
- عروہ کا بظاہر گستاخانہ انداز اور صدیق اکبرؓ اور مغیرہ ابن شعبہؓ کا ردِ عمل
- عروہ کا قریش سے خطاب اور قریش کے جوشیلے افراد کا ردِ عمل
- مصالحت کے لیے آنحضورؐ کی مساعی اور سفارتِ حضرتِ عثمانؓ

بیعتِ رضوان

- قریش کے رویہ میں لچک اور سفارت سہیلؓ ابن عمرو
- صلح نامہ کی تحریر اور حضرت علیؓ کا طرزِ عمل
- معاہدہ کی شرائط اور حضرت عمرؓ کا اضطراب
- ایک مخصوص گروہ کی اتہام طرازی اور اس کا ازالہ
- ابوجندلؓ کی آمد اور آنحضرتؐ کی نصیحت
- صحابہ کرامؓ کا غیر معمولی طرزِ عمل اور اس کی توجیہہ
- یہ صلح فتح مبین کن اعتبارات سے تھی
- حضرت ابوجندل کا دوسرا اقدام اور حضرت ابوبصیرؓ کی شمولیت
- صلح حدیبیہ کے ثمرات
- حضرت خالدؓ ابن ولید اور حضرت عمرؓ ابن العاص کا قبولِ اسلام
- اندرونِ عرب تبلیغی مساعی کی شدت اور ایک حادثہ فاجعہ
- بیرونِ عرب تبلیغی خطوط کی ترسیل
- عمرہ قضا اور قریش کی شکست خوردگی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ مسنونہ 'تلاوتِ آیاتِ قرآنی 'احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

حضورؐ کا خواب

غزوۂ احزاب کے اگلے ہی سال ۶ ھ میں رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمانؓ عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیبی اشارہ اور حکم سمجھ کر اعلانِ عام کرا دیا کہ ہم عمرہ کے لئے جائیں گے 'جو ہمارے ساتھ جانا چاہیں وہ چلیں۔ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے 'وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ گویا موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اگرچہ عمرہ کی نیت سے جا رہے تھے 'لیکن قریش کے نزدیک تو یہ ایک نوع کی چڑھائی تھی۔ وہ عمرہ کے لئے اہل ایمان کو مکہ میں داخل ہونے دیں تو گویا یہ ان کے لئے اپنی رہی سہی ساکھ اور بچا کھچا وقار بھی ہمیشہ کے لئے خود اپنے ہاتھوں خاک میں ملانے کے مترادف تھا۔ یہ تو ان کے لئے ایک نوع کی شکست تھی کہ وہ مسلمانوں کو عمرہ ادا کرنے دیتے۔ اس کے بعد تو عرب میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔ حضور ﷺ کے ساتھ چلنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات میں چودہ سو سے لے کر دو ہزار تک کی تعداد کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم زیادہ تر روایات کے مطابق تعداد چودہ سو تھی۔ ذوالحلیفہ کا مقام مدینہ سے تقریباً سات آٹھ میل باہر ہے۔ یہاں سے عمرہ یا حج کے لئے احرام باندھنے کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں حضور ﷺ اور آپؐ کے تمام ساتھیوں رضی اللہ عنہم نے عمرہ کا احرام باندھا

اور ہدی (قربانی) کے جو جانور ساتھ تھے ان کے گلوں میں پٹے ڈال دیئے گئے' جو اِس بات کی علامت تھی کہ یہ جانور قربانی کے ہیں۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر آپؐ نے مکّہ کی طرف سفر جاری رکھا' حتیٰ کہ حدیبیہ کے مقام پر جا کر پڑاؤ کیا۔ اسی مقام پر نبی اکرم ﷺ اور مشرکینِ قریش کے مابین وہ صلح ہوئی جو تاریخ میں "صلح حدیبیہ" کے نام سے موسوم ہے اور جسے قرآن حکیم نے سورۃ الفتح میں "فتح مبین" قرار دیا ہے :

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾

اہلِ مکّہ کا ردِّ عمل

نبی اکرم ﷺ نے ادھر حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ فرمایا' اُدھر جب قریش کے علم میں آگیا کہ حضورؐ عمرہ کے ارادہ سے تشریف لائے ہیں تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم محمدؐ (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو کسی صورت بھی مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ بلکہ انہوں نے اپنے تمام حلیفوں کو پیغام بھیج دیا کہ وہ سب آکر قریش کی مدد کریں تاکہ سب مجتمع ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ محمدؐ (ﷺ) کا راستہ روک سکیں۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی یہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ بدیل بن ورقہ خزاعی قبیلہ بنو خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے' جو مکّہ اور مدینہ کے مابین آباد تھا۔ اس قبیلہ کا کچھ دوستانہ تعلق قریش کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بھی تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بدیل بن ورقہ کو اس کام کے لئے مامور کیا کہ وہ مکّہ والوں کی خبر لا کر دیں کہ صورت حال کیا ہے! انہوں نے آکر خبر دی کہ قریش نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے اور ان کا عزمِ مصمم ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی آپؐ کو مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم مکّہ جا کر ہماری طرف سے قریش سے کہو کہ ہمارا جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے' ہماری کسی سے لڑنے بھڑنے کی کوئی نیت نہیں ہے' ہم محض عمرہ کے لئے آنا چاہتے ہیں' اور قریش کو سمجھاؤ کہ انہیں پہلے بھی ان جنگوں کے سلسلہ نے بہت نقصان پہنچایا ہے' اب بہتر یہی ہے کہ

ہمارے اور ان کے مابین کچھ عرصہ کے لئے صلح ہو جائے اور قریش ہمیں عرب کے دوسرے قبائل سے نمٹنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں تاکہ ہم بقیہ عرب کے ساتھ اپنے معاملات طے کرلیں۔ اسی میں خیر ہے' اسی میں ہماری اور ان کی بہتری ہے۔ چنانچہ وہ ہمیں پُرامن طور پر عمرہ ادا کرنے دیں اور مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیں۔

بُدَیل بن ورقہ حضورؐ کے اس پیغام کے ساتھ مکّہ پہنچے۔ وہاں ایک بڑی چوپال میں جاکر' جہاں قریش کے بڑے بڑے گھرانوں کے سردار جمع تھے' انہوں نے کہا کہ میں محمدؐ (ﷺ) کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں' اگر آپ حضرات اجازت دیں تو عرض کروں! ـــــ انہوں نے یہ انداز شاید اس لئے اختیار کیا ہو گا کہ پہلے یہ اندازہ ہو جائے کہ قریشِ مکّہ کا رجحان (mood) کیا ہے! چنانچہ ان میں Hawks (یعنی مشتعل مزاج اور جنگجو لوگوں) نے تو فوراً کہا کہ ہم نہ تو کوئی بات سننے کے لئے تیار ہیں اور نہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت اور حاجت ہے۔ مگر Doves (یعنی صلح پسند افراد) نے کہا کہ نہیں! ہمیں بات سُنی چاہئے اور بدیل سے کہا سناؤ کہ محمدؐ (ﷺ) کہتے کیا ہیں! انہوں نے حضور ﷺ کا پیغام من و عن سنا دیا۔

عروہ بن مسعود ثقفی کا مدبّرانہ رویّہ

اُس وقت طائف کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی بھی وہاں موجود تھے۔ مکّہ اور طائف کو جڑواں شہروں (Twin Cities) کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے مابین رشتہ داریاں بھی بہت تھیں اور مکّہ کے اکثر رؤسا کی جائیدادیں اور باغات بھی طائف میں کثرت سے تھے۔ اس موقع پر ان ثقفی سردار عروہ بن مسعود[1] نے کھڑے ہو کر کہا "اے قریش! کیا میں تمہارے لئے باپ کی مانند نہیں ہوں اور کیا تم میرے بچوں کی مانند نہیں ہو؟" مجلس کے شرکاء نے کہا "ایسا ہی ہے"۔ پھر انہوں نے کہا "کیا تمہیں مجھ پر اعتماد ہے کہ میں جو کچھ کہوں گا تمہاری

---

(1) عروہ بعد میں ایمان لے آئے تھے اور انہیں صحابی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ (رضی اللہ عنہ)

بہتری کے لئے کہوں گا؟" لوگوں نے جواب میں کہا کہ "ہاں ہمیں اس پر بھی اعتماد ہے" ــــ تو انہوں نے کہا "مجھے اجازت دو کہ میں محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤں اور ان سے بات چیت کروں"۔ لوگوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔

عروہ بن مسعود کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفت و شنید

حدیبیہ میں جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا پڑاؤ تھا' عروہ وہاں آئے۔ وہ بہت ہی زیرک' دانا اور مدبر انسان تھے' آخر ثقیف کے سردار تھے' جو قریش کے بعد سب سے معزز قبیلہ شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر لشکر کے ماحول اور نظم و ضبط کا ایک اندازہ قائم کرنے کے لئے بھرپور جائزہ لیا۔ پھر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلے تو انہوں نے خوفزدہ کرنے کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا:

> "محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک طرف قریش اور ان کے حلیف ہیں' ان کی پوری قوت مجتمع ہے ــــ اور ان کا فیصلہ ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے' وہ اس پر تلے ہوئے ہیں۔ اب تم دیکھ لو کہ اگر جنگ ہوئی اور بالفرض تم نے مکہ والوں کو ختم کر دیا تو کیا یہ کوئی اچھی بات ہو گی؟ اس سے پہلے کیا کسی شریف انسان کی ایسی مثال موجود ہے کہ اس نے اس طرح اپنے ہی قبیلہ کو ختم کر دیا ہو؟ اور اگر معاملہ برعکس ہوا تو میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ جو جمعیت ہے وہ تو مختلف قبائل سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے (گویا کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا والا معاملہ ہے)۔ شکست اور ہزیمت کی صورت میں یہ سب تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے' ان میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ کھڑا نہیں رہے گا۔"

عروہ بن مسعود کے پیش نظر چونکہ قبائلی نظام تھا اور وہ جانتے تھے کہ قبائل تو عموماً قبائلی حمیت کے تحت لڑتے تھے' چنانچہ انہوں نے یہ بات اپنے تجربہ کی بنیاد پر

کہی تھی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے۔ ان کو عروہ بن مسعود کی اس بات پر طیش آگیا۔ ان کی زبان سے عروہ کے لئے ایک عریاں گالی نکل گئی اور انہوں نے کہا "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ دیں گے۔ خدا کی قسم ہم ان کو چھوڑنے والے نہیں ہیں"۔ گالی سن کر عروہ نے پوچھا یہ کون ہیں۔ بتایا گیا کہ یہ ابو بکرؓ ہیں تو عروہ نے کہا "ان کا مجھ پر ایک احسان ہے' ورنہ آج میں انہیں اس گالی کا جواب دیتا۔"

اس کے بعد عروہ نے نبی اکرم ﷺ سے گفتگو کرتے ہوئے یہ گستاخانہ انداز اختیار کیا کہ بار بار حضورؐ کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتے۔ وہ شاید یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ حضورؐ کے بارے میں آپؐ کے ساتھیوں کا طرز عمل کیا ہے! —— حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بحیثیت محافظ وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے عروہ کی بار بار کی یہ حرکت دیکھ کر اپنی تلوار کا دستہ ان کے ہاتھ پر مارا اور کہا کہ آئندہ یہ ہاتھ حضورؐ کی ریش مبارک تک بڑھا تو قطع ہو جائے گا' واپس نہیں جا سکے گا —— بہر حال عروہ یہ گفتگو کر کے اور ایک اندازہ قائم کر کے واپس مکہ چلے گئے۔

عروہ کا قریش کے سامنے اپنے تأثرات کا اظہار

مکّہ پہنچ کر عروہ بن مسعود نے قریش کے سرداروں کے سامنے جو رپورٹ پیش کی اس سے ان کے اس تاثر کا اندازہ ہوتا ہے جو اہل ایمان کے لشکر کے نظم و ضبط' ان کے جوش و خروش اور ان کی فدائیانہ کیفیات کو دیکھ کر ان کے دل و دماغ پر مترتب ہوا تھا۔ انہوں نے کہا :

> "اے قریش کے لوگو! دیکھو' میں قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں گیا ہوں' میں نے ان کے دربار دیکھے ہیں' ان کا ٹھاٹھ باٹھ دیکھا ہے' لیکن خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو اس کی اپنی قوم میں ایسا محترم نہیں دیکھا جیسا کہ محمد (ﷺ) کو اپنے اصحاب میں دیکھا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جو

لوگ محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں ان کو جتنی محبت محمد (ﷺ) سے ہے اور جتنی عقیدت وتوقیر اور عزّت محمد (ﷺ) کی ان کے دلوں میں ہے' اور اپنے دین کی جو حمیت اور فدایانہ جذبہ ان کے دلوں میں ہے' وہ مجھے پوری زندگی میں کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ جب محمد (ﷺ) وضو کرتے ہیں تو لوگ انؐ کے وضو کا پانی تبرک کے طور پر لینے کیلئے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اگر وہ تھوکتے ہیں یا ان کے دہن سے بلغم نکلتا ہے تو لوگ اسے جھپٹ لیتے ہیں اور اس کو اپنے ہاتھوں اور چہروں پر مل لیتے ہیں۔ یہ محبت میں نے کسی قوم میں اپنے سردار اور قائد حتیٰ کہ کسی بادشاہ تک کیلئے نہیں دیکھی۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم ان سے مت بھڑو' ان سے جنگ کا ارادہ ترک کردو اور مصالحت کر لو۔ "

قریش کے جوشیلے افراد کا ردِّ عمل

عروہ کے اس اظہارِ خیال پر وہاں بڑا شور وغوغا ہوا کہ ہم مصالحت کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہم محمد (ﷺ) کو کسی صورت بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ محمد (ﷺ) کو واپس جانا پڑے گا ورنہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ انہوں نے یہی پیغام اپنے دو دوسرے اشخاص کے ذریعے حضور ﷺ کے پاس بھیجا' لیکن کوئی بات بنتی نظر نہیں آئی۔ فریقین میں سے کوئی بھی اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوا اور تناؤ (Tension) کی کیفیت برقرار رہی۔

مصالحت کے لئے نبی اکرم ﷺ کی طرف سے مساعی

نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر مقیم ہونے کے بعد بدیل بن ورقہ خزاعی کے ذریعے پہلا پیغام بھیجا تھا' جس کے نتیجہ میں پہلے عروہ بن مسعود حضورؐ کی خدمت میں گفتگو کے لئے آئے تھے اور اس کے بعد قریش کے چند مشتعل مزاج (Hawks) لوگ آپؐ کے پاس آئے' لیکن ان کا رویّہ مصالحانہ نہیں تھا' بلکہ جارحانہ اور رعب

ڈالنے والا تھا۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے خود سلسلۂ جنبانی شروع کرنے اور اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو مکّہ والوں کے پاس افہام و تفہیم کے لئے بھیجنے کا ارادہ فرمایا۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرا خیال ہے آپ مکّہ جائیں اور قریش سے مصالحت کی کوشش کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضورؐ اب مکّہ میں میرا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں ہے جس کی امان و حمایت میں' میں مکّہ میں داخل ہو سکوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی بغیر بات چیت کے قتل کر دیں۔ لہٰذا میں تجویز کرتا ہوں کہ میری بجائے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بھیجئے۔ ان کا قبیلہ بنو امیّہ بہت مضبوط ہے۔ ان کے بہت سے قریبی رشتہ دار بھی وہاں موجود ہیں جن میں سے کسی کی بھی امان و حمایت میں وہ مکّہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مکّہ جانے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ وہ تعمیل حکم میں مکّہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ کا مکّہ پہنچنا' اور آپؓ کی شہادت کی افواہ کا پھیلنا

نبی اکرم ﷺ کی جانب سے اس سفارت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب آں جنابؓ کی بے شمار فضیلتوں میں سے ایک فضیلت ہے۔ بہرحال حضرت عثمانؓ ابھی مکّہ میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ باہر ہی ان کو اپنے چچازاد بھائی ابان بن سعید بن عاص مل گئے۔ انہوں نے آنجنابؓ کو اپنی پناہ اور حمایت میں لے لیا اور اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قریش کے پاس پہنچ گئے۔ گفت و شنید کا سلسلہ دو تین روز تک چلتا رہا اگرچہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ قریش کسی صورت مصالحت پر آمادہ نہیں ہوئے۔ تاہم انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب جب تم مکّہ میں آ ہی گئے ہو تو ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم کعبہ کا طواف کر لو' لیکن آپؓ نے نبی اکرم ﷺ کی معیت کے بغیر طواف کی یہ پیشکش قبول نہیں فرمائی۔[1]

---

(1) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکّہ جانے کے بعد بعض اصحابِ رسولؐ نے کہا کہ "عثمان رضی اللہ عنہ کو←

گفت و شنید میں جو دیر لگی تو اس طرح گویا وہ کیفیت پیدا ہو گئی جسے آج کل کی سیاسی اصطلاح میں "نظربندی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دریں حالات یہ خبر اڑ گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔

بیعتِ رضوان

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے وہ بیعت لی جو کتب سیر میں "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور و معروف ہے اور جس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۸ میں ہے :

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَافِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا○ ﴾

"(اے نبیؐ) بے شک اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے اور اسے ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ لہٰذا اس نے ان پر قلبی اطمینان و سکون نازل فرمایا اور انعام میں ان کو فتح قریب بخشی۔"

بیعت علی الموت

حدیبیہ کے مقام پر کوئی چھوٹا سا درخت تھا جس کے سایہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہو گئے اور وہاں آپؐ نے فرمایا کہ اب ہر مسلمان مجھ سے بیعت کر کے ایک عہد کرے ـــــ اس بیعت کے بارے میں دو روایات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ بیعت علی الموت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہر مسلمان میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرے کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں لیکن عثمانؓ کے خون کا بدلہ لئے بغیر ہرگز یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔ دوسری روایت ہے کہ اس بات پر بیعت لی گئی کہ :

۲+ خانہ کعبہ کا طواف مبارک ہو"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جب یہ قول پہنچا تو آپؐ نے فرمایا "مجھے یقین ہے کہ اگر عثمان رضی اللہ عنہ عرصۂ دراز تک بھی مکہ میں رہ جائیں تب بھی وہ اس وقت تک طواف نہیں کریں گے جب تک میں طواف نہ کرلوں"۔ (مرتب)

"اَنْ لاَ نَفِرَّ" یعنی ہم یہاں سے پیٹھ نہیں موڑیں گے اور راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔ بہرحال اس بیعت کا مقصد یہ سامنے آتا ہے کہ کسی حالت میں پیٹھ نہیں دکھانی اور میدانِ جنگ سے جان بچا کر نہیں جانا۔ اگرچہ جان بچانے کی چند صورتیں وہ ہیں جن کی سورۃ الانفال میں اجازت دی گئی ہے اور انہیں جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ پینترا بدلنا مقصود ہو یا کسی جنگی حکمتِ عملی (strategy) کا تقاضا ہو کہ پیچھے ہٹ جایا جائے۔ مگر یہاں اس امر کا فیصلہ ہو گیا کہ کسی صورت میں بھی یہاں سے نہیں ہٹنا۔ اب یہاں سے کسی جنگی حکمت کے تحت پسپائی (strategic retreat) کا امکان بھی باقی نہیں رہا۔ رہا جان بچا کر فرار ہونے کا معاملہ تو یہ عمل گناہ کبیرہ میں شامل ہے ہی۔ گویا یہ بیعت علی الموت تھی کہ ہر شخص میدان میں ڈٹا رہے گا' صرف موت ہی اسے اس جنگ سے رستگاری دے سکے گی۔

حضرت عثمانؓ کی خصوصی فضیلت

ترجمانِ وحی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بے شمار فضائل و مناقب مروی ہیں۔ ان کے علاوہ سیرت عثمانیؓ کے متعدد واقعات آنجنابؓ کی فضیلتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک خصوصی فضیلت یہ ہے کہ دو مواقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدم موجودگی کے باوجود حضور ﷺ نے گویا انؓ کو موجود قرار دیا۔ پہلا موقع غزوۂ بدر کا ہے۔ آنجنابؓ کی اہلیہ اور نبی اکرم ﷺ کی لختِ جگر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کافی علیل تھیں' اس لئے ان کی تیمارداری کے لئے حضور ﷺ نے آنجنابؓ کو مدینہ میں چھوڑ دیا تھا اور انہیں اس لشکر میں شامل نہیں فرمایا تھا جو اولاً تو ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کا راستہ روکنے کے لئے نکلا تھا' لیکن بالآخر غزوۂ بدر پر منتج ہوا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بدر کے مال غنیمت میں سے وہی حصہ مرحمت فرمایا جو دوسرے بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کو مرحمت کیا گیا تھا۔ گویا حضور ﷺ نے آپؓ کو مجازی طور پر اس غزوہ میں شریک قرار دیا جبکہ حقیقی

طور پر وہ اس میں شریک نہیں تھے۔ اس طرح کا دوسرا موقع حدیبیہ کے مقام پر پیش آیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چونکہ وہاں موجود نہیں تھے' للذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اپنا ایک دستِ مبارک دوسرے دستِ مبارک کے اوپر رکھ کر ارشاد فرمایا کہ "یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور یہ عثمانؓ کی طرف سے بیعت ہے"۔ یہ درحقیقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل میں بہت بلند مقام ہے اور یہ بہت بڑی سعادت ہے جو اس روز انؓ کو حاصل ہوئی۔ پھر یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کیلئے حدیبیہ کے مقام پر موجود تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو بیعت لی یہ بھی انتہائی اعلیٰ مرتبہ ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ یہ وہ بیعت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا مندی اور خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس طرح بیعت رضوان کا یہ عظیم الشان واقعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام قرآن مجید میں ہمیشہ کیلئے محفوظ فرمادیا ہے۔

اس بیعت کی ضرورت کیا تھی؟

انتہائی غور طلب بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بیعت لینے کی ضرورت کیا تھی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو چودہ یا پندرہ سو افراد آئے تھے ان میں سے کوئی بھی اس بیعت میں پیچھے نہیں رہا۔ صرف ایک شخص جد بن قیس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ وہ اپنے اونٹ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے۔ اس نے بیعت نہیں کی۔ اس کے سوا بقیہ تمام لوگوں نے بیعت کی۔ یہ شخص درحقیقت منافق تھا اور اس کا ذکر سفر تبوک کے ضمن میں بھی آتا ہے کہ اس موقع پر اس کا نفاق بالکل کھل کر سامنے آگیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو اشخاص آئے تھے ان میں جد بن قیس جیسا کوئی دوسرا شخص شاید ہی ہو۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کا فیصلہ فرما دیتے تو یقیناً ان مومنین صادقین میں سے کوئی شخص بھی کسی صورت میں پیٹھ دکھانے والا نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیعت لے رہے ہیں تو اس میں کیا حکمت تھی؟ درحقیقت یہ اس لئے لی گئی کہ بیعت کا یہ اصول اور یہ عمل آنے

والوں کی رہنمائی کے لئے سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام میں بحیثیت سنت ہمیشہ ہمیش کے لئے ثبت ہو جائے۔ بیعت رضوان اس بات کی روشن دلیل ہے کہ کسی موقع پر یا کسی اعلیٰ مقصد کے لئے' جیسے ہجرت و جہاد' بیعت لینا سنّتِ ثابتہ ہے۔ ورنہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو سکتا تھا کہ نبی اکرم ﷺ بیعت لئے بغیر خونِ عثمانؓ کے قصاص کے لئے جنگ کا حکم دیتے تو اس سے اعراض کرتا۔ پھر یہی نہیں بلکہ مختلف مواقع پر انہی مخلص و صادق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف امور کے لئے حضور ﷺ کا بیعت لینا احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ انہی احادیث سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ' اقامتِ دین' اظہارِ دین الحق علی الدّین کلّہ اور تکبیرِ رب یعنی انقلابِ محمّدی (علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسلام) کی جدوجہد کے لئے جو ہیئتِ اجتماعیہ وجود میں آئے وہ بیعت ہی کے اصول پر قائم ہو۔ یہی سُنّت کا تقاضا ہے۔

قریش کی طرف سے مصالحت پر آمادگی

جب قریش نے ایک طرف یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کسی دھمکی سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں' دوسری طرف ان کے حلیم الطبع اشخاص نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور قریش کے سامنے خون ریزی کے ہولناک نتائج رکھے تو بالآخر ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اگر کوئی مصالحت ہو جائے تو بہتر ہو گا۔ لہٰذا آخر کار انہوں نے مصالحانہ گفتگو کے لئے سہیل بن عمرو کو حضور ﷺ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا' جن کا شمار ان کے بڑے متحمل اور مدبر سرداروں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو خبر ملی کہ اس مرتبہ سہیل بن عمرو[1] گفتگو کے لئے آئے ہیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ قریش مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔

---

(1) فتح مکّہ کے بعد یہ سہیل بن عمرو بھی ایمان لے آئے اور حضور ﷺ کے صحابی ہونے کے شرف سے مشرف ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ارتداد کا جو فتنہ اٹھا' ←

صلح نامہ کی تحریر۔ شرائط اور چند اہم واقعات

قریش کو بیعت رضوان کی خبر پہنچ چکی تھی جس پر ان میں کافی سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اسی لئے انہوں نے سہیل بن عمرو کو اپنی طرف سے نمائندہ بنا کر بھیجا تاکہ وہ ایسی شرائط پر مصالحت کرلیں جو قریش کے لئے آبرومندانہ ہوں' سبکی کا باعث نہ ہوں۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مصالحت کا عندیہ ظاہر کیا۔ گفت و شنید کے بعد جب طے ہوا کہ صلح نامہ تحریر کرلیا جائے تو نبی اکرم ﷺ نے صلح نامہ تحریر (dictate) کرانا شروع کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کاتب کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سہیل بن عمرو نے فوراً ٹوک دیا کہ نہیں! ہم "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" سے واقف نہیں ہیں' ہم تو ہمیشہ سے "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" استعمال کرتے رہے ہیں لہٰذا یہی الفاظ لکھے جائیں گے' ہم آپ کے الفاظ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ـــــ حضور ﷺ نے فرمایا "ٹھیک ہے' لکھ دو بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ کوئی فرق واقع نہیں ہوتا"۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ لکھو کہ "یہ وہ صلح ہے جو محمدؐ رسول اللہ (ﷺ) اور قریش کے مابین منعقد ہوئی۔" سہیل بن عمرو نے فوراً دوسرا اعتراض جڑ دیا کہ "محمدؐ رسول اللہ" کے الفاظ نہیں لکھے جاسکتے۔ اس لئے کہ اسی بناء پر تو ہمارا سارا تنازعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ صلح نامہ کے نیچے فریقین کے دستخط ہوں گے تو یہ پوری عبارت گویا دونوں کے مابین متفق علیہ ہوگی' اور اس میں اگر آپؐ کا نام رسول اللہ لکھا ہوا ہے تو گویا ہم نے آپ کو رسول اللہ مان لیا۔ پھر تو ہمارے اور آپ کے مابین کوئی جھگڑا اور کوئی تنازعہ ہی باقی نہ رہا۔ پھر صلح کا کیا

← اس کے اثرات مکہ تک بھی پہنچے لیکن سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نہ صرف خود ثابت قدم اور اسلام پر قائم رہے بلکہ آپ چونکہ نہایت شعلہ بیان خطیب بھی تھے' لہٰذا انہوں نے اپنے مؤثر و مدلل خطبات کے ذریعہ مکہ والوں کو اس فتنہ ارتداد سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

سوال! پس آپؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہ نہیں لکھا جائے گا"۔ سہیل بن عمرو کا یہ اعتراض قانونی اعتبار سے درست (valid) تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے وہ کتنے ذہین اور مدبر شخص تھے ـــــ نبی اکرم ﷺ نے اس اعتراض پر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم مانو یا نہ مانو' میں اللہ کا رسول ہوں۔

حضرت علیؓ کا طرزِ عمل

نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "علی! محمد رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھ دو" (ﷺ)۔ حضرت علیؓ نے جواب میں عرض کیا کہ "حضورؐ! یہ کام میں نہیں کر سکتا"۔ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کی حکم عدولی کر رہے ہیں کہ حضورؐ فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نہیں مٹا سکتا۔ مگر ایسا ہرگز نہیں' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو حضورؐ کا نام لکھنے کے بعد اسے مٹانا سُوءِ ادب خیال کرتے تھے۔ بہرحال حضورؐ نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کہاں ہیں وہ الفاظ؟ کیونکہ آپ ﷺ تو اُمّی تھے' دنیوی طور پر لکھنا پڑھنا آپؐ نے نہیں سیکھا تھا۔ حضرت علیؓ نے وہ مقام بتایا اور حضور ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے وہ الفاظ مٹا دیئے۔ پھر وہاں لکھا گیا کہ یہ معاہدہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب اور قریش کے مابین طے پایا۔

معاہدہ کی شرائط

اس معاہدہ کی بعض شرائط نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے بظاہر نہایت سبکی کا باعث اور توہین آمیز تھیں۔ سہیل نے سب سے پہلے تو یہ شرط پیش کی کہ ہم یہ برداشت کر ہی نہیں سکتے کہ اس سال مسلمان عمرہ کریں۔ اس سال عمرہ کرنے کی اجازت دینے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ پورے عالم عرب میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ محمد (ﷺ) کی بات پوری ہو گئی اور قریش کو جھکنا پڑا اور ہتھیار ڈالنے پڑے۔ لہٰذا اس سال تو آپؐ کو یہیں سے واپس جانا ہوگا۔ البتہ اگلے سال آپؐ

تشریف لے آیئے' ہم تین دن کے لئے مکّہ کو خالی کر دیں گے' ہم پہاڑوں پر چلے جائیں گے اور مکّہ آپؐ کی disposal پر ہو گا۔ آپؐ وہاں رہئے اور عمرہ کیجئے' مکّہ والے وہاں رہیں گے ہی نہیں تاکہ کوئی شخص جذبات سے مشتعل ہو کر کوئی اقدام نہ کر بیٹھے۔ اس تصادم کے امکان کو بھی روک دیا جائے گا۔ البتہ آپؐ کے ساتھ تلواریں اگر ہوں گی تو وہ نیام میں ہوں گی اور نیام بھی تھیلوں میں بند ہوں گے۔ تھیلے احرام کی حالت ہی میں ہاتھ میں رہیں گے۔ یہ نہیں ہو گا کہ تلواریں نیام میں ساتھ لٹکی ہوئی ہوں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ دس سال تک ہمارے اور آپؐ کے مابین بالکل امن رہے گا' کوئی جنگ نہیں ہو گی۔ تیسری شرط یہ طے ہوئی کہ عرب کے دوسرے قبائل میں سے جو چاہے ہمارا حلیف بن جائے اور جو چاہے آپؐ کا حلیف بن جائے۔ فریقین کے حلیف بھی امن و امان سے رہیں گے اور ان کے مابین بھی جنگ و جدال بالکل نہیں ہو گی ـــــ بنو خزاعہ کے سردار بدیل بن ورقہ نے وہیں پر اعلان کیا کہ ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں۔ ایک دوسرا قبیلہ بنو بکر' جس کو بنو خزاعہ سے پرانی دشمنی تھی' اس نے فوراً دوسرا رُخ اختیار کر لیا کہ ہم اس معاہدہ کی رو سے قریش کے حلیف ہیں ـــــ معاہدہ کی چوتھی شرط مسلمانوں کے لئے بظاہر بہت توہین آمیز اور دل آزاری کا باعث تھی۔ وہ یہ کہ اگر مکّہ کا کوئی شخص اپنے والی یا سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا تو مسلمانوں کو اسے واپس لوٹانا ہو گا' لیکن مدینہ سے اگر کوئی شخص مکّہ آ جائے گا تو اسے ہم واپس نہیں کریں گے۔ یہ بڑی غیر منصفانہ (un-equal) شرط تھی جس پر سہیل بن عمرو کا اصرار تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر بڑے جز بز ہوئے اور ان کے جذبات میں جوش و ہیجان پیدا ہوا کہ ہم یہ صورت کیوں گوارا کر رہے ہیں؟ ہم دب کر اور گر کر کیوں صلح کریں؟ ہم اِس وقت چودہ سو کی تعداد میں موجود ہیں اور ہمیں تو شہادت کی موت مطلوب ہے' ہم بیعت علی الموت کر چکے ہیں اور ہم سب کے سب کلمۂ حق کے لئے اپنی گردنیں کٹوانے کے لئے تیار ہی نہیں بے تاب ہیں۔ لہٰذا ہم ان شرائط پر صلح کیوں کریں جو سہیل منوانا

چاہتے ہیں؟ یہ بظاہر احوال گر کر اور دب کر صلح کرنے کے مترادف معاملہ تھا ـــــ صحابہ کرامؓ کے یہ جذبات تھے لیکن سب کے سب مہر بلب تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب

یہ وہ لمحات ہیں جن کے متعلق ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبات کا کیا عالم ہو گا! یہ وہ وقت ہے کہ دینی حمیت و غیرت کے باعث حضرت عمرؓ کا اضطراب اتنا بڑھا کہ ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر حضورؐ سے وہ مکالمہ کیا جو سیرت کی تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمرؓ کو قدرت کی طرف سے جلالی طبیعت ودیعت ہوئی تھی۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد آپؓ کی اس کیفیت میں کافی اعتدال آگیا تھا لیکن کبھی کبھار دین کی حمیت کے باعث اس جلالی طبیعت کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ دراصل یہی سبب تھا کہ انہوںؓ نے ذرا تیکھے انداز میں نبی اکرمؐ سے اس موقع پر گفتگو کی، جس کا انؓ کو ساری عمر تاسف رہا ہے اور انہوںؓ نے اپنے اس انداز گفتگو کے کفارہ کے طور پر نہ معلوم کتنی نفلی عبادات کی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "حضورؐ کیا آپؐ حق پر نہیں ہیں اور کیا آپؐ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے جواب میں ارشاد فرمایا "یقیناً میں حق پر ہوں اور میں اللہ کا نبی ہوں۔" پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ "حضورؐ! پھر ہم اس طرح کا معاملہ کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اللہ ہمارے ساتھ نہیں ہے؟؟" حضورؐ نے پھر مسکراتے ہوئے ہوئے فرمایا "اللہ میرے ساتھ ہے اور میں اس کا نبی ہوں اور میں وہی کچھ کر رہا ہوں جس کا مجھے حکم ہے"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تبسم کے ساتھ جوابات کا انداز بتا رہا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس انداز تخاطب سے آپؐ قطعاً ناراض نہیں ہوئے تھے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جواب

ظاہر بات ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات سن کر حضرت عمرؓ کو حضورؐ سے تو

مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی' لیکن طبیعت میں جو ایک تلاطم' ایک طوفان اور ایک ہیجانی کیفیت تھی وہ برقرار رہی۔ چنانچہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے جو اُس وقت اس خیمہ میں موجود نہیں تھے۔ انؓ سے بھی اسی نوع کا مکالمہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے کہا "کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اور کیا محمد ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟"۔ انہوں نے فرمایا کہ "کیوں نہیں' یقیناً ہم حق پر ہیں اور حضورؐ اللہ کے رسول ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے پھر وہی بات کی جو حضورؐ سے عرض کر چکے تھے کہ "پھر یہ کیا ہو رہا ہے اور ہم کیوں دب کر صلح کر رہے ہیں؟" اس پر حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں بعینہٖ وہی الفاظ کہے کہ "بے شک ہم حق پر ہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ وہی کرتے ہیں جس کا آپؐ کو حکم ہوتا ہے"۔ یہ ہے مقامِ صدیقیت ــــــ اور یہ کہ نبی اور صدیق کے مزاج میں بہت قرب ہوتا ہے۔

ایک مخصوص گروہ کی اتہام طرازی اور اس کا ازالہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے اس رویہ پر جو بظاہر گستاخانہ معلوم ہوتا ہے ساری عمر پشیمانی اور تاسف رہا اور آپؓ کفارہ کے طور پر ساری عمر متعدد نفلی عبادات کا اہتمام کرتے رہے' لیکن ایک خاص گروہ اس واقعہ کو لے اڑا ہے اور اس کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو متہم کرتا اور سبّ و شتم کا نشانہ بناتا چلا آ رہا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) بڑے گستاخ تھے۔ اس خاص گروہ کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخیاں کرنے اور انہیں متہم کرنے کے لئے اس واقعہ کو بھی نمک مرچ لگا کر خوب اچھالا جاتا ہے۔ مگر وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر اس معنی و مفہوم میں یہ بات لی جائے گی تو گویا بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کی زد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی بھی آ جائے گی کہ انہوں نے بھی اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے حکم سے سرتابی کی۔ حالانکہ دنیا کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ "الامر فوق الادب" یعنی حکم ادب سے بالاتر ہے۔ جب حکم دیا جا رہا ہو تو ادب و تعظیم کا معاملہ پیچھے رہ

جائے گا، حکم پر بہر صورت عمل کیا جائے گا ـــــ لیکن معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نیت میں کوئی خلل تھا اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نیت میں کوئی فتور۔ ان دونوں جلیل القدر اصحابِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے دلوں میں نہ بغاوت و سرتابی کے جراثیم تھے اور نہ ہی گستاخی کا کوئی ارادہ تھا، بلکہ در حقیقت یہ حمیت حق تھی جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر کہ "رسول اللہ" کا لفظ صلح نامہ سے مٹا دو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو گئے کہ "میں تو یہ کام کرنے والا نہیں ہوں"۔ اور اسی حمیت حق کے سبب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا اندازِ گفتگو اختیار کیا۔ ان دونوں حضرات کرام رضی اللہ عنہما کے اس طرز عمل پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کوئی سرزنش فرمائی نہ ہی اظہارِ ناراضگی و ناپسندیدگی فرمایا، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مجھے بتاؤ کہ "رسول اللہ" کے الفاظ کہاں مرقوم ہیں، اور پھر اپنے دست مبارک سے اسے مٹا دیا۔ پہلے ذکر ہو چکا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تیکھے انداز میں کئے گئے تمام سوالات کے جوابات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم کے ساتھ ارشاد فرمائے۔ یہ تمام باتیں اس امر کی علامت ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان حضرات گرامیؓ کے جذبات کی صحیح نوعیت سے بخوبی آگاہ تھے۔

ابوجندلؓ کی آمد

اِدھر جذبات کا یہ عالم تھا اُدھر ان سلگتے ہوئے جذبات پر اس واقعہ نے تیل کا کام کیا کہ سہیل بن عمرو کے صاحبزادے ابوجندل رضی اللہ عنہ مکّہ میں ایمان لا چکے تھے اور سہیل نے ان کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر رکھا تھا۔ سہیل اور قریش کے دوسرے لوگ انؓ کو بہت مارا کرتے تھے تاکہ وہ اس تشدد سے گھبرا کر اپنے آبائی بُت پرستی کے دین کی طرف لوٹ آئیں۔ انہیںؓ جب پتہ چلا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے مقام پر مقیم ہیں جو مکّہ سے چودہ پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے تو انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی بیڑیاں تڑوائیں اور چھپتے چھپاتے حدیبیہ میں

حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ابھی اس معاہدہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ اس موقع پر ابو جندل رضی اللہ عنہ وہاں اس حالت میں پہنچے کہ ان کے ہاتھوں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں' جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ وہؓ آئے اور نبی اکرم ﷺ کے قدموں میں لیٹ گئے۔ سہیل بن عمرو نے فوراً کہا یہ ہے پہلا معاملہ' صلح کی جو شرائط ہمارے مابین طے ہو چکی ہیں ان کے مطابق آپؐ ابو جندلؓ کو میرے حوالے کر دیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "شرائط ضرور طے ہو گئی ہیں لیکن تم ان کو تو ہمارے ساتھ رہنے کی اجازت دے دو"۔ سہیل نے کہا "قطعاً نہیں' اسے آپ کو بہر صورت واپس کرنا ہو گا"۔ حضورؐ نے پھر فرمایا "سہیل تم اس کو یہیں رہنے دو۔" اس نے فوراً کہا کہ "پھر ہمیں کوئی صلح نہیں چاہئے' صلح کی شرائط کالعدم سمجھئے' اب تلوار ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی"۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اچھا تم نہیں مانتے تو ٹھیک ہے' صلح کی شرائط باقی رہیں گی' جنگ سے صلح بہتر ہے"۔ ادھر ابو جندلؓ چیخ رہے ہیں اور اب انہوں نے خیمہ میں موجود مسلمانوں سے استغاثہ کیا کہ "مسلمانو! مجھے کن بھیڑیوں کے حوالہ کر رہے ہو؟" ـــــ اندازہ کیجئے اُس وقت جذبات کا کیا عالم ہو گا! سب کے دل مجروح تھے لیکن جوش سے لبریز تھے۔ سینوں میں دل بے تاب تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذرا سا بھی اشارہ ہو جائے تو تلواریں نیام سے نکل آئیں ـــــ واقعہ یہ ہے کہ یہ مرحلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت شعاری کا بڑا کڑا' بڑا شدید اور بڑا نازک امتحان تھا جس سے اللہ تعالیٰ ان کو گزار رہا تھا۔

نبی اکرم ﷺ کی حضرت ابو جندلؓ کو نصیحت

سہیل بن عمرو کی ضد اور اصرار کو دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ ابو جندلؓ کو سہیل کے حوالہ کر دیا جائے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:
"ابو جندل! صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور دوسروں کے لئے جو ان حالات میں

مظلومانہ طور پر مقید ہیں کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا' ہم صلح کی شرائط طے کر چکے ہیں اور ان کی رو سے ہم پابند ہیں کہ تمہیں واپس کر دیں"۔ چنانچہ سہیل اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ واپس لے گئے۔

صحابہ کرامؓ کا غیر معمولی طرزِ عمل

اب جبکہ صلح ہو گئی' اس پر دستخط ثبت ہو گئے اور سہیل واپس چلے گئے تو نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے فرمایا کہ "اب اٹھو' قربانی کے لئے جو جانور ساتھ لائے ہو ان کی یہیں پر قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو۔" اُس وقت مسلمانوں کے جذبات کا جو عالم تھا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ــــــ ہوا یہ کہ ان میں سے ایک شخص بھی نہیں اٹھا۔ جذبات کی یہ کیفیت تھی کہ گویا ان کے اعصاب و اعضاء بالکل شل ہو گئے اور ان میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی' ان کے دل اس درجہ بجھے ہوئے تھے۔ ان کا جوش و خروش تو یہ تھا کہ وہ جان نثاری اور سرفروشی دکھائیں اور اللہ کے دین کی راہ میں گردنیں کٹوا کر سرخرو ہو جائیں' جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں وارد ہے :

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ○ ﴾

(آیت ۲۳)

"اہل ایمان میں کتنے جواں مرد ہیں کہ جنھوں نے جو عہد اپنے پروردگار سے کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ پس ان میں وہ بھی ہیں جو اپنا ہدیہ جان پیش کر چکے (اپنی نذر اللہ کے حضور میں گزار چکے) اور کتنے ہیں جو منتظر ہیں (کہ کب ہماری باری آئے اور ہم بھی جانیں دے کر سرخرو ہو جائیں) اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔

معلوم ہوا کہ اُس وقت حضرت علی اور حضرت عمر ؓ سے جو جذباتی کیفیت صادر ہوئی وہ صرف ان دونوں کی نہیں تھی بلکہ تمام مسلمانوں کی تھی۔ سب ہی دل شکستہ

تھے۔ یہ منظر ناقابلِ تصور ہے کہ نبی اکرم ﷺ حکم دے رہے ہیں کہ "اٹھو! قربانیاں دے کر احرام کھول دو" ـــــ اور کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھ رہا۔ آپؐ نے دوسری مرتبہ حکم دیا کہ "اٹھو، یہیں قربانیاں کرو اور احرام کھول دو" مگر پھر بھی کوئی نہیں اُٹھا۔ صحابہؓ کے ذہن میں تو یہ تھا کہ ہم مکّہ جائیں گے، کعبہ کا طواف اور سعی کریں گے اور پھر قربان گاہ میں قربانیاں کریں گے ـــــ جو جانور ساتھ ہیں وہ تو ہدی ہے کعبہ کی ـــــ اب یہاں پر ہم قربانیاں کیسے کر دیں۔ حضور ﷺ نے تیسری مرتبہ پھر فرمایا "اٹھو، قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو" مگر کسی نے جنبش نہیں کی۔ یہ اس لئے ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جذباتی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اس صورتِ حال کے لئے ذہناً تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی جانیں دینے اور گردنیں کٹوانے کے لئے تو تیار تھے، لیکن جن شرائط پر صلح ہوئی تھی اسے ان کے اعصاب اور مزاج قبول نہیں کر رہے تھے۔

اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ کا مدبّرانہ مشورہ

روایات میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کچھ ملول ہو کر اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ کا یہ معمول تھا کہ سفر میں ایک زوجہ محترمہ کو ساتھ رکھتے تھے۔ سفر کے موقع پر قرعہ اندازی ہوتی تھی کہ اس مرتبہ کون ساتھ جائے گا۔ اِس سفر میں اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے ساتھ تھیں۔ حضورؐ خیمہ میں تشریف لے گئے اور حضرت اُمِّ سلمہؓ سے ذکر کیا کہ میں نے مسلمانوں سے تین مرتبہ کہا کہ "اٹھو، قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو" لیکن کوئی ایک شخص بھی نہیں اُٹھا ـــــ اس پر انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ زبان سے کچھ نہ فرمایئے، آپؐ خیمہ سے باہر تشریف لے جایئے، قربانی دیجئے اور حلق کرا کے احرام کھول دیجئے ـــــ نبی اکرم ﷺ نے اس مشورہ پر عمل کیا، باہر تشریف لائے، قربانی دی، سر کے بال منڈوائے اور بعدہٗ احرام کھول دیا۔

صحابہ کرامؓ کا ردِّ عمل اور اس کی تاویل

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو اب سب کے سب کھڑے ہو گئے' جو حضرات ہدی کے جانور ساتھ لائے تھے انہوں نے قربانیاں دیں اور تمام صحابہ کرامؓ نے حلق یا قصر کرایا اور احرام کھول دیئے۔

اس صورت حال کی تاویل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ابھی تک ایک حالتِ منتظرہ طاری تھی۔ وہ اس خیال میں تھے کہ شاید صورت حال بدل جائے۔ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئی وحی آجائے!! ــــــ جب تک یہ صورت سامنے نہیں آئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قربانی دینے اور حلق کرانے کے بعد احرام کھول دیا تو اُس وقت تک ان کے ذہنوں میں صورت حال کی تبدیلی کا ایک امکان برقرار تھا کہ جس کے وہ شاید انتظار میں تھے۔ لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دیا تو صحابہ کرامؓ جان گئے کہ یہی آخری فیصلہ ہے۔ چنانچہ حالتِ منتظرہ ختم ہو گئی اور سب نے احرام کھول دیئے۔ عمرہ کی جو نیت کی ہوئی تھی اسے اگلے سال کے لئے مؤخر کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ سے مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔

یہ صلح کن اعتبارات سے فتح مبین تھی!

اس اہم واقعہ کو قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا اور حدیبیہ سے واپسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ "بے شک ہم نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے لئے تابناک اور کھلی فتح کا فیصلہ فرمایا"۔ صلح حدیبیہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جِدّوجُہد کے ضمن میں ایک نہایت اہم موڑ (turning point) کی حیثیت حاصل ہے۔ درحقیقت اس صلح اور معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ قریش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک "طاقت" کی حیثیت سے تسلیم (recognize) کر لیا۔ سیاسیات اور بین الاقوامی معاملات میں دراصل یہی بات فیصلہ کن ہوتی ہے کہ اگر کسی فریق کی قانونی و آئینی حیثیت تسلیم کر لی جائے تو اس کے لئے یہ ایک بہت بڑی کامیابی

ہوتی ہے۔ کیونکہ اس فریق کو بہت سے حقوق و تحفظات حاصل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا قریش کی طرف سے مصالحت پر آمادہ ہو جانے اور ایک باضابطہ تحریری شکل میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ گویا قریش نے یہ تسلیم کر لیا کہ محمد (ﷺ) عرب کی ایک سیاسی اور عسکری طاقت ہیں جن سے انہوں نے صلح کا معاہدہ کیا ہے۔ یعنی قریش کو تسلیم کرنا پڑا کہ محمد (ﷺ) اب ایک ایسی طاقت ہیں جنہیں تسلیم کئے بغیر اب کوئی چارۂ کار نہیں۔ اس صورت حال کے پس منظر میں مدینہ منورہ کی واپسی کے سفر کے دوران سورۃ الفتح کی درج ذیل آیات نازل ہوئیں :

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ . . . ﴾ (آیت ۱۰)

"بے شک جو لوگ (اے محمد ﷺ) آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ (در حقیقت) اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ کے اوپر..."

اور

﴿ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ..... ﴾ (آیت ۱۸)

"(اے نبیؐ) تحقیق اللہ راضی ہو گیا ایمان والوں سے جب وہ بیعت کرنے لگے آپؐ سے درخت کے نیچے....."

اور

﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ ؕ . . . . ﴾ (آیت ۲۷)

"بے شک اللہ نے سچ کر دکھایا اپنے رسول کو خواب حق کے ساتھ۔ تم لازماً داخل ہو کر رہو گے مسجد حرام میں اگر اللہ نے چاہا آرام سے اپنے سروں

کے بال مونڈتے اور کترتے ہوئے' بے کھٹکے..."

جب یہ آیات نازل ہوئیں اور اہل ایمان کے سامنے ان کی تلاوت کی گئی تو ان آیات نے گویا ان کے زخمی دلوں پر مرہم کے پھاہے کا کام کیا۔ اہل ایمان جس چیز کو اپنے خیال میں شکست سمجھتے تھے' اللہ تعالیٰ نے اس کو فتح مبین قرار دیا۔ اس سے مسلمانوں کے دل مسرت و شادمانی سے باغ باغ ہو گئے۔ صحیح مسلم میں روایت موجود ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے پہلے خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان کو بتایا کہ یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے پہلے تو کچھ تعجب کا اظہار کیا لیکن جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دیا ہے تو ان کے دل بے قرار کو بھی قرار آگیا اور وہ بھی شاداں و فرحاں ہو گئے۔

حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کا دوسرا اقدام

نبی اکرم ﷺ نے معاہدہ کی شرط کے مطابق اور سہیل بن عمرو کے اصرار پر ابو جندل رضی اللہ عنہ کو کفار کے حوالہ کر دیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ رضی اللہ عنہ اپنی قید سے دوبارہ نکلے۔ مدینہ منورہ تو اس لئے نہیں گئے کہ انہوں رضی اللہ عنہ نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ تو معاہدہ کی وجہ سے پابند ہیں لہٰذا آپ تو مجھے دوبارہ واپس بھجوا دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بحیرہ احمر کا رخ کیا اور ساحل کے قریب جنگل میں پناہ لی۔ اس کے بعد ایک اور صحابی عتبہ بن اسید رضی اللہ عنہ' جو اپنی کنیت ابو بصیر کے حوالے سے زیادہ مشہور ہیں' وہ بھی مکہ والوں کی قید سے چھٹکارا پا کر مدینہ پہنچے۔ ان کے مدینہ پہنچتے ہی مکہ سے دو اشخاص ان کے پیچھے پہنچے اور حضور ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو اپنے معاہدے کی رُو سے ہمارے حوالے کیجئے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو واپس جانے کا حکم دیا اور انہیں رضی اللہ عنہ ان دونوں ایلچیوں کے حوالے کر دیا۔ ابھی یہ تینوں ذوالحلیفہ ہی پہنچے تھے کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے موقع پا کر انہی دو میں سے ایک کی تلوار پر قبضہ کر کے اس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا مدینہ کی طرف سرپٹ بھاگا۔ پیچھے پیچھے ابو بصیر رضی اللہ عنہ بھی مدینہ پہنچ گئے۔

مکّہ والا حضورؐ سے فریاد کر رہا تھا کہ ابو بصیرؓ نے آکر عرض کیا: حضورؐ آپ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا' میں نے تو اب ایک کو قتل کر کے آزادی حاصل کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص پھر کہیں جنگ کی آگ نہ بھڑکا دے' کوئی ہے جو اس کو قابو میں کرے! یہ سننا تھا کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ وہاں سے بھاگے اور مدینہ سے نکل کر بحرِ احمر کے ساحلی جنگل میں جا کر حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل گئے۔ اس کے بعد جب مکّہ کے بے کس اور مظلوم مسلمانوں کو پتہ چلا کہ جان بچانے کا ایک دوسرا ٹھکانا بن گیا ہے تو چوری چھپے مکّہ سے فرار ہو کر مدینہ کا رخ کرنے کے بجائے یہاں پناہ کیلئے پہنچنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں ایک اچھی خاصی جمعیت فراہم ہو گئی۔ اب انہوں نے قریش کے ان تجارتی قافلوں پر جو شام کیلئے بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے حملے شروع کر دیئے اور قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا' اس لئے کہ یہ لوگ مدینہ میں تو تھے نہیں لہٰذا حضور ﷺ کی صلح کی شرائط کے پابند نہیں تھے۔ تجارتی قافلوں کے یہ راستے قریش کی معیشت کیلئے شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے حملوں اور لوٹ مار کے ہاتھوں مجبور ہو کر قریش کا ایک وفد ان کی طرف سے تحریر لے کر مدینہ آیا کہ معاہدہ کی اس شرط کو ہم خود واپس لیتے ہیں۔ اب مکّہ سے جو بھی آپؐ کے پاس مدینہ آکر آباد ہونا چاہے وہ آسکتا ہے' ہم اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ آپؐ ابو جندلؓ' ابو بصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کو مدینہ بلا لیجئے ـــــ حضور ﷺ نے ان کو فرمان بھیجا اور وہ سب کے سب مدینہ آکر آباد ہو گئے اور قریش کے قافلوں کا راستہ بدستور محفوظ و مامون ہو گیا۔

الغرض کہ صلح کی اس شق سے جو اہل ایمان کو سب سے زیادہ شاق گزری تھی خود قریش کو تائب ہونا پڑا۔ گویا ﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا﴾ کا ایک نظارہ بہت ہی جلد مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ـــــ اور نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر حضرت ابو جندلؓ کو واپس کرتے ہوئے جو الفاظ مبارکہ فرمائے تھے کہ : ((یا ابا جندل اصبرۡ وَاحتسب' فِاِنَّ اللّٰہ جاعلٌ لک و لمن معک من المُستضعفین

فرجًا و مخرجًا)) "اے ابو جندل! صبراور ضبط سے کام لو' اللہ تمہارے لئے اور تمہارے ساتھ دوسرے ضعیفوں اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکال دے گا" تو نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ایک حقیقی واقعہ کی شکل میں متشکل ہو کر نگاہوں کے سامنے آگیا۔

صلح حدیبیہ کے ثمرات

اس صلح کے بعد نبی اکرم ﷺ کو یک سو ہو کر اپنی دعوتی سرگرمیوں پر پوری توجّہ دینے کا موقع مل گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ اصحابِ صُفّہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی حضور ﷺ نے ان کے وفود بنا بنا کر مختلف قبائل کی طرف بھیجنے شروع فرمائے۔ مزید برآں اب تک مسلمان اور مشرکین کا آپس میں کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس صلح کے بعد یہ روک ٹوک اُٹھ گئی تو آمد و رفت شروع ہوئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات و روابط کی وجہ سے کفّارِ مکّہ مدینہ منورہ آتے' وہاں طویل عرصہ تک قیام کرتے۔ اس طرح مسلمانوں سے میل جول رہتا اور باتوں باتوں میں اسلام کی دعوتِ توحید اور دیگر عقائد و مسائل کا تذکرہ اور ان پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ ہر مسلمان اخلاص اور حسنِ عمل کا پیکر' نیکو کاری' حسنِ معاملات اور پاکیزہ اخلاق کی زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکّہ جاتے تھے' ان کی صورتیں' ان کے اعمال' ان کے اخلاق اور ان کے معاملات یہی مناظر پیش کرتے۔ ان اوصاف کی وجہ سے مشرکینِ مکّہ کے دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچے چلے آتے۔ الغرض اس صلح کے نتیجہ میں اسلام جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگا۔ مؤرخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ اس صلح سے لے کر فتح مکّہ تک اس کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ اس سے قبل نہیں لائے تھے۔

خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا قبولِ اسلام

صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے "فتح مبین" قرار دیا ہے' لیکن یہ اجسام کی نہیں

قلوب کی فتح و تسخیر کا معاملہ تھا۔ اس مرحلہ پر اسلام کو اپنی دعوت کی اشاعت کے لئے امن در کار تھا جو اس صلح سے حاصل ہو گیا۔ دعوتِ توحید کی وسعت کو دیکھ کر خود قریش یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ ہماری شکست اور جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی فتح ہے۔ صلح حدیبیہ سے قبل قریش اور اہل ایمان کے مابین ہونے والے معرکوں میں قریش کی صفوں میں ایک جنگجو اور باصلاحیت شہسوار کی حیثیت سے خالد بن ولید کا نام ممتاز نظر آتا ہے۔ جنگ کے دوران گھڑسوار دستوں کی قیادت انہی کے سپرد رہتی تھی۔ غزوۂ احد کے موقع پر ان ہی کی تدبیر سے قریش کی شکست فتح میں بدل گئی تھی اور مسلمانوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش نے گھڑسوار دل کا ایک دستہ ان کی زیر کمان نبی اکرم ﷺ کا راستہ روکنے کے لئے بھیجا تھا۔ آپؐ کو اطلاع مل گئی اور آپؐ نے راستہ بدل دیا' ورنہ خالد بن ولید تو حضورؐ کا راستہ روکنے کے لئے رابغ سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر قیام کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جگہ جگہ پڑاؤ ڈال رکھے تھے۔ خالد بن ولید کو جب پتہ چلا تو وہ بھی اپنے گھڑسواروں کے دستہ کے ساتھ پلٹ کر حدیبیہ پہنچ گئے۔

یہاں پہنچ کر خالد بن ولید کی طرف سے ایک انوکھے طرز عمل کا مظاہرہ ہوا۔ یہ ایک ایسے پڑاؤ پر پہنچ گئے جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو اڑھائی سو کی نفری فروکش تھی۔ خالد نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح یہ اہل ایمان مشتعل ہو جائیں اور کسی مسلمان کا ایک مرتبہ ذرا ہاتھ اُٹھ جائے۔ قریش کی کچھ روایات تھیں جن سے انحراف خالد کے لئے ممکن نہ تھا۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم احرام کی حالت میں تھے اور ان کی قدیم روایات چلی آرہی تھیں کہ محرم پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے' اس لئے خالد بن ولید جنگ کی پہل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے اشتعال انگیزی کی حتی الامکان کوشش کی۔ وہ اپنے گھوڑے لے کر بار بار صحابہؓ کی اس جماعت پر ایسے چڑھ چڑھ کر آئے جیسے ان کو گھوڑوں کے سُموں سے کچل دیں گے۔ انہوں نے کئی بار اس عمل کو دہرایا' لیکن جو حکم تھا جناب محمدؐ رسول اللہ

ﷺ کا صحابہ کرامؓ اس پر کاربند رہے۔ نہ کوئی ہراساں ہوا' نہ کوئی بھاگا اور نہ ہی کسی نے مدافعت کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ نظم وضبط کے اس مشاہدہ کا خالد بن ولید پر اتنا گہرا اثر ہو چکا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکے اور ان کا گھائل دل بالآخر مسخر ہوا' جس کا ظہور صلح حدیبیہ کے بعد ہوا اور وہ مشرف بہ ایمان ہونے کے لئے عازمِ مدینہ ہوئے۔ ایمان لانے کے بعد یہی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ "سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ" قرار پائے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ جب سوئے مدینہ چلے تو راستہ میں حضرت عمرو بن العاص مل گئے جو قریش کے ایک اعلیٰ مدبّر' شجاع و دلیر اور فنون حرب کے بہت ماہر تسلیم کئے جاتے تھے۔ یہی وہ صاحب تھے جن کو ۵ نبوی میں حبشہ ہجرت کر جانے والے مہاجرین کی بازیابی کے لئے قریش نے سفیر بنا کر جناب نجاشیؓ کے دربار میں حبشہ بھیجا تھا۔ حضرت خالدؓ نے دریافت کیا کہ کہاں کا قصد ہے؟ بولے: اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ جا رہا ہوں۔ میرے دل نے تسلیم کر لیا ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول برحق ہیں اور اسلام اللہ کا نازل کردہ دین ہے۔ حضرت خالدؓ نے کہا: اپنا بھی یہی حال ہے ـــــ چنانچہ قریش کے یہ دونوں مایہ ناز اور جلیل القدر فرزند بارگاہِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں حاضر ہوئے اور دولتِ ایمان سے مشرف ہوئے۔ اور اس طرح وہ جوہر جو اُس وقت تک اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا' اب اسلام کی محبت اور اس کی اشاعت و توسیع میں صرف ہونے لگا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہما) نے دورِ نبوت اور بعد ازاں دورِ خلافت صدیقی و فاروقی میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ رہتی دنیا تک بھلائے نہیں جا سکتے۔ اول الذکر کا دنیا کے عظیم ترین جرنیلوں میں شمار ہوتا ہے۔ دورِ صدیقی میں فتنہ ارتداد کی سرکوبی میں انہوں نے ہی فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح کسریٰ پر ابتدائی کاری ضرب انہیؓ کے ہاتھوں لگی اور انہیؓ کے ہاتھوں قیصر کی سلطنت میں سے شام کا ملک اسلامی قلمرو میں شامل ہوا اور آخر الذکر مصر کے فاتح ہوئے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

ان دو عظیم انسانوں کا قبول اسلام دراصل صلح حدیبیہ ہی کے ثمرات کا مظہر تھا۔

اس صلح حدیبیہ کے ثمرات وفوائد بہت سے ہیں' مختصراً یہ کہ درحقیقت یہ صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ کی تمہید بنی۔ نبی اکرم ﷺ کو ۶ھ سے ۸ھ تک امن وسکون کے جو دو سال ملے اس میں توحید کی انقلابی دعوت نے نہایت سرعت کے ساتھ وسعت اختیار کی اور مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت فراہم ہو گئی۔

بیرون عرب دعوتی خطوط کی ترسیل

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر متعدد سلاطین کو اپنے دعوتی مکتوبات ارسال فرمائے۔ اس سے پہلے آپؐ نے بیرون عرب نہ کوئی نامہ مبارک لکھا اور نہ ہی کوئی ایلچی بھیجا۔ ۷ھ تک حضورؐ کی تمام دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں جزیرہ نمائے عرب کے اندر اندر تھیں' لیکن صلح حدیبیہ کے بعد ۷ھ میں حضور ﷺ نے دعوتی سرگرمیاں عرب کی حدود سے باہر بھی شروع فرمائیں اور آپؐ نے مختلف صحابہؓ کو ایلچی بنا کر عرب کے اطراف وجوانب میں تمام سربراہان سلطنت کی جانب بھیجا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔

صلح حدیبیہ کے بعد اب حضورؐ کی دعوتی سرگرمیاں دو شاخوں میں بٹ گئیں۔ ایک اندرونِ ملک عرب اور دوسری بیرونِ ملک عرب ــــ آخر الذکر مرحلہ انقلابِ محمدیؐ علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا ساتواں مرحلہ ہے۔

ادائے عمرہ

اگلے سال ذیقعدہ ۷ ھ میں نبی اکرم ﷺ نے عمرۂ قضا ادا فرمایا۔ آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ جو اصحاب پچھلے سال حدیبیہ میں موجود تھے ان میں سے کوئی رہ نہ جائے' سب کے سب چلیں۔ چنانچہ اس دوران جو لوگ فوت ہو گئے تھے ان کے سوا سب نے آپؐ کی پکار پر لبیک کہا اور عمرے کی سعادت حاصل کی۔ صلح حدیبیہ میں طے شدہ شرط کے مطابق نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جلو میں

حالتِ احرام میں مکہ تشریف لائے۔ حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ باآوازِ بلند تلبیہ کہتے ہوئے حرم شریف کی طرف بڑھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے اونٹ کی مہار پکڑے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔ ان اشعار کو امام ترمذیؒ نے شمائل میں نقل کیا ہے :

خلُّوا بنی الکفّار عن سبیله
الیوم نضربکم علٰی تنزیله
ضربًا یزیل الهام عن مقیله
ویذهل الخلیل عن خلیله

"کافرو! آج سامنے سے ہٹ جاؤ۔ آج تم نے اترنے سے رو کا تو ہم تلوار کا وار کریں گے۔ وہ وار جو سر کو خوابگاہِ سر سے الگ کردے اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلادے۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جم غفیر تھا اور وہ کعبہ شریف کی دید سے شاد کام ہو رہے تھے اور عمرہ ادا کرنے کی تمنا و آرزو کو پورے جوش و خروش اور چشم تر سے بجالا رہے تھے۔ شرط کے مطابق حضورؐ اور صحابہؓ تین دن تک مکہ میں مقیم رہے۔ قریش کے تمام بڑے بڑے لوگ مکہ سے نکل گئے کہ نہ ہم اہل ایمان کو دیکھیں نہ ہمارا خون کھولے اور نہ اس کے نتیجے میں کوئی تصادم اور حادثہ وقوع پذیر ہو۔ لہٰذا وہ سب کے سب پہاڑوں پر چلے گئے۔

قریش کی شکست خوردگی

حقیقی نہیں تو معنوی طور پر یہ قریش کی زبردست شکست تھی اور حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ادائے عمرہ سے ان کی ساکھ کو بڑا شدید نقصان پہنچا تھا۔ کیونکہ اُس وقت صورت حال یہ تھی کہ اگرچہ عرب میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی لیکن پورے عرب کی سیاسی' مذہبی اور معاشی سیادت و قیادت قریش کے ہاتھ میں تھی۔ گویا باقاعدہ اور تسلیم شدہ نہ سہی لیکن بظاہر احوال درحقیقت (de facto)

قریش کو پورے عرب پر ایک نوع کی حکمرانی حاصل تھی۔ اگرچہ کوئی باضابطہ اعلان شدہ (declared) حکومت نہیں تھی اور کوئی تحریری معاہدہ یا دستور و آئین موجود نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہاں قبائلی نظام تھا' لیکن قدیم روایات موجود تھیں جس کے مطابق معاملہ چل رہا تھا۔ جیسا کہ آج تک برطانیہ کا کوئی تحریری دستور (Written Constitution) موجود نہیں ہے' بلکہ روایات کی بنیاد پر ان کا معاملہ چل رہا ہے' کم و بیش یہی معاملہ اہل عرب کا تھا' جس کی رُو سے گویا قریش عرب کے حکمران تھے ـــــ کعبۃ اللہ کے باعث مذہبی سیادت ان کے پاس تھی۔ معاشی اعتبار سے نہایت خوشحال تھے۔ ان کے قافلوں پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا تھا' اس لئے کہ ہر قبیلہ کا "خدا" بُت کی شکل میں بطور یرغمالی قریش کے پاس رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ قریش کو پورے عرب پر جو سیادت و قیادت حاصل تھی وہی اسلامی انقلاب کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ لہٰذا یہ وجہ تھی کہ ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے سب سے زیادہ ان ہی کے خلاف اقدامات فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین OO

خطابِ ہشتم

✸

اندرونِ عرب انقلاب کی تکمیل

فتح خیبر اور فتح مکّہ

✸

جَاءَ الْحَقُّ

وَزَهَقَ الْبَاطِلُ

إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

★

- یہود کے تین قبیلے
- بنو قینقاع کا معاملہ
- بنو نضیر کا معاملہ
- بنو قریظہ کا معاملہ اور ان کا انجام

★

فتح خیبر

★

صلح حدیبیہ کا خاتمہ اور فتح مکہ

- بنو خزاعہ پر بکر کی تاخت
- بنو خزاعہ کی دربارِ نبویؐ میں فریاد
- قریش کا ردِ عمل
- نبی اکرمؐ کی تیاریاں اور ایک بدری صحابیؓ کی غلطی
- مکہ کی جانب کوچ
- ابوسفیانؓ کا ایمان اور اعزاز و اکرام
- 'یوم الملحمۃ' نہیں 'یوم المرحمۃ'!
- فتح مبین کی تکمیل اور بت شکنی!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیاتِ قرآنی' احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

نبی اکرم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے وقت وہاں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع' بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ حضورؐ نے مدینہ تشریف لاتے ہی انہیں ایک معاہدہ میں جکڑ لیا تھا[1]۔ اس معاہدے کی وجہ سے یہ قبیلے کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں آسکے' لیکن وہ پس پردہ ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے۔ مدینہ میں فروغِ اسلام اور انصار کے دونوں قبیلوں اور مہاجرین کو باہم شیروشکر دیکھ دیکھ کر صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنا شروع ہوا۔ پھر شعبان ۲ھ میں تحویلِ قبلہ کے واقعہ نے ان یہودیوں کو سخت برہم کر دیا اور ان کی ناراضگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ چنانچہ اب وہ کھلم کھلا اسلام پر زبانِ طعن دراز کرنے اور انصار کو دین اسلام سے بدگمان اور برگشتہ کرنے کی مہم زور و شور سے چلانے لگے۔ اس سے قبل یہ کام وہ دھیمی رفتار سے کرتے رہتے تھے۔

---

(۱) "ابن ہشام" نے یہ پورا معاہدہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :
۱) خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا' اب بھی قائم رہے گا۔ (۲) یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی معاملات سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ (۳) یہود اور مسلمان دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔ (۴) یہود یا مسلمانوں کو کسی بیرونی فریق سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔ (۵) کوئی فریق قریش کو امان نہیں دے گا۔ (۶) مدینہ پر کوئی حملہ ہو گا تو دونوں فریق ایک دوسرے کے شریک ہو کر جنگ کریں گے۔ (۷) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرلے گا تو دوسرا بھی اس صلح میں شریک ہو گا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہو گی۔ (مرتب)

بنو قینقاع کا معاملہ

غزوۂ بدر کے متصلاً بعد شوال ۲ھ میں بنو قینقاع کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ یہ پیشے کے اعتبار سے زرگر تھے اور ان کے پاس جنگی اسلحہ بہت تھا۔ دوسرے یہودی قبیلوں کے مقابلہ میں یہ جری' بہادر اور شجاع بھی تھے۔ اسلام کی ترقی کو دیکھ کر وہ زیادہ دیر تک ضبط نہیں کر سکے۔ غزوۂ بدر کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اقدام کیا اور اعلانِ جنگ کی جرأت کی۔ ہوا یہ کہ ایک انصاریؓ کی نقاب پوش بیوی بنو قینقاع کے ایک یہودی کی دوکان پر آئیں تو یہودیوں نے ان کی بے حرمتی کی۔ ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بے تاب ہو گیا اور اس نے یہودی کو مار ڈالا۔ یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو آپؐ بنفسِ نفیس ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ "اللہ سے ڈرو' ایسا نہ ہو کہ بدر والوں کی طرح تم بھی عذاب میں مبتلا کر دیئے جاؤ"۔ جواب میں یہودیوں نے کہا کہ "ہم قریش نہیں ہیں' ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی کس شے کا نام ہے۔ اور ایسا ہی ہے تو ہم اعلانِ جنگ کرتے ہیں' دنیا دیکھ لے گی کہ بہادر کون ہے!"۔ اس طرح ان کی طرف سے نقضِ عہد اور اعلانِ جنگ ہو گیا۔ مجبور ہو کر نبی اکرم ﷺ نے ان پر چڑھائی کی۔ وہ قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ دن تک محاصرہ رہا۔ بالآخر وہ اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ بھی کریں گے انہیں قبول ہو گا۔ حضورؐ نے نرمی اور رافت سے کام لیا اور فیصلہ فرما دیا کہ وہ اونٹوں پر جتنا سامان لے جا سکتے ہیں لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں' وہ اب مدینہ میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ مال و اسباب لے کر جلا وطن ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق ان میں سے کچھ لوگ خیبر میں جا کر آباد ہو گئے جو مدینہ سے دو سو میل شمال کی طرف یہودیوں کا ایک بہت مضبوط گڑھ تھا۔ یہ بڑا سرسبز اور زرخیز علاقہ تھا۔

بنو نضیر کا معاملہ

غزوۂ احد کے بعد اسی نوع کا معاملہ ربیع الاول ۴ھ میں یہود کے دوسرے قبیلے بنو نضیر کے ساتھ ہو گیا۔ یہ قبیلہ عرب کے ایک مضبوط قبیلہ "طے" کا حلیف تھا۔ قبیلہ طے کے اشرف نے اس یہودی قبیلہ کے سردار ابو رافع کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ ابو رافع کا لقب تاجر الحجاز تھا' کیونکہ وہ بڑا مالدار تھا۔ کعب اسی اشرف کا بیٹا اور ابو رافع کا نواسہ تھا۔ اس دو طرفہ رشتہ داری کی وجہ سے اس کا یہود اور عرب سے برابر کا تعلق تھا۔ یہ بڑا قادر الکلام شاعر تھا' جس کی وجہ سے اس کا اثر گہرا تھا۔ کعب بن اشرف کو اسلام سے سخت عداوت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزوۂ بدر میں قریش کے سرداروں کے قتل ہونے کا اسے نہایت صدمہ تھا۔ چنانچہ یہ مکّہ گیا اور مقتولین بدر کے پُر درد مرثیے پڑھے جن میں انتقام کی ترغیب تھی۔ وہ یہ مرثیے بہت سوز کے ساتھ پڑھتا' خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا۔ الغرض قریش کو مدینہ پر انتقامی طور پر چڑھائی کرنے کی ترغیب میں اس نے نہایت مؤثر کردار ادا کیا تھا۔ پھر جب وہ مدینہ واپس آیا تو نبی اکرم ﷺ کی ہجو کہنے لگا اور یہودیوں کو اسلام کے خلاف بھڑکانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی دولت مندی کے بل پر منافقین کو اپنا ہم خیال بنانے لگا اور ضعیف الایمان لوگوں پر اثر انداز ہونے لگا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سازش تیار کی کہ چپکے سے نبی اکرم ﷺ کو قتل کرا دے۔ چنانچہ اس نے ایک روز آپؐ کو دعوت میں بلایا اور اپنے چند لوگوں کو مقرر کر دیا کہ وہ یک بارگی حملہ کر کے حضورؐ کو شہید کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اپنے نبی ﷺ کو اس سازش سے مطلع فرما دیا۔ اس کی فتنہ انگیزی کو دیکھ کر حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ نے بنو نضیر میں غیظ و غضب کی آگ کو مزید بھڑکا دیا۔

مزید برآں وادی نخلہ میں قبیلہ بنو عامر کے جو دو اشخاص قتل ہوئے تھے ان کا خون بہا ابھی تک واجب الادا تھا۔ اس کا ایک حصہ معاہدے کی رو سے یہود کے قبیلے بنی نضیر پر باقی تھا۔ اس کے مطالبہ کے لئے نبی اکرم ﷺ بنو نضیر کے پاس تشریف لے

گئے۔ انہوں نے تھوڑی سی ردّوقدح کے بعد بظاہر حضور ﷺ کی بات تسلیم کرلی۔ لیکن انہوں نے درپردہ ایک شخص کو مقرر کر رکھا تھا کہ وہ چپکے سے حضورؐ پر بالاخانہ سے پتھر گرادے۔ اس لئے کہ حضورؐ بالاخانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے گفتگو فرما رہے تھے۔ حضورؐ کو اس سازش کا علم ہوگیا اور آپؐ فوراً مدینہ واپس چلے آئے۔

ادھر قریش کی جانب سے بنو نضیر کے پاس پیغام پر پیغام آ رہے تھے کہ تم محمدؐ (ﷺ) کو قتل کردو' ورنہ ہمیں جب بھی موقع ملا' جو ضرور مل کر رہے گا' تو ہم تمہارے پورے قبیلہ کو تہ تیغ کردیں گے۔ یہود خود بھی نبی اکرم ﷺ کی دعوتِ توحید کا فروغ دیکھ کر انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے ایک سازش کے تحت نبی اکرم ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپؐ اپنے تیس اصحاب کو ساتھ لے کر آئیں' ہم بھی اپنے علماء واحبار کو جمع کر رکھیں گے۔ آپؐ کی دعوت اور آپؐ پر نازل شدہ کلامِ الٰہی سن کر اگر ہمارے علماء تصدیق کردیں گے تو ہم اسلام قبول کرلیں گے۔ اس پر آپ ﷺ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک نیا معاہدہ لکھ کر نہ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ لیکن بنو نضیر اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔

اسی دوران رسول اللہ ﷺ بنو قریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدیدِ معاہدہ کی فرمائش کی۔ انہوں نے تعمیل کردی۔ اب بنو نضیر کے سامنے گویا ایک نظیر موجود تھی' لیکن اس کے باوجود وہ کسی طرح دوبارہ معاہدہ کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ آخر کار انہوں نے پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر آئیں' ہم بھی اپنے تین عالم لے کر آتے ہیں اور کسی درمیانی جگہ جمع ہوتے ہیں۔ یہ علماء اگر آپؐ پر ایمان لے آئے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ رسول اللہؐ اس کے لئے تیار ہوگئے' لیکن راستے ہی میں آپؐ کو باوثوق ذریعہ سے اطلاع مل گئی کہ بنو نضیر نے خفیہ طور پر انتظام کر رکھا ہے کہ آپؐ جب مقررہ مقام پر پہنچیں تو یکبارگی اور اچانک حملہ کرکے آپؐ کو شہید کردیں۔ چنانچہ یہ اطلاع ملنے کے بعد حضور ﷺ راستہ ہی سے واپس چلے گئے۔ آپؐ نے پھر ان کو پیغام بھیجا کہ یا تو تجدید معاہدہ کرلو یا اپنے سرکردہ علماء کو

لے کر میرے پاس آجاؤ۔ لیکن بنو نضیر نے صاف انکار کر دیا۔
بنو نضیر کی اس سرکشی کے مختلف اسباب تھے۔ وہ دو مضبوط قلعوں میں پناہ گزین تھے جہاں اجناس' پانی اور اسلحہ کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ عبداللہ بن اُبی نے انہیں کہلا بھیجا تھا کہ ہم (یعنی منافقین) اور بنو قریظہ تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے' للذا تم اطاعت نہ کرنا۔ اس صورت حال کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے ان کو زیادہ مہلت دینی مناسب نہیں سمجھی اور ان کے قلعوں پر چڑھائی کر دی۔ پندرہ دن تک محاصرہ جاری رہا۔ بنو نضیر اس انتظار میں رہے کہ عبداللہ بن اُبی اور بنو قریظہ اپنا وعدہ وفا کریں گے' لیکن دونوں دم سادھے تماشا دیکھتے رہے۔ بالآخر بنو قریظہ نے یہ پیش کش کی کہ ہمارے ساتھ بھی بنو قینقاع والا معاملہ کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ کی رافت و رحمت نے یہ پیش کش منظور فرمالی۔ بنو نضیر اپنی گڑھیوں سے اس شان سے نکلے کہ جشن کا گمان ہوتا تھا۔ عورتیں دف بجاتی اور گاتی جاتی تھیں۔ الغرض ان کے قبیلہ کے اکثر لوگ بھی خیبر جا کر آباد ہو گئے۔ خیبر والوں نے ان کے دو معزز سرداروں کا اتنا احترام کیا کہ انہیں خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا۔ یہ واقعہ درحقیقت غزوۂ خیبر کا دیباچہ ہے۔

بنو قریظہ کا معاملہ

اب مدینہ میں یہود کا صرف ایک قبیلہ بنو قریظہ باقی رہ گیا تھا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر' جو ذوالقعدہ ۵ھ میں وقوع پذیر ہوا' اس قبیلہ نے غداری کی۔ بنو نضیر کے سرداروں نے خیبر میں بیٹھ کر قریش اور مدینہ کے اطراف کے غیر مسلم قبائل سے سازباز کی اور ان کو اپنے تعاون کا یقین دلایا جس کے نتیجہ میں بارہ ہزار کا لشکر جرار تین اطراف سے مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر چڑھ دوڑا۔ اس سے بڑا لشکر عرب کی تاریخ میں اس سے پہلے شاید ہی کبھی ترتیب پایا ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے جبلِ اُحد کے مشرقی اور مغربی گوشوں میں خندق کھُدوا

کر مدافعانہ جنگ کے انتظامات فرما لئے تھے۔ مدینہ کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ صرف انہی اطراف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ کفار و مشرکین اس طریق دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انہیں شدید جاڑے کے موسم میں ایک طویل محاصرہ پر مجبور ہونا پڑا۔ اب ان کے لئے ایک ہی چارۂ کار باقی رہ گیا تھا کہ وہ بنو قریظہ کو مدینہ پر جنوب مشرقی گوشے سے حملہ پر آمادہ کر لیں۔ چنانچہ بنو نضیر کے سرداروں نے بنو قریظہ کو نقض عہد پر آمادہ کر لیا اور وہ پشت سے حملہ کی تیاریاں کرنے لگے۔

نبی اکرم ﷺ اس صورت حال سے بے خبر نہیں تھے۔ ادھر منافقین کا گروہ بھی مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے لئے یہ افواہیں پھیلا رہا تھا کہ بنو قریظہ کی طرف سے حملہ ہوا ہی چاہتا ہے جس کی زد میں پہلے ہماری عورتیں اور بچے آئیں گے جو شہر میں بنو قریظہ کی گڑھیوں کے قریب ہی پناہ گزین تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے دو انصاری صحابہ رضی اللہ عنہما کو بنو قریظہ کے عزائم معلوم کرنے اور ان کو سمجھانے کے لئے بھیجا۔ بنو قریظہ نے ان سے صاف کہہ دیا کہ "لا عَقدَ بیننا و بین مُحمد" یعنی ہمارے اور مُحمّد (ﷺ) کے مابین جو معاہدہ تھا وہ ختم ہوا۔ مزید یہ کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی شان میں بڑے گستاخانہ کلمات کہے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ قبیلہ غطفان کے ایک صاحب نعیم بن مسعود جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا ہوا تھا اور وہ غطفان کی طرف سے ان کے لشکر میں شریک تھے، انہوں نے ایک ایسی تدبیر کی کہ بنو قریظہ اور قریش کے درمیان ایک نوع کی بدگمانی پیدا ہو گئی، جس کی وجہ سے بنو قریظہ غداری کے لئے اپنی تمام تیاریوں کے باوجود تذبذب میں رہے اور کوئی اقدام نہ کر سکے۔ اسی دوران ایک رات اللہ کی مدد زوردار آندھی کی صورت میں نازل ہوئی جس نے قریش اور ان کے حلیفوں کے خیموں اور ساز و سامان کو تہس نہس کر ڈالا۔ نتیجتاً صبح ہوتے ہی تمام لشکر منتشر ہو گیا اور تمام قبائل بے نیلِ مرام واپس چلے گئے۔

لشکروں کی واپسی کے بعد نبی اکرم ﷺ ابھی ہتھیار کھول ہی رہے تھے کہ

حضرت جبریلؑ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ ہتھیار اتار رہے ہیں جبکہ ہم نے ابھی تک ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔ آپؐ فوراً تشریف لے جاکر بنو قریظہ کے معاملے کو نمٹائیے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ بنو قریظہ کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اُسی وقت حکم دیا کہ کوئی بھی مسلمان ہتھیار نہ کھولے' سب کے سب جلد از جلد بنو قریظہ کی بستی میں پہنچیں اور کوئی بھی عصر کی نماز وہاں پہنچنے سے قبل نہ پڑھے۔

بنو قریظہ کا انجام

بنو قریظہ کے قلعے بڑے مضبوط تھے' جن میں وہ محصور ہو گئے۔ قریباً ایک ماہ تک محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر تنگ آکر انہوں نے ازخود اس شرط پر ہتھیار ڈالنے اور خود کو نبی اکرم ﷺ کے حوالے کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ ان کے معاملے میں قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم مقرر کیا جائے' وہ جو بھی فیصلہ کریں گے تسلیم کر لیا جائے گا۔ قبیلہ اوس ان کا حلیف رہا تھا اور ان کے مابین مدتوں سے خوشگوار تعلقات چلے آ رہے تھے' لہٰذا ان کو توقع تھی کہ سعد بن معاذ ان کا لحاظ کریں گے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ غزوۂ احزاب میں ایک تیر لگنے کی وجہ سے شدید زخمی تھے اور حضور اکرم ﷺ نے ان کے علاج معالجہ کے لئے مسجد نبوی میں ایک خیمہ لگوا رکھا تھا اور ان کے زخم کو خود اپنے دستِ مبارک سے داغا تھا' انہیں ایک ڈولی میں بنو قریظہ کی بستی میں لایا گیا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے تورات کی رُو سے یہود کی شریعت کے عین مطابق یہ فیصلہ کیا کہ بنو قریظہ کے لڑائی کے قابل تمام مرد قتل کئے جائیں' عورتوں' بچوں اور دیگر مَردوں کو غلام بنایا جائے اور ان کے مال و اسباب کو مال غنیمت قرار دیا جائے [1]۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق ان کے کئی سو جوان قتل

(1) تورات کتاب تثنیہ اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے۔

کئے گئے اور عورتوں بچوں اور دیگر عمر رسیدہ مردوں کو غلام بنالیا گیا' جبکہ ان کا مال و اسباب مالِ غنیمت قرار دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم نے آسمانی فیصلہ کیا۔ یہ تورات کے حکم کی طرف اشارہ تھا۔ بنو قریظہ اگر رسول اللہ ﷺ کو حکم تسلیم کرلیتے اور اپنا معاملہ آپ کے ہاتھ میں دے دیتے تو یقیناً آپ اپنی رافت و رحمت کی وجہ سے وہی فیصلہ فرماتے جو بنو قینقاع اور بنو نضیر کے حق میں فرمایا تھا' لیکن مشیت الٰہی یہی تھی' لہٰذا ان کی مت ماری گئی اور انہوں نے حضور ﷺ جیسے رؤف و رحیم رسول پر عدم اعتماد کیا۔ چنانچہ حیی بن اخطب جو ان تمام فتنوں کا باعث تھا' کے جو آخری الفاظ کتبِ سیرتِ مطہّرہ میں ملتے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے کہ "لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ایک حکم الٰہی تھا جو لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک سزا تھی جو خدا نے بنی اسرائیل پر لکھ دی تھی"۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیّبہ کے دوران اجتماعی قتل اور سخت ترین سزا کا یہی ایک واقعہ ہے' جو بنو قریظہ کے ساتھ پیش آیا۔

فتح خیبر

خیبر پہلے سے ہی عرب میں یہود کا مضبوط ترین گڑھ تھا۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر کے بہت سے لوگ بھی وہیں جا مقیم ہوئے۔ اس طرح یہود کی قوت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر قریش اور دوسرے عرب قبائل کا مدینہ پر اتنی بڑی تعداد میں لشکر کشی کرنے میں خیبر کے یہودی سرداروں کا سب سے زیادہ عمل دخل تھا۔ بارہ ہزار کے لشکر میں کم و بیش دو ہزار یہودی بھی شامل تھے۔ پھر بنو قریظہ کو نقضِ

---

* "جب کسی شہر پر حملہ کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح تسلیم کرلیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے۔ لیکن اگر صلح نہ کریں تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلادے تو جس قدر مرد ہوں' سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے' عورتیں' جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں' سب تیرے لئے مال غنیمت ہوں گے"۔ (مرتب)

عہد اور پشت سے مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے لئے آمادہ کرنے میں بھی انہی یہودی سرداروں کی کوششوں کا فیصلہ کن دخل تھا۔ الغرض عرب کے قبائل خصوصاً قریش کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنے میں خیبر کے سردارانِ یہود ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔

ذوالقعدہ ٦ ھ میں جب قریش سے حدیبیہ کے مقام پر دس سال کے لئے صلح ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو ٦ ھ کے اواخر میں آپؐ نے جزیرہ نمائے عرب میں یہود کی اس طاقت کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ فرمایا جو خیبر کے مقام پر مجتمع ہو گئی تھی۔ قبیلہ غطفان جس کا شمار بھی عرب کے مضبوط قبائل میں ہوتا تھا' کی آبادی خیبر سے متصل واقع تھی اور یہ کافی عرصہ سے خیبر کے یہود کے حلیف تھے۔ خیبر کے رئیس ابو رافع سلام نے جو بنو نضیر سے تعلق رکھتا تھا' لیکن بہت بڑا تاجر اور صاحبِ ثروت ہونے کے باعث خیبر کی سرداری پر فائز تھا' ٦ ھ میں خود جا جا کر قبیلہ غطفان اور آس پاس کے قبائل کو متحد ہو کر اسلام کے خلاف اقدام کے لئے تیار کر لیا تھا اور ایک عظیم لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر لی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کو یہ تمام خبریں مل رہی تھیں۔ رمضان ٦ ھ میں ابو رافع سلام ایک خزرجی انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے بعد خیبر کا اُسیر نامی ایک یہودی مسند سرداری پر فائز ہوا۔ اس نے بھی ابو رافع سلام کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے پوری تیاری کر لی۔ پھر مدینہ کے منافقین بھی یہودِ خیبر کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے تھے اور ان کی ہمت افزائی کرتے تھے کہ مسلمان تمہاری فوجوں کے آگے نہیں ٹھہر سکیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے کوشش فرمائی کہ یہود خیبر سے کوئی معاہدہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے صلح حدیبیہ سے پہلے اور بعد میں کئی سفارتی وفود خیبر کے یہود کے پاس بھیجے لیکن وہ اپنے ارادوں سے باز نہیں آئے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے چھاپہ مار دستے مدینہ کے باہر متفرق چھوٹی چھوٹی آبادیوں پر تاخت کرتے اور غارت گری کے بعد

بھاگ جاتے۔ بالآخر نبی اکرم ﷺ نے ان کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے مقصد کے پیش نظر ذوالحجہ ۶ھ میں مسلمانوں کے ایک لشکر کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ فرمایا۔ لیکن خیبر کا معرکہ ۷ھ کے اوائل میں پیش آیا' کیونکہ اس غزوہ نے کافی طول کھینچا۔ خیبر میں یہود کی بڑی قوت مجتمع تھی' جہاں یکے بعد دیگرے ان کے بڑے مضبوط قلعے تھے۔ چنانچہ ہر قلعہ پر زبردست جنگ ہوئی۔ آخری مضبوط ترین قلعہ (قموص) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ یہود کے بڑے بڑے سردار اِن معرکوں میں مارے جاچکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کامل شکست تسلیم کرلی۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب سے یہود کی عسکری قوت کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔

فتح کے بعد مفتوحہ علاقہ پر قبضہ کرلیا گیا' لیکن یہود کی درخواست پر زمین ان کے قبضہ میں اس شرط کے ساتھ رہنے دی گئی کہ وہ پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کیا کریں گے۔ جب بٹائی کا وقت آتا نبی اکرم ﷺ اپنے کسی صحابیؓ کو بھیجتے' جو آکر غلہ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرکے یہود سے کہا کرتے تھے کہ انتخاب کا حق تمہیں حاصل ہے' جو حصہ چاہو تم لے لو۔ یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ "زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہیں"۔

غزوۂ خیبر پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلموں کو رعایا بنایا گیا۔ گویا صلح حدیبیہ اور یہود کا رعیت کی حیثیت قبول کرنا اس بات کی علامات میں شامل ہیں کہ اسلامی طرزِ حکومت کی بنیاد بھی قائم ہوگئی اور اس کا عملی ظہور بھی شروع ہوگیا ــــــ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت کے آغاز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نبی اکرم ﷺ مرض وفات میں وصیت فرماگئے تھے کہ یہود جزیرہ نمائے عرب میں رہنے نہ پائیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مدعیانِ نبوّت' مانعینِ زکوٰۃ اور فتنۂ ارتداد سے کامل طور پر نمٹنے میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے اس معاملہ کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ اگرچہ خلافتِ صدیقی کے دَور ہی میں یہ تمام فتنے ختم ہو چکے تھے' لیکن ساتھ ہی توحید کی اس انقلابی دعوت کی توسیع کے عمل کا بیرون ملک عرب آغاز ہو چکا تھا اور قیصر و کسریٰ سے

باقاعدہ لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جزیرہ نمائے عرب سے یہود کے مکمل اخراج کا معاملہ دَورِ خلافت صدیقؓ کے بجائے دَورِ خلافت فاروقیؓ کے آغاز میں شروع ہوا اور ایک قلیل عرصہ میں تمام یہود جزیرہ نمائے عرب سے جلاوطن کردیئے گئے۔ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوئی اور ان کو کامل آزادی دی گئی کہ وہ اپنا جملہ منقولہ سازوسامان ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب یہود جیسی سازشی قوم کے وجود سے پاک ہوگیا۔

صلح حدیبیہ کی بدولت قریباً دو سال تک قریش اور اہل ایمان کے مابین امن رہا۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے شہروں میں آتے جاتے رہے اور ان کے مابین روابط قائم ہوئے۔ کفار و مشرکین اہل ایمان کی پاکیزہ سیرت و کردار سے متأثر ہوتے رہے۔ اس دوران اسلام کو نہایت فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما جیسے مردانِ شجاعت حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

صلح حدیبیہ کا خاتمہ اور فتح مکّہ

بنو خزاعہ پر بنو بکر کی تاخت

صلح حدیبیہ کے موقع پر ہی بنو خزاعہ نبی اکرم ﷺ کے حلیف بن گئے تھے اور ان کے حریف بنو بکر قریش کے حلیف ہو گئے تھے۔ ان دونوں میں مدت سے عداوت چلی آرہی تھی اور ان کے مابین لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں۔ صلح حدیبیہ کے باعث قریش اور مسلمانوں کے درمیان امن قائم ہوگیا تو بنو بکر نے سوچا کہ اب بنو خزاعہ سے انتقام لینے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے صلح حدیبیہ کے قریباً دو سال بعد بنو خزاعہ پر رات کی تاریکی میں اچانک حملہ کر دیا۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ قریش کے چند بڑے بڑے سرداروں نے بھی بھیس بدل کر بنو بکر کا ساتھ دیا اور اس طرح اس حملے کے نتیجہ میں

بنو خزاعہ کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ بنو خزاعہ نے حرم میں پناہ لی لیکن بنو بکر کے رئیس نوفل کے اکسانے پر وہاں بھی انہیں نہیں چھوڑا گیا اور عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

صلح حدیبیہ کا خاتمہ

نبی اکرم ﷺ مسجد نبویؐ میں رونق افروز تھے کہ بنو خزاعہ کے چالیس افراد فریاد کرتے اور دہائی دیتے ہوئے وہاں پہنچے کہ ہمارے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے' اب صلح حدیبیہ کی رُو سے اے محمدؐ (ﷺ) آپؐ اس کے پابند ہیں کہ ہمارا بدلہ بنو بکر اور قریش سے لیں[1] نبی اکرم ﷺ کو یہ واقعات سن کر سخت رنج ہوا۔ تاہم حضورؐ نے قریش پر حجت قائم کرنے کے لئے ان کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرائط پیش کیں۔ پہلی یہ کہ مقتولوں کا خون بہا ادا کردو۔ دوسری یہ کہ اگر تم اس کے لئے تیار نہیں ہو تو بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جاؤ تاکہ ہم بنو خزاعہ کے ساتھ مل کر بنو بکر سے بدلہ لے لیں۔ تیسری یہ کہ اگر یہ بھی منظور نہیں ہے تو اعلان کردو کہ صلح حدیبیہ ختم ہو گئی۔

قریش کے جو مشتعل مزاج اور جنگ پسند لوگ (Hawks) تھے' انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے قاصد کی زبانی آپؐ کی شرائط سنتے ہی فوراً کہا کہ ہمیں تو صرف تیسری شرط منظور ہے۔ بس آج سے صلح حدیبیہ ختم!! حضورؐ کے ایلچی یہ جواب سن کر مدینہ واپس چلے گئے۔

---

(1) طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ اس وفد کے قائد کا نام عمرو بن سالم تھا اور اس نے ان الفاظ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں فریاد پیش کی تھی۔

لاھم انی شاھد مُحمدا	اے اللہ! میں محمدؐ (ﷺ) کو
حلف ابینا وابیه الا تلدا	وہ وعدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور
فانصر رسولَ الله نصرا عتدا	ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے۔ اے
وادع عباد الله یاتوا مددا	اللہ کے رسولؐ ہماری اعانت کیجئے اور اللہ

کے بندوں کو پکاریئے' سب مدد کے لئے حاضر ہوں گے۔ (مرتب)

تجدیدِ صلح کے لئے ابوسفیان کی کوششیں

قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کے مدبر اور صلح پسند لوگوں (Doves) کو غلطی کا احساس ہوا۔ ان کو خوب اندازہ تھا کہ اب محمد ﷺ کی طاقت کتنی ہے اور قریش کا حال کیا ہے! ان کی پختہ رائے یہ تھی کہ قریش کسی صورت میں بھی اب اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا مقابلہ کر سکیں۔ اُس وقت ابوسفیان کو قریش کے سردار کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ بہت حقیقت پسند انسان تھے' جذباتی اور مشتعل مزاج نہیں تھے' بلکہ ایک ایسے مدبر انسان تھے جو حقیقی صورت حال کا اندازہ کر کے اس کے مالہ وماعلیہ کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ چند جوشیلے لوگوں سے جذبات میں آ کر بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے' اگر ہم نے صلح حدیبیہ کی تجدید نہ کرائی تو پھر قریش کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہو گی۔ چنانچہ وہ خود چل کر تجدید صلح کی غرض سے مدینہ پہنچے اور وہاں پہنچ کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں تجدید صلح کی درخواست کی' لیکن بارگاہِ رسالت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اب ان کو کوئی ایسی سفارش درکار تھی جو تجدید صلح کی کوشش میں ان کی معاون ہو۔ انہوں نے پہلے حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو بیچ میں ڈالنا چاہا لیکن دونوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک فرمایا : بھلا میں تم لوگوں کے لئے رسول اللہ ﷺ سے سفارش کروں گا؟ خدا کی قسم اگر مجھے لکڑی کے ٹکڑے کے سوا کچھ دستیاب نہ ہو تو میں اسی کے ذریعے تم لوگوں سے جہاد کروں گا"۔ پھر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے' وہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر اُس وقت پانچ برس کی تھی۔ ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے حضرت فاطمہؓ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اگر یہ بچہ اپنی زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا' اور اس بچہ کے یہ کہہ دینے سے نہ معلوم کتنی جانیں بچ جائیں گی۔ جناب سیدہؓ نے فرمایا: بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل؟

بالآخر ابو سفیان ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنی صاحبزادی حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے۔ حضرت اُمِ حبیبہؓ سابقون الاولون میں سے تھیں اور مہاجرینِ حبشہ میں سے تھیں' جہاں وہؓ اپنے شوہر کے ساتھ گئی تھیں جو ایمان لا چکے تھے۔ وہ شراب کے بہت رسیا تھے۔ حبشہ جا کر وہ مرتد ہو گئے اور عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ لہٰذا اُم حبیبہؓ ان کے عقد نکاح سے آزاد ہو گئیں۔ نبی اکرم ﷺ کو جب یہ اطلاع ملی تو آپؐ نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور نجاشیؒ نے حضورؐ کے وکیل کی حیثیت سے نکاح پڑھایا تھا اور ان کا مہر ادا کیا تھا۔ بعدہ وہ اُمّ المومنینؓ کی حیثیت سے مدینہ منورہ تشریف لے آئی تھیں۔ اب ابو سفیان کی صاحبزادی حضرت اُمِ حبیبہؓ رسول اللہ ﷺ کے حرم میں تھیں۔ ابو سفیان ایک باپ کی حیثیت سے بیٹی کے پاس پہنچے تاکہ بیٹی سے سفارش کرائیں۔ لیکن ہوا یہ کہ جب وہ ان کے حجرے میں داخل ہوئے تو وہاں نبی اکرم ﷺ کا بستر بچھا ہوا تھا' وہ اس پر بیٹھنے لگے تو حضرت ام حبیبہؓ نے فرمایا کہ اباجان ذرا ٹھہریئے۔ پھر بستر تہہ کر کے کہا کہ اب تشریف رکھئے۔ ابو سفیان نے فوراً سوال کیا کہ بیٹی! کیا تم نے اس بستر کو میرے لائق نہیں سمجھا یا مجھے اس بستر کے لائق نہیں سمجھا؟۔ انہوں نے جواب دیا : اباجان آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں' یہ بستر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا ہے اور آپ مشرک ہیں' نجس ہیں آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتے —— اس بات سے ابو سفیان جتنے خفیف اور خجل ہوئے ہوں گے اور انہوں نے کتنی سبکی محسوس کی ہوگی اس کا ہر شخص اپنے طور پر کچھ نہ کچھ اندازہ لگا سکتا ہے۔ اب انہیں سفارش کا حوصلہ کہاں ہو سکتا تھا' چنانچہ مزید کچھ کہے سنے بغیر مایوس ہو کر واپس ہوئے۔

اب دوبارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور سخت گھبراہٹ اور مایوسی و نا امیدی کی حالت میں کہا : ابو الحسن! مجھے کوئی راستہ بتاؤ۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں نبی اکرم ﷺ سے تو کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا' لیکن میں تمہیں یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ مسجد نبویؐ میں جا کر یہ اعلان کر دو کہ میں نے قریش کے

سردار کی حیثیت سے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔ چنانچہ ابو سفیان نے حضرت علیؓ کے ایماء پر ایسا ہی کیا اور مسجد نبویؐ میں جا کر تجدید صلح کا یک طرفہ اعلان کر دیا کہ میں قریش کا سردار ابو سفیان صلح حدیبیہ کی تجدید کرتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا' لیکن یہ اعلان کر کے وہ فوراً اپنے اونٹ پر سوار ہو کر واپس مکہ روانہ ہو گئے۔

مکہ پہنچنے پر لوگوں نے پوچھا کہ کیا کر کے آئے ہو؟ انہوں نے تفصیل بتائی۔ لوگوں نے کہا : تو کیا محمد (ﷺ) نے اسے نافذ قرار دیا؟ ابو سفیان نے کہا : نہیں۔ لوگوں نے کہا : ہم نہ اسے تجدیدِ صلح سمجھ سکتے ہیں کہ آرام سے سوئیں' نہ جنگ سمجھ سکتے ہیں کہ تیاری کریں۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

نبی اکرمؐ کی طرف سے غزوے کی تیاری اور اخفاء کی کوشش

اُدھر مکہ والے شش و پنج میں تھے کہ ابو سفیان جو کچھ کر کے آئے ہیں اسے کیا سمجھا جائے! اِدھر نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں تیاریاں کرنے کا حکم دے دیا اور اپنے حلیف قبائل کے پاس قاصد بھیج دیئے کہ تیار ہو کر مدینہ آجائیں۔ لیکن یہ احتیاط کی گئی کہ یہ اعلان نہیں فرمایا کہ مکہ کا قصد ہے۔ آپؐ نے یہ بات بالکل مخفی رکھی کہ کدھر جانا ہے! لیکن ایک بدری صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ سے اُس وقت ایک خطا ہو گئی ـــــــ ان کے اہل و عیال اُس وقت تک مکہ میں تھے۔ انہوں نے اندازہ کر لیا کہ حضور ﷺ کا ارادہ مکہ پر چڑھائی کا ہے۔ انہیں خوف لاحق ہوا کہ اب مکہ میں جو خون ریزی ہو گی تو وہاں میرے اہل و عیال کو بچانے والا کوئی نہیں ہے' اللہ جانے ان کا کیا حال ہو گا۔ اس لئے کہ قریش سب سے پہلے تو مکہ میں موجود مسلمانوں یا ہجرت کرنے والوں کے اہل و عیال ہی کو ختم کریں گے۔ ان اندیشوں کے پیش نظر انہوں نے قریش پر احسان دھرنے کیلئے مخفی طور پر ایک خط لکھا' جس میں یہ خبر تھی کہ رسول اللہ ﷺ مکہ پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے ہیں اور آپؐ جلد ہی مکہ کی

طرف کوچ کرنے والے ہیں۔ انہوں نے یہ خط ایک عورت کے حوالے کیا کہ وہ خفیہ طور پر مکہ جاکر یہ خط سردارانِ قریش کو پہنچا دے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو وحی کے ذریعے اس کی خبر دے دی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے حضرت علی اور ان کے ساتھ تین صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ کہہ کر بھیجا کہ جاؤ فلاں مقام پر تمہیں ایک ہودج نشین عورت ملے گی' جس کے پاس ایک رقعہ ہے' اسے لے کر آجاؤ۔ یہ حضرات گھوڑوں پر سوار ہو کر تیزی سے وہاں پہنچے۔ وہ عورت سمجھ گئی اور اس نے صاف انکار کر دیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے' یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ تمہارے پاس کوئی خط نہ ہو' اگر تم نہیں دو گی تو ہم تمہیں برہنہ کر کے تلاشی لیں گے۔ یہ دھمکی سن کر اس نے بالوں کی چٹیا سے خط نکال کر پیش کر دیا۔ یہ خط لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خط سن کر تمام صحابہؓ کو حضرت حاطبؓ کی جانب سے افشائے راز پر حیرت بھی ہوئی' رنج بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جلال میں آکر بیتاب ہو گئے اور انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ آپؐ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں' اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : اے عمرؓ! جانتے نہیں ہو کہ یہ بدری ہیں اور اللہ تعالیٰ اہلِ بدر کو مخاطب کر کے فرما چکا ہے کہ تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ان کی اگلی پچھلی خطائیں معاف کر چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حاطبؓ سے باز پرس فرمائی تو انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ! مجھ سے اس اندیشہ کے سبب سے یہ خطا ہو گئی ہے' جس پر میں نادم بھی ہوں اور توبہ بھی کرتا ہوں۔ چنانچہ ان کو معاف کر دیا گیا۔

مکہ کی طرف کوچ

رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا

لشکر حضورؐ کے ہمرکاب تھا۔ یہ رمضان ۸ھ ہے۔ واقعہ ہجرت کو دس برس اور مسلّح تصادم (Armed Conflict) کے مرحلے کو شروع ہوئے صرف چھ سال بیتے ہیں۔ سیرتِ مطہرہ میں بہت سے غزوات اور سرایا کا ذکر ملتا ہے لیکن ان تمام جنگوں میں جانی نقصان مجموعی طور پر چند سو سے زیادہ نہیں ہوا۔ کفار کی طرف سے جو لوگ قتل ہوئے اور مسلمانوں کی طرف سے جو شہید ہوئے ان کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اگرچہ کئی بار خوں ریزی ہوئی' لیکن اموات (Casualties) کی گنتی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک غیر خونیں (Bloodless) انقلاب تھا۔ سب سے زیادہ خون ریزی اگر ہو سکتی تو فتح مکّہ کے وقت ہوتی۔ اس لئے کہ جو خون کے پیاسے تھے' جو جانی دشمن تھے' وہ سب کے سب مکّہ میں موجود تھے۔ ان میں وہ شخص بھی تھا جس کے دھوکہ سے پھینکے ہوئے برچھے سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تھے' یعنی وحشی۔ ان میں وہ خاتون بھی تھی یعنی ہندہ بنتِ عتبہ' زوجۂ ابوسفیان کہ جس نے سیّد الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کا مثلہ بھی کرایا تھا اور آپؓ کا کلیجہ چبانے کی کوشش بھی کی تھی۔ چنانچہ اُس وقت مکّہ والوں کو یہ اندیشے لاحق تھے کہ اب کیا ہوگا! ان پر شدید خوف اور اضطراب طاری تھا۔

اسلامی لشکر مکّہ کی راہ میں

اثنائے راہ میں رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب ملے' جو مسلمان ہو کر اپنے اہل و عیال سمیت مکہ سے ہجرت کرکے آرہے تھے۔ مزید آگے گئے تو آپ ﷺ کے چچا زاد بھائی ابوسفیان بن حارث اور پھوپھی زاد بھائی عبد اللہ بن امیہ ملے۔ یہ دونوں مکہ میں آپؐ کو سخت اذیت پہنچایا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی ہجو کیا کرتے تھے۔ لیکن جب دونوں بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہو کر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے معافی کے طالب ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں معاف فرمادیا۔

ابوسفیان کا قبولِ اسلام

دس ہزار قدسیوں اور جان نثاروں کے جلو میں جب کوکبِ نبوی ؐ نہایت عظمت و شان کے ساتھ مکّہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہوا تو تحقیق کے لئے قریش کی طرف سے ابوسفیان ' حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) اور بدیل بن ورقہ چھپ چھپا کر اہل ایمان کے لشکر تک پہنچے۔ ابوسفیان کو مسلمانوں نے پہچان لیا اور گرفتار کرکے دربارِ رسالت میں پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیمہ میں آکر عرض کیا کہ حضور! اللہ اور اس کے رسول کے اس دشمن کے قتل کا حکم دیجئے تاکہ کفر کے بالکلیہ استیصال کا آغاز ہو جائے۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے جان بخشی کی درخواست کی ـــــ ابوسفیان کا سابقہ کردار اور ان کی اسلام دشمنی سب کے سامنے عیاں تھی۔ ان کا ایک ایک فعل انہیں قتل کا مستوجب ثابت کرتا تھا۔ لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز تھی اور وہ تھی حضور ﷺ کی رافت ' رحمت اور عفو کا جوہر جو ابوسفیان کو دل ہی دل میں اطمینان دلا رہا تھا کہ خوف کا مقام نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے اخلاق حسنہ سے دل پہلے سے گھائل تھا۔ حق کا بول بالا اور اسلام کی فتح و سربلندی نگاہوں کے سامنے تھی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ جگری دوست تھے ' ان کی ترغیب اور ان تمام چیزوں نے اس آہنی چٹان کو پگھلا دیا اور وہ بالآخر دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے اور مؤمن صادق ثابت ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ـــــ غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی جو عہد خلافت راشدہ میں جنگ یرموک (شام) کے موقع پر بالکل جاتی رہی۔

یوم المرحمۃ

علی الصبح جب لشکر اسلام مکّہ کی طرف بڑھا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباس ؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جاکر کھڑا کر دو تاکہ وہ افواج الٰہی کا جلال اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ نیز مکّہ میں داخل ہوتے ہی اعلان کر دیا

جائے کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابو سفیانؓ کے گھر میں پناہ لے گا یا حرمِ کعبہ میں داخل ہو جائے گا تو اس کو امن دیا جائے گا۔

اہلِ ایمان کی فوجیں الگ الگ پرچموں تلے نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتی ہوئی مکّہ کی طرف بڑھ رہی تھیں اور حضرت ابو سفیانؓ ان کو دیکھ دیکھ کر متحیر ہو رہے تھے۔ جب انصار کے قبیلہ خزرج کا لشکر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں گزرا جن کے ہاتھ میں علم تھا اور انہوں نے ابو سفیان کو دیکھا تو بے اختیار پکار اُٹھے :

الیومَ یومُ المَلحمة

الیومَ تستحلّ الکعبة

"آج خون بہانے کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا"۔

مختلف لشکروں کے پیچھے کوکب نبوی نمودار ہوا۔ حضرت زبیرؓ بن العوام علمبردار تھے۔ حضرت ابو سفیانؓ کی نظر جب جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ حضورؐ! آپ نے سنا کہ سعد یہ کہتے ہوئے گزرے ہیں کہ "الیوم یوم الملحمة۔ الیوم تستحل الکعبة" نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا : نہیں، سعد نے صحیح نہیں کہا بلکہ

الیومَ یومُ المَرحمة

والیوم یوم تعظم فیه الکعبة

"آج کا دن رحمت کا دن ہے اور آج کا دن وہ دن ہے جس میں کعبہ کی تعظیم کی جائے گی"۔

ملحم بنا ہے لحم سے۔ ملحم جانوروں کے ذبح خانہ اور اس مقام کو کہتے ہیں جہاں ذبیحہ کے پارچے یا قیمہ بنایا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی وزن پر رحم اور رحمت کے لفظ سے اس دن کو "یوم المرحمة" قرار دیا۔ یعنی رحم، رحمت اور شفقت کا دن ــــــ ساتھ ہی حضور ﷺ نے حکم دیا کہ سعد بن عبادہؓ سے علم لے کر ان کے بیٹے قیسؓ کو دے دیا جائے۔

ایک معمولی جھڑپ

اہلِ اسلام کے تمام لشکر پرامن طور پر مکہ میں داخل ہو گئے۔ یہ تمام لشکر مکہ کے بالائی حصہ سے داخل ہوئے تھے' جب کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جو لشکر تھا وہ مکہ معظمہ کے زیریں حصہ سے شہر میں داخل ہونے کے لئے آیا۔ قریش کے ایک گروہ نے اس لشکر پر تیر برسائے۔ چنانچہ تین صحابہ کرامؓ شہید ہو گئے۔ حضرت خالدؓ نے مجبور ہو کر اس گروہ پر حملہ کیا اور یہ لوگ تیرہ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تلواروں کی چمک دیکھی اور جھنکار سنی تو تحقیق حال فرمائی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ابتداء مخالفین کی جانب سے ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی"۔

فتح مبین کا اتمام

اللہ کی شان دیکھیے' جس مکہ میں آٹھ سال قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا فیصلہ ہو گیا تھا اور جہاں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے راتوں رات چھپ کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی' پھر غارِ ثور میں تین دن پناہ لینی پڑی تھی جس کے دہانے تک کھوجی کفارِ مکہ کو لے آئے تھے اور جہاں سے اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر حضورؐ کو بچایا تھا جب آپؐ نے حضرت ابو بکرؓ کا اضطراب دیکھ کر ان سے وہ جملہ فرمایا تھا جو توکل علی اللہ کا شاہکار ہے کہ : "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" اسی مکہ میں آٹھ سال بعد رمضان المبارک ۸ ھ میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت فاتح داخل ہو رہے ہیں۔ فرط تواضع اور عجز و انکساری کا یہ عالم ہے کہ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ کی پیشانی مبارک گھوڑے کے ایال کو مس کر رہی تھی۔ زبان مبارک پر ترانہ حمد جاری تھا۔ دنیا نے اس سے قبل ایسا کوئی فاتح نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ قیامت تک دیکھ سکے گی۔

بیت اللہ کی بتوں سے تطہیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار و مہاجرین کے جلو میں مسجدِ حرام کے اندر تشریف لائے'

اُس وقت آپؐ کے دستِ مبارک میں ایک کمان تھی۔ وہ حرمِ محترم جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جیسے بُت شکن نے اللہ واحد کی پرستش کے لئے تعمیر فرمایا تھا' اس کے آغوش میں تین سو ساٹھ بُت موجود تھے۔ لیکن اب رسول اللہ ﷺ کے لئے موقع تھا کہ اپنے جدِّ امجد کی سُنّت کی تجدید فرمائیں۔ چنانچہ حضورؐ ایک ایک بُت کو اپنی کمان سے ٹھوکے دے کر گراتے جاتے اور زبان مبارک سے پڑھتے جاتے تھے :

﴿ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝ ﴾

(بنی اسرائیل :۸۱)

"حق آگیا اور باطل مٹ گیا' اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی"[1]

عین خانہ کعبہ کے اندر بہت سے بُت رکھے تھے اور اندر دیواروں پر تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب بُت نکلوائے جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر جتنی تصویریں تھیں مٹا دیں اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے تمام بُت اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینک دیئے۔

چند دنوں بعد اُن تمام بتوں کو بھی پاش پاش کرا دیا گیا جن کے استھان اطرافِ مکّہ میں مختلف مقامات پر قائم تھے۔ اس طرح عرب میں اسلام کی انقلابی دعوتِ توحید کی تکمیل ہو گئی۔ شرک اور بُت پرستی کا طلسم ختم ہوا اور شرک کی بنیاد پر جو استحصالی نظام قائم تھا اس کا استیصال ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ کا قریش سے خطاب

کعبہ مشرفہ کی بُتوں سے تطہیر کے بعد آپؐ نے اس کے اندر نماز ادا کی' پھر دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے اور مسجد حرام میں کھچا کھچ بھرے ہوئے قریش سے خطاب فرمایا۔ مکّہ میں داخلہ کے بعد عرب کے بے تاج بادشاہ' سرورِ عالم

---

(۱) صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: جاء الحقُّ وما یبدئُ الباطل وما یعید "حق آگیا اور باطل کی چلت پھرت ختم ہو گئی"۔ (مرتب)

رحمۃٌ للعالمین ﷺ نے خلافتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو پہلا خطاب فرمایا اس کے مخاطب درحقیقت صرف اہلِ مکہ ہی نہیں بلکہ سارا عالم تھا۔ ارشاد ہوتا ہے :

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ اَلَا كُلُّ مَاثُرَةٍ اَوْ دَمٍ اَوْ مَالٍ يُدْعٰى فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ اِلَّا سُدَانَةَ الْبَيْتِ وَسِقَايَةَ الْحَاجِّ.....))

"ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا' اس نے اپنے بندے کی مدد کی ور اس نے تنہا تمام جتھوں کو توڑ دیا۔ آگاہ ہو جاؤ! (اب) تمام مفاخر' تمام انتقامات' خون بہائے قدیم سب میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں۔"

((يَامَعْشَرَ قُرَيْشٍ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْاٰبَاءِ' اَلنَّاسُ مِنْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ))

"اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسبت کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔"

اس کے بعد آپ ﷺ نے سورۃ الحجرات کی یہ آیت پڑھی :

﴿ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○ ﴾ (الحجرات : ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ۔ تحقیق اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ (اللہ کا) تقویٰ رکھتا ہو۔ (یعنی اس کے فرامین کی خلاف

ورزی سے سب سے زیادہ بچتا ہو۔) بے شک اللہ دانا اور واقف کار ہے۔"

خطبۂ مبارک کے بنیادی مطالب و مفاہیم

اس مختصر سے خطبہ میں اسلام کے انقلابی دعوت و پیغام کے چند اہم اصول بیان ہو گئے۔ دین اسلام کا اصل الاصول توحید ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' کوئی حاکم نہیں' کوئی مقنن نہیں' کوئی دستگیر نہیں' کوئی خالق و مالک نہیں ــــــ لفظ اللہ میں یہ تمام مفاہیم موجود ہیں۔ ساتھ ہی شرک جیسے اکبرا لکبائر کی تردید بھی آ گئی۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا بیان بھی آ گیا۔ پرانی عداوتوں اور انتقام کی پُر زور مذمت بھی آ گئی۔ مفاخر قومی و نسبی کی بیخ کنی بھی ہو گئی۔ اور آپؐ نے جاہلیت کی ان تمام جہالتوں کے متعلق فرمادیا کہ "میں نے ان تمام چیزوں کو پاؤں تلے کچل دیا۔"

ظہور اسلام سے پہلے عرب ہی نہیں تمام دنیا میں نسل' قوم اور خاندان کی تمیز کی بنا پر فرق و تفاوت اور امتیازات و مراتب قائم تھے۔ جیسے ہندو دھرم میں چار مستقل ذاتیں تاحال قائم ہیں' ان میں سے کوئی ذات کسی دوسری ذات میں ضم نہیں ہو سکتی۔ یہ مستقل اور دائمی ہیں۔ ان میں شودر کو اچھوت کا درجہ دیا گیا ہے جو غلیظ اور ناپاک جانوروں سے بھی کم تر ہے۔ پوری دنیا پر اسلام کا یہ احسان ہے کہ اس نے دنیا کو کامل انسانی مساوات کے اصول سے روشناس کرایا اور نبی اکرم ﷺ اور خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم نے اس اصول پر اسلامی حکومت کو عملاً چلا کر دنیا کے سامنے حجت پیش کر دی کہ نسل' رنگ' زبان' وطن' پیشے اور جنس کی بنیاد پر کوئی اونچا ہے نہ نیچا ہے' سب برابر ہیں' سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔

حضور ﷺ کا حِلم اور عفو

خطبہ کے بعد فاتح مکّہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجمع کی طرف دیکھا۔ جبارانِ قریش سامنے تھے۔ فرمایا کہ تمہارا کیا گمان ہے کہ میں آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ یہ لوگ اگرچہ شقی' بے رحم اور ظالم تھے' لیکن مزاج شناس بھی تھے۔

لہٰذا بے اختیار پکار اٹھے : اخٌ کریمٌ وابنُ اخٍ کریمٍ "آپ شریف اور بامروت بھائی ہیں اور ایک شریف اور بامروت بھائی کے بیٹے ہیں۔" رحمۃٌ للعالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ "آج تم پر کوئی سرزنش نہیں ہے" اور اذھبوا فانتم الطلقاء "جاؤ تم سب آزاد ہو"۔

ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اسلام کی انقلابی دعوت کے دلی دشمن اور اس کے مٹانے کے درپے تھے۔ وہ بھی تھے جو رسول اللہ ﷺ پر طنز و تعریض کیا کرتے اور حضورؐ پر تضحیک و تمسخر اور استہزا کے تیر برسایا کرتے تھے' حتیٰ کہ دشنام طرازی تک کیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں اور اہل ایمان کو شہید کیا تھا۔ وہ بھی تھے جو پیکر قدسی ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ وہ بھی تھے جو تلاوتِ آیاتِ الٰہی اور وعظ و دعوت کے موقع پر شور و غل اور مذاق و ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو دہکتی آگ' تپتی چٹانوں اور جلتی ریت پر لٹاکر ان کی پیٹھوں اور سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینۃ النبیؐ کے چھوٹے سے شہر کی دیواروں سے آ آکر ٹکراتا تھا ـــــــ لیکن رحمتِ عالم ﷺ کے حلم' رأفت و رحمت اور عفو کا یہ کرشمہ ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں : لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ' آج کے دن تم پر کوئی الزام ہے اور نہ ہی کوئی ملامت ہے۔ میں آج تمہیں زبانی بھی کوئی دکھ پہنچانا نہیں چاہتا کہ پچھلی کوئی بات یاد دلا کر تمہیں شرمندہ و شرمسار کروں ـــــــ کون نہیں جانتا کہ بسا اوقات جسمانی ایذا سے کہیں زیادہ تکلیف دہ زبانی ایذا ہو جاتی ہے۔ اجرائے وحی کے ابتدائی تین سال تک رسول اللہ ﷺ زبانی ایذاء کا ہدف بنے رہے تھے' جس پر قرآن مجید میں نبی اکرم ﷺ کی دلجوئی کے لئے آیات نازل ہوا کرتی تھیں۔ حضور ﷺ چاہے کوئی جسمانی ایذا نہ پہنچاتے لیکن اس موقع پر چند جملے ایسے ارشاد فرما سکتے تھے جو قریش کی

ذہنی ایذاء کا سبب بن سکتے تھے۔ لیکن رؤف و رحیم اور کریم رسول ﷺ کی شرافت و مروّت نے یہ بھی گوارا نہیں کیا اور قریش کے اس سہمے ہوئے اور خوف زدہ مجمع سے فرمایا تو یہ فرمایا : "لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ"

اشتہاری مجرم

سیرت کی کتابوں میں بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اگرچہ اہل مکہ کو امن عطا فرما دیا تھا لیکن چند لوگ ایسے بھی تھے جن کے متعلق یہ حکم تھا کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں۔ مختلف روایات میں ان کی مختلف تعداد آتی ہے' البتہ اکثر روایات میں دس لوگوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے چھ خلوص دل سے ایمان لے آئے اور انہیں معافی مل گئی۔ ان ایمان لانے والوں میں وحشیؓ بھی تھے جو اسد اللہ و اسد رسولہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل تھے۔ بعد میں ان ہی کے ہاتھوں مسیلمہ کذاب واصل جہنم ہوا جو جھوٹے مدعیانِ نبوت کا سرخیل تھا۔ صرف چار شخص قتل ہوئے' تین مرد اور ایک عورت۔ مردوں میں سے ایک نے منافقانہ طور پر ایمان لا کر جنگ میں کہیں چھپ کر ایک انصاری کو قتل کیا تھا۔ ایک وہ تھا جس نے نبی اکرم ﷺ کی دو صاحبزادیوں کے ساتھ شرارت کی تھی جب کہ وہ ہجرت کر رہی تھیں۔ ان کو اونٹوں سے گرا دیا تھا جس کے نتیجے میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ ایک لونڈی تھی جو فاحشہ بھی تھی اور مغنیہ بھی' جو نبی اکرم ﷺ کی ہجو میں نہایت شرمناک گیت گایا کرتی تھی۔

نصرٌ من اللہ وفتح قریب کا کامل ظہور

فتح مکہ کی صورت میں اندرونِ ملک عرب انقلاب محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل ہو گئی۔ اور سورۃ الصف میں جو غزوۂ احزاب اور سورۃ الاحزاب سے متصلاً بعد نازل ہوئی' ان الفاظ مبارکہ میں جو بشارت دی گئی تھی کہ ﴿ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ وہ بشارت پوری ہو گئی۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر پختہ ایمان رکھنے والوں اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں اور اللہ کی راہ میں صفیں باندھ کر اس طرح قتال کرنے والوں کو جیسے سیسہ پلائی دیوار ہوں' آخرت میں لغزشوں اور خطاؤں کی مغفرت' دخول جنت اور جناتِ عدن کے پاکیزہ گھروں میں خلود و سکونت کے وعدون کے ساتھ ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں اصل کامیابی ہے ﴿ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ اس دنیا میں بھی نصرتِ الٰہی اور فتح قریب کی نوید جاں فزا سنائی گئی تھی جو فطری اعتبار سے انسان کو بڑی محبوب ہوتی ہے۔ چنانچہ فتح مکّہ کی صورت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نگاہوں کے سامنے اس بشارت کا ظہور ہو گیا۔ گویا اس طرح ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ کا اکمال و اتمام ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کی تکمیل ہو گئی۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربِّ العالمین OO

خطاب نہم

☆

اندرونِ عرب
انقلاب کے تکمیلی مراحل
پر نگاہ بازگشت
اور
مخالف قوّتوں کا آخری قلع قمع

(MOPPING UP OPERATION)

- انقلابِ اسلامی کے اہم ترین موڑ
- صلح حدیبیہ کے ٹوٹنے کے اسباب
- صلح کی تجدید کے لیے ابوسفیان کی کوشش
- نبی اکرمؐ کا طرزِ عمل اور اس کی مصلحتیں
- مستشرقین کی کوتاہ نظری اور ظاہری تضاد کا حل
- آنحضورؐ پر نبوت و رسالت کی تکمیل اور اس خصوصی منصب کے خصوصی تقاضے
- صلح کے دو سال بعد کی صورتِ حال
- ظاہری تضادات کے ضمن میں اہم ترین بات

★

- فتح مکہ کے بعد کے چند اہم واقعات
- غزوۂ حنین
- غزوۂ اوطاس
- محاصرۂ طائف
- فراستِ نبویؐ کا شاہکار
- تقسیم غنائم اور ایک پیچیدہ صورتِ حال
- اسیرانِ جنگ کی رہائی
- فتح مکہ کے بعد پہلا حج ۸ھ اور دوسرا ۹ھ

مشرکینِ عرب کو آخری تنبیہ: سورۂ توبہ کی پہلی چھ آیات

- اندرونِ عرب انقلابِ محمدیؐ کی تکمیل
- دوسرے منکرین و کفار کا معاملہ
- انقلابِ محمدیؐ کا بین الاقوامی مرحلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ مسنونہ 'تلاوتِ آیاتِ قرآنی' احادیثِ نبویؐ اور ادعیہ ماثورہ کے بعد

انقلابِ اسلامی کے اہم ترین موڑ

انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کی جدّوجُہد کے دوران یکے بعد دیگرے جو حالات و واقعات پیش آئے ان میں سے بعض کو اہم ترین موڑ (Turning point) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "النبیّ الخاتم" میں سفرِ طائف کو Turning point قرار دیا ہے ——— حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورے سے اسلامی تقویم کا "واقعۂ ہجرت" سے آغاز فرمانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آنجنابؓ کے نزدیک "ہجرت" کو بھی سیرت میں ایک اہم موڑ کی حیثیت حاصل تھی 'کیونکہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسلام کے لئے ایک Base عطا فرمائی تھی 'جو تمکّن فی الارض کے لئے ایک بنیاد بنی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے سورۃ الحج کی اس آیت مبارکہ میں کہ : ﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ﴾ جس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ یہ آیت اور اس سے ماقبل والی آیت دورانِ سفرِ ہجرت نازل ہوئیں۔ پھر غزوۂ احزاب کے وقت عرب میں ایک طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے اور دوسری طرف تمام مشرکین عرب بالخصوص قریشِ مکّہ اور یہود تھے۔ حق و باطل کے مابین جو طویل کشاکش جاری تھی اس میں غزوۂ احزاب کو اس اعتبار سے Turning Point کی حیثیت حاصل ہے کہ اس غزوہ

کے بعد نبی اکرم ﷺ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) ــــــ چنانچہ اس کے نتیجہ میں حضور ﷺ نے اگلے سال عمرہ کی نیت سے وہ سفر کیا جو صلح حدیبیہ پر منتج ہوا' جو درحقیقت فتح مکہ کی تمہید بنی۔ اِس صلح اور فتح مکہ کے مابین نبی اکرم ﷺ کو قریباً دو سال کا جو پُرامن عرصہ ملا تو حضورؐ نے اس دوران اپنی دعوتی سرگرمیوں کو اندرونِ عرب تیز تر کردیا اور آپؐ نے اسی مرحلہ پر اپنی حیاتِ طیبہ میں پہلی مرتبہ بیرونِ ملک عرب بھی دعوتی سرگرمی کا آغاز فرمایا۔ چنانچہ حضورؐ نے متعدد سلاطین اور رؤساء کو نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے۔

صلح حدیبیہ کے ضمن میں ایک اہم بحث

یہ بات اس سے قبل بیان کی جاچکی ہے کہ ۸ ھ میں قریش کے حلیف قبیلہ بنو بکر کی طرف سے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر اچانک یلغار کے بعد جب نبی اکرم ﷺ نے تین شرائط کے ساتھ اپنا سفیر مکہ بھیجا تو قریش کے جوشیلے قسم کے لوگوں (Hawks) نے پہلی دو شرائط ردّ کرتے ہوئے صلح حدیبیہ ختم کرنے کا اعلان کردیا۔ لیکن قریش کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ بات ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہو گی۔ چنانچہ ابو سفیان صلح کی تجدید کے لئے مدینہ آئے اور اس کے لئے بھرپور کوشش کی' لیکن اس میں انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

اس موقع پر نبی اکرم ﷺ نے اس عزم (determination) کا اظہار کیا کہ اب صلح کی تجدید نہیں کرنی ہے۔ اگر صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو بظاہر ایک بہت بڑا تضاد (contrast) سامنے آتا ہے کہ دو سال پہلے جناب محمد ﷺ ایسی شرائط پر صلح فرما رہے ہیں کہ جن کے متعلق تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یہ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ توہین آمیز ہیں۔ اس کا جو ردِّ عمل حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر ہوا وہ اوپر بیان ہو چکا۔ پھر یہ کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ ردِّ عمل بھی بیان

ہو چکا ہے کہ حضورؐ فرما رہے ہیں کہ اُٹھو' احرام کھول دو اور ساتھ لائے ہوئے جانوروں کی قربانیاں دے دو' لیکن ایک شخص بھی نہیں اُٹھتا۔ تو دو سال پہلے بظاہر اس درجہ گر کر صلح کی گئی کہ جس سے تمام صحابہ کرامؓ کے دل مجروح ہوئے تھے ـــــ اور اب قریش کا رئیسِ اعظم مکّہ سے چل کر مدینہ آتا ہے اور سرتوڑ کوششیں کر رہا ہے کہ کسی طرح صلح کی تجدید ہو جائے لیکن نبی اکرم ﷺ متوجہ ہی نہیں ہو رہے اور صلح نہیں فرما رہے ـــــ تو یہ یقیناً ظاہری اعتبار سے ایک بہت بڑا تضاد (Contrast) ہے' جسے مستشرقین نے منفی رنگ میں پیش کیا ہے۔

مستشرقین کی کوتاہ نظری

اصل میں مستشرقین نے سیرتِ مطہرہ کے ایسے ہی معاملات کے اوپر ڈیرے جمائے ہیں اور نقب زنی کی کوششیں کی ہیں۔ مثلاً ٹائن بی نے' جسے فلسفہ تاریخ کا بہت بڑا عالم تسلیم کیا جاتا ہے' اپنے ایک جملے میں اس تضاد کو اپنی دانست میں sum up کیا ہے' اور وہ جملہ یہ ہے کہ (نقل کفر کفر نباشد)

> "*Mohammad failed as a Prophet but succeeded as a statesman*"

> "محمد (ﷺ) ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت سے ناکام رہے لیکن ایک سیاست دان اور مدبر کی حیثیت سے کامیاب رہے۔"

اس کے نزدیک مکّہ میں حضورؐ کا جو بھی رویّہ اور کردار سامنے آتا ہے وہ تو یقیناً انبیاء علیہم السلام والا ہے' لیکن مدینہ میں آپؐ کا جو کردار ہے' وہ تو ایک مدبّر' ایک سیاست دان' ایک statesman اور ایک فوجی جرنیل کا کیریکٹر ہے۔ اور اس کی رائے ہے کہ کامیابی مؤخر الذکر کو ہوئی ہے' مقدّم الذکر کو نہیں ہوئی۔

اسی طرح مسٹر منٹگمری واٹ نے' جسے ایک مرتبہ ضیاء الحق کی حکومت نے بھی پاکستان بلایا تاکہ قومی سیرت کانفرنس میں وہ ہمیں سیرت سمجھائیں' دو جلدوں (Volumes) میں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ لکھی ہے۔ لیکن اس نے دونوں

جلدوں کے عنوانات علیحدہ علیحدہ رکھے ہیں۔ گویا اس طرح اس نے اپنے باطل نظریہ کے مطابق آنحضور ﷺ کی شخصیت کے تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ پہلی جلد کا عنوان "Muhammad At Makka" اور دوسری جلد کا عنوان "Muhammad At Madina" ہے۔ گویا اس کے نزدیک دو محمد ہیں (ﷺ) ــــــ ایک مکّہ والے اور دوسرے مدینہ والے۔ العیاذ باللہ!

تضادِ ظاہری کی حقیقت

یہ جو بظاہر تضاد (contrast) نظر آتا ہے' جس پر مستشرقین نے ڈیرے جمائے ہیں' یہ دراصل "انقلاب" کے مراحل ولوازم کے تقاضوں سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی حیثیت صرف دیگر انبیاء و رُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام والی نہیں ہے۔ آپؐ خاتم الانبیاء اور آخر المرسلین ہیں۔ آپؐ پر نبوت و رسالت کی تکمیل ہوئی ہے۔ لہٰذا آپؐ کے سپرد یہ اضافی مشن بھی کیا گیا کہ آپؐ دینِ حق کو بالفعل قائم' غالب اور نافذ فرمائیں۔ قرآن حکیم میں آپؐ کی یہ خصوصی و امتیازی شان قرار دی گئی ہے اور آپؐ کو یہ اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ : ﴿هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ﴾ "وہ (اللہ) ہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (قرآن مجید) اور دین حق (کامل شریعت) کے ساتھ تاکہ وہ اس کو تمام نظام ہائے زندگی و اطاعت پر غالب کر دے"۔ جب کہ عام نبوّت کا غالب فرضِ منصبی دعوت' تبلیغ' تذکیر اور انذار و تبشیر ہے۔ چنانچہ منصبِ نبوت کی اس بنیادی ذمہ داری کے ضمن میں قرآن مجید میں بار بار یہ الفاظ آئے ہیں کہ ہمارے نبی اور رسول کے ذمہ سوائے پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے ــــــ لیکن نبی اکرم ﷺ پر بحیثیت خاتم الانبیاء و آخر المرسلین اس اساسی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ایک اضافی اور خصوصی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ آپؐ دینِ حق کو عملاً غالب اور قائم کر کے دنیا کے سامنے اس کی ایک نظیر و مثال پیش فرما دیں تاکہ نوعِ انسانی پر

ابد الآباد تک کے لئے حجت قائم ہو جائے۔

خصوصی منصب کے خصوصی تقاضے

اقامتِ دین کا کام درحقیقت ایک انقلابی جِدّوجُہد (Revolutionary Struggle) کا متقاضی ہے۔ ایک قائم شدہ نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ ایک صالح نظام کو قائم کرنے کے تقاضے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ انقلاب صرف دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت سے نہیں آتا۔ اگرچہ اس میں بھی آغاز دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت ہی سے ہو گا اور اس میں تذکیر بھی ہو گی' تبشیر بھی اور انذار بھی ہو گا۔ لیکن اس کا ہدف یہ ہو گا کہ ان تمام کاموں کے نتیجہ میں ایک انقلابی جمعیت فراہم کرنا' اسے منظم کرنا' اس کی تربیت کرنا اور اس میں وہ تمام ضروری اوصاف پیدا کرنا جو کسی انقلاب کے لئے لازم اور ناگزیر ہیں ـــــــ اور جب اس جمعیت میں مطلوبہ نظم اور ڈسپلن پیدا ہو جائے تو پھر اسے نظامِ باطل سے ٹکرا دینا۔ بقول علامہ اقبال ؎

با نشّہٴ درویشی در ساز و دمادم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

صلح حدیبیہ کی مصلحتیں

چونکہ نبی اکرم ﷺ کے پیشِ نظر انقلاب کا یہ نقشہ تھا اور آپؐ کا دستِ مبارک ہر وقت حالات کی نبض پر رہتا تھا لہٰذا آپؐ نے جس وقت اور جس موقع پر جو بھی قدم اُٹھایا وہ درحقیقت اسی مقصد کے پیشِ نظر اُٹھایا۔ جب آپؐ نے یہ دیکھا کہ ابھی مہلت درکار ہے (جسے ہم کہتے ہیں to buy time) تو آپؐ نے اسی کے مطابق عمل فرمایا۔ حدیبیہ کے مقام پر بظاہر گر کر اور دب کر صلح کرنے میں یہی مصلحت تھی کہ ابھی وقت اور مہلت درکار تھی۔ قرآن مجید میں اس کی ایک اور مصلحت بھی بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اُس وقت جبکہ حضور ﷺ ٦ھ میں حدیبیہ

تک پہنچ گئے تھے' قریش سے مسلح ٹکراؤ ہو جاتا تو نہ صرف یہ کہ خونریزی بہت ہوتی
بلکہ اندیشہ یہ تھا کہ بہت سے وہ مسلمان جو مکہ میں موجود تھے لیکن اپنی بعض مجبوریوں
کے باعث ہجرت نہ کرپائے تھے' مکہ میں قریش کے ہاتھوں قتل کر دیئے جاتے۔ اس
لئے کہ اکثر جنگ کے دوران اخلاقی اقدار اور قبائل کی روایات کالحاظ نہیں رہتا'
جذبات کے عالم میں یہ سب پامال ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اس بات کا بھی
اندیشہ تھا کہ جنگ کے ہنگامی حالات اور طوفانی کیفیات میں وہ خود حملہ آور مسلمانوں
ہی کے ہاتھوں مارے جاتے' جس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۲۵ میں بایں الفاظ کیا
گیا کہ :

﴿ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ ﴾

"اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں
جانتے' اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ تم نادانستگی میں انہیں پامال کر دو گے اور اس
سے تم پر حرف آئے گا(تو جنگ نہ روکی جاتی)۔"

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلح تصادم ٹال دیا اور فریقین کے ہاتھ روک دیئے۔ چنانچہ
اسی کا ذکر ہے سورۃ الفتح کی آیت ۲۴ کے اس حصہ میں ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ ﴾ "وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے
ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ اُن سے روک دیئے۔" تو یہ دو مصلحتیں تھیں جن کی
وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر بظاہر توہین آمیز شرائط پر بھی صلح کر لی۔

دو سال بعد کی صورت حال

لیکن دو سال کے بعد حالات کافی بدل گئے۔ اب نبی اکرم ﷺ کی دعوت و
جدّوجُہد کی کامیابی کے لئے فضا تیار ہو چکی تھی۔ حضور ﷺ کا دستِ مبارک حالات
کی نبض پر مستقل طور پر رہا ہے۔ آپؐ کو اب بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت مکہ
والوں میں کوئی دم خم موجود نہیں اور اب کسی خونریز مقابلہ کا سرے سے امکان ہی

نہیں ہے۔ اب قریش میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ مقابلہ میں آسکیں۔

اس کے برعکس ان دو برسوں کے اندر دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں اب مسلمانوں کی قوت اس قابل ہو گئی تھی کہ فیصلہ کن اقدام کیا جا سکتا تھا۔ پھر صلح ختم کرنے کی کوئی اخلاقی ذمہ داری مسلمانوں پر کسی طرح بھی عائد نہیں ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمادیئے تھے کہ قریش کے ایک حلیف قبیلہ نے مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ پر حملہ کیا اور ان کو قتل کیا' حتیٰ کہ حرمِ محترم میں بھی ان کو امان نہیں ملی' وہاں بھی ان کا خون بہایا گیا ـــــ اور اس خونریز معرکہ میں قریش نے بھی بھیس بدل کر اپنے حلیف قبیلہ کا پورا پورا ساتھ دیا۔ صلح حدیبیہ کی ایک شرط کی اس خلاف ورزی کے باوجود نبی اکرم ﷺ نے نہایت منصفانہ اور عادلانہ شرائط پیش فرمائیں کہ بنو خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے اور ان کے مالی نقصان کی تلافی کی جائے ـــــ یا یہ کہ قریش بنو بکر کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں تاکہ بنو خزاعہ اور مسلمان بنو بکر قبیلہ سے خود ہی نمٹ لیں۔ ان دونوں شرائط میں سے کوئی بھی منظور نہ ہو تو اعلان کر دیا جائے کہ آج سے صلح حدیبیہ ختم۔ قریش کے جوشیلے لوگوں نے جواب میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ ہمیں تیسری بات منظور ہے۔ یعنی آج سے صلح حدیبیہ ختم۔ اس موقع پر ابو سفیان بھی خاموش رہے اور قریش کے دوسرے جہاں دیدہ اور زیرک سردار بھی ـــــ یہ تو ابو سفیان کا بعد کے غور و فکر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ صلح حدیبیہ کو توڑنے کا اعلان کرکے ہم سے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب ہوا ہے۔ اسی لئے وہ دوڑے دوڑے مدینہ پہنچے اور انہوں نے تجدیدِ صلح کی کوششیں کیں جن میں ان کو ناکامی ہوئی۔ اس موقع پر اگر نبی اکرم ﷺ ابو سفیان کی پیش کش پر صلح کی تجدید فرما لیتے تو اس کے معنیٰ یہ تھے کہ کفر اور شرک کو بلا ضرورت اور خواہ مخواہ عرب کے مرکز مکہ مکرمہ اور حرمِ محترم پر قابض رہنے کے لئے مزید مہلت دی جاتی' جسے آج کل کی اصطلاح میں Fresh Release of Existance کہا جاتا ہے ـــــ اب اس کی قطعی

ضرورت تھی نہ حاجت۔ مشیتِ الٰہی نے قریش کی عقلوں پر پردے ڈال دیئے تھے اور انہوں نے خود ہی صلح حدیبیہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا تھا۔ اس طرح اس بشارت کے عملی ظہور کا وقت آ گیا تھا جو ہجرت سے متصلاً قبل سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ مبارکہ دی تھی :

﴿ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ○ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا○ ﴾ (بنی اسرائیل : ۸۰ ـ ۸۱)

"اور (اے نبیؐ) کہہ دیجئے : اے رب میرے! (جہاں بھی تو مجھے داخل کرے تو) مجھ کو داخل کر سچا داخل کرنا اور (جہاں سے بھی تو مجھے نکالے تو) نکال مجھ کو سچا نکالنا اور مجھ کو عطا کر دے اپنے پاس سے حکومت کی مدد۔ اور (اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل نکل بھاگا۔ بے شک باطل ہے ہی بھاگ جانے اور مٹ جانے والا"۔

صورتِ حال کے ادراک و شعور کی ضرورت

یہ ہے اصل صورتِ حال جس کا ادراک و شعور ضروری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر حضور ﷺ کا خصوصی مشن اور آپ ﷺ کا امتیازی منصب یعنی دینِ حق کو بالفعل بنفسِ نفیس قائم کرنا نگاہوں کے سامنے نہ رکھا جائے تو کوتاہ نظری کے باعث یہ تضاد نمایاں نظر آئے گا کہ دو سال پہلے حضور ﷺ بظاہر اہانت آمیز شرائط پر صلح فرما رہے ہیں اور دو سال کے بعد مخالف فریق کا رئیسِ اعظم خود مدینہ آ کر خوشامدیں کر رہا ہے' سفارشیں پہنچانے کی کوششیں کر رہا ہے کہ کسی طرح صلح کی تجدید ہو جائے' لیکن حضور ﷺ ہیں کہ اس کی بات پر توجہ ہی نہیں فرما رہے۔

درحقیقت سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا صحیح فہم اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک یہ بات پیشِ نظر نہ ہو کہ اصل میں نبی اکرم ﷺ کو کیا مشن تفویض کیا گیا تھا اور وہ کیا خصوصی ذمہ داری تھی جو حضورؐ کے سپرد کی گئی تھی!

الفاظِ قرآنی ﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾ ایک شوشہ کے تغیّر کے بغیر سورۃ التوبہ' سورۃ الفتح اور سورۃ الصف میں وارد ہوئے ہیں۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اِن الفاظِ مبارکہ کو پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہو گا کہ ان الفاظِ مبارکہ کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک صالح انقلاب عملاً برپا کرنے کا مشن سونپا گیا تھا۔ للٰہذا انقلاب کے جو مراحل ہیں ان میں سے ہر مرحلہ پر اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے' چاہے بظاہر اس میں تضاد نظر آ رہا ہو۔

تضادات کے ضمن میں نہایت غور طلب بات

جہاں تک ظاہری تضادات کا تعلق ہے سب سے نمایاں تضاد تو یہ نظر آتا ہے کہ مکّہ میں بارہ برس تک حکم یہ ہے کہ مقابلے میں ہاتھ مت اُٹھاؤ' چاہے تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں' تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا کر تمہارے کباب بنانے کا سامان کیا جائے' تمہیں طرح طرح سے اذیتیں دی جائیں' تم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جائیں' تمہاری نگاہوں کے سامنے تمہاری دینی بہن (حضرت سمیّہ رضی اللہ عنہا) کو انتہائی بہیمانہ طور پر شہید کر دیا جائے اور ان کے شوہر (حضرت یاسر رضی اللہ عنہ) کے جسم کے وحشیانہ طریق سے چیتھڑے اڑا دیئے جائیں۔ یہ سب کچھ جھیلو' برداشت کرو' تمہیں جوابی کارروائی تو کجا اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

لیکن مدینہ آنے کے بعد انہی "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ" کا اب حال یہ ہے کہ ﴿ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ﴾ "وہ اللہ کی راہ میں قتال کر رہے ہیں' قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں" —— تو بظاہر اس میں بھی بڑا نمایاں تضاد ہے۔ مگر یہ سارے تضادات صرف اسی طور سے حل ہوتے ہیں کہ انقلاب کے فلسفہ کو سامنے رکھ کر اس کے مختلف مراحل اور ہر مرحلہ کے مختلف تقاضوں کو سمجھنے کی معروضی کوشش کی جائے۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کو

اسلامی انقلابی جِدّوجُہد سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے گا تو یہ تمام مراحل ایک ڈور میں پروئے ہوئے موتی نظر آئیں گے اور فکر و نظر گواہی دیں گے کہ ہر مرحلہ صحیح ہے اور ہر اقدام اس مرحلہ کی مناسبت سے بالکل درست اور مناسب ہے۔

غزوۂ حنین و اوطاس' محاصرۂ طائف

فتح کے بعد کے چند اہم واقعات

فتح مکّہ کے بعد قریش کے بہت سے لوگ ایمان لے آئے اور مکّہ کے اردگرد کے بہت سے قبائل نے بھی از خود پیش قدمی کر کے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ہوازن اور ثقیف کے قبائل پر اس کا الٹا اثر پڑا' جو طائف اور اس کے اردگرد کی سرسبزو شاداب وادیوں میں آباد تھے۔ یہ دونوں قبیلے بڑے جنگجو اور فنونِ حرب سے واقف تھے۔ طائف اور مکّہ کو بعض اعتبارات سے جڑواں شہروں (Twin Cities) کا مقام حاصل تھا۔ طائف میں رؤسائے مکّہ کے باغات بھی تھے اور جائیدادیں بھی۔ پھر ان قبائل کے مابین تجارت بھی تھی اور رشتہ داریاں بھی ——— چنانچہ فتح مکّہ کے بعد یہ قبائل بڑے مضطرب ہوئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب ہماری باری ہے۔ لہٰذا دونوں قبیلوں کے سرداروں نے مشورہ کر کے طے کیا کہ اِس وقت مسلمان مکّہ میں جمع ہیں' ہم خود پیش قدمی کر کے پورے جوش و خروش اور زور و شور سے ان پر حملہ کر دیں۔

ان حالات کی نبی اکرم ﷺ کو مکّہ میں خبر پہنچی تو آپؐ نے تحقیق و تصدیق کے بعد تیاریاں شروع کر دیں اور بارہ ہزار جان نثاروں کے ہمراہ حنین کی طرف پیش قدمی کی۔ ان میں دس ہزار تو وہ قدسی شامل تھے جو مدینہ سے آئے تھے' باقی دو ہزار میں فتح مکّہ کے بعد ایمان لانے والے نو مسلم اور مشرکین بھی شریک تھے۔ یہ فوجیں حنین کی طرف بڑھیں۔ چنانچہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے ضمیمہ اور تکملہ کے طور پر اگلے ہی مہینہ شوال ۸ھ میں غزوۂ حنین اور غزوۂ اوطاس ہوا اور

حضور ﷺ نے طائف کا محاصرہ کرلیا۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک حضور ﷺ کے یہ آخری مسلح اقدامات تھے۔

غزوۂ حنین

ہوازن اور ثقیف کے قبائل کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے تاکہ ان کی حفاظت کی غرض سے ان کی فوجیں بڑی پامردی سے لڑیں' جانیں دے دیں لیکن کسی صورت میں بھی پسپائی اختیار نہ کریں۔ انہوں نے فوج کی ترتیب اس طرح کی کہ اپنے بہت سے تیرانداز دستوں کو پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر تعینات کیا اور بقیہ فوج نے دُوبدو جنگ کے لئے پہلے سے پہنچ کر میدان میں موزوں اور مناسب مقامات پر صف آرائی کرلی۔ اس موقع پر بعض مسلمانوں کی زبان سے اپنی کثرت کے زعم میں یہ الفاظ نکل گئے کہ "آج مسلمانوں پر کون غالب آ سکتا ہے!" جب مسلمان تین سو تیرہ تھے تو ایک ہزار کے لشکر پر غالب آ گئے تھے' اس موقع پر تو مسلمانوں کا بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ گھمنڈ پسند نہ تھا۔ لہٰذا اکثر مؤرخین کا بیان ہے کہ پہلے ہلے ہی میں ہوازن اور ثقیف کے تیراندازوں نے مسلمانوں پر تیروں کی جو بوچھاڑ کی تو ایک عام بھگدڑ مچ گئی اور بارہ ہزار کا لشکر تتر بتر ہوگیا۔ تاہم اس صورت میں بھی وہ پیکر مقدس میدان میں اپنی سواری پر جما رہا جو تنہا ایک فوج تھا' ایک اقلیم تھا' مجموعۂ کمالاتِ انسانیہ تھا۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم! بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے ساتھ صرف چار سو جاں نثار موجود تھے ـــــ بارہ ہزار کے لشکر میں سے صرف چار سو ـــــ بہرحال اِس موقع پر نبی اکرم ﷺ اپنی سواری سے اترے' علم ہاتھ میں لیا اور پوری حیاتِ مطہرہ میں پہلی بار پورے جلالِ نبوت کے ساتھ رجز پڑھا۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آپؐ نے بلند آواز سے فرمایا :

اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ! اَنَا ابْنُ عبدِ الْمُطَّلِبْ!!

"میں اللہ کا نبی ہوں (اس میں ذرہ برابر) جھوٹ نہیں ہے' میں عبدالمطلب

(جیسے شجاع) کا بیٹا ہوں۔"

حضرت عباس رضی اللہ عنہ قریب ہی تھے۔ وہ بلند آواز بھی تھے۔ للذا آپ نے انہیں حکم دیا کہ انصار و مہاجرین کو پکارو ـــــ انہوں نے نعرہ لگایا :

یا معشرَ الانصار! یا اصحابَ الشّجرۃ!

"اے گروہِ انصار' اے اصحابِ شجرہ!(بیعت رضوان والو!)"

اِن پُر تاثیر الفاظ کا کانوں میں پڑنا تھا کہ انصار و مہاجرین یہ کہتے ہوئے دفعتاً پلٹ پڑے کہ : لبّیک یارسولَ اللّٰہ وسَعدیک' نحن بین یدَیک ـــــ پھر جو مسلمانوں نے حملہ کیا تو اچانک جنگ کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔ عارضی ووقتی شکست کامل فتح سے بدل گئی۔ بہت سے کافر کھیت رہے' اکثریت فرار ہو گئی اور جو باقی رہ گئے وہ اسیر بنالئے گئے۔ بے شمار مالِ غنیمت' مویشی اور سامانِ حرب ہاتھ آیا۔

مغالطہ کا ازالہ

دس ہزار کا جو لشکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں آیا تھا ممکن ہے کہ ان میں کچھ ضعیف الایمان اور کچھ منافقین بھی شامل ہوں۔ ایک بڑے مجمع میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس لشکر میں دو ہزار کے لگ بھگ وہ افراد بھی تھے جن میں سے اکثر ایک ماہ قبل ہی ایمان لائے تھے۔ رمضان ۸ھ میں مکّہ فتح ہوا ہے اور شوال ۸ھ میں غزوۂ حنین ہوا ہے۔ گویا ایمان کی حالت میں ان پر ایک ماہ سے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ پھر اس دو ہزار کی تعداد میں کچھ وہ لوگ بھی شامل تھے جو ابھی ایمان ہی نہیں لائے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ قبیلہ کی عصبیت یا مالِ غنیمت کے حصول کے لئے اسلامی لشکر کے ساتھ ہو گئے ہوں۔

بہرحال تھوڑے یا زیادہ لوگ اپنی کثرت پر نازاں تھے کہ آج ہمیں کون شکست دے سکتا ہے۔ چونکہ اُمّتِ مسلمہ کو پوری نوعِ انسانی کی رُشد و ہدایت' دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے برپا کیا جا رہا تھا للذا غلطی پر

تنبیہ اور سزا بھی ضروری تھی۔ جیسا کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ہوا تھا کہ پینتیس افراد کی طرف سے اپنے لوکل کمانڈر کے حکم کی نافرمانی کی پاداش میں ابتدائی فتح شکست میں بدل گئی تھی اور ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے تھے۔ چنانچہ غزوۂ حنین میں بھی کثرت پر جو ناز ہوا تھا اس پر یہ سزا ملی کہ ابتدا میں ہوازن و ثقیف کے تیراندازوں نے اسلامی لشکر کی صفیں درہم برہم کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس طور پر یہ سبق دیا کہ حزب اللہ کا توکّل اسباب پر نہ ہو بلکہ مسبّبُ الاسباب پر ہو۔ حسب استطاعت مادی اسباب و وسائل ضرور فراہم کئے جائیں لیکن مؤمن کو تو ہر آن اور ہر لحظہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر نگاہ رکھنی چاہئے : ﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ ــــــ اللہ کے اِذن کے بغیر پتّا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ کسی کام کے لئے کتنے ہی اسباب و وسائل جمع ہو جائیں' لازم نہیں ہے کہ وہ کام حسب منشاء تکمیل پا جائے اور کسی شے کے لئے کچھ بھی وسائل و اسباب موجود نہ ہوں پھر بھی اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ شے عدمِ محض سے آنِ واحد میں وجود میں آ جائے۔ جب تک اللہ کی قدرتِ کاملہ پر اس نوع کا ایمان نہ ہو اور جب تک اُس (تعالیٰ) کی ذات پر کامل توکّل نہ ہو جائے اُس وقت تک درحقیقت وہ ابتدائی اوصاف (Pre-qualifications) اور وہ صلاحیتیں جو اسلام کو دنیا میں ایک کامل نظامِ زندگی کی حیثیت سے غالب' قائم اور نافذ کرنے کے لئے درکار ہیں' انہی کا فقدان ہے۔ اسلامی انقلاب جیسے عظیم ترین کام کے لئے تو وہ جماعت درکار ہے جس کے ہر ہر فرد میں یہ صفات پہلے وجود میں آ چکی ہوں کہ ان کا اللہ پر کامل ایمان و ایقان ہو اور ان کا کوئی تکیہ اور بھروسہ ظاہری اسباب و وسائل اور ذرائع پر نہ ہو بلکہ توکل خالصتاً اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔ اسی بات کو اذہان و قلوب میں راسخ کرنے کے لئے حنین میں وقتی و عارضی شکست کے ذریعے مسلمانوں کو جھنجوڑ دیا گیا۔

اوطاس

کُفّار کی شکست خوردہ فوج کاایک حصہ مکّہ اور طائف کے درمیان اوطاس کے مقام پر رُک گیااور ایک بڑا حصہ طائف جاکر پناہ گزین ہوا۔ ایک اور قبیلہ جشم کا سردار دُرَید بن الصمہ جو اپنی بہادری اور شاعری میں پورے عرب میں مشہور تھا' اس کی عمر اُس وقت سو برس سے بھی زیادہ ہو گئی تھی' لیکن طائف کا سردار مالک بن عوف اس کو چارپائی پرڈال کر حنین لے گیاتھاتاکہ اس کے سو سالہ تجربات سے فائدہ اُٹھایا جاسکے۔ حنین کی شکست کے بعد دُرَید اپنے قبیلہ کی کئی ہزار جمعیت لے کر اوطاس آیا' طائف کے جو لوگ یہاں رُک گئے تھے وہ بھی اس کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ کو برابر خبریں پہنچ رہی تھیں۔ چنانچہ آپؐ نے ایک مختصر فوج ان کے استیصال کے لئے بھیج دی جس کے ہاتھوں اللہ نے فتح نصیب فرمائی۔ دُرَید قتل ہوا' جس کے بعد یہ جمعیت اپنے مقتولین کو چھوڑ کر منتشر ہو گئی۔ کچھ لوگ طائف چلے گئے اور کچھ اسیر بنالئے گئے۔

محاصرۂ طائف

حنین اور اوطاس کی شکست خوردہ فوجیں طائف میں پناہ گزین ہوئیں اور طائف والوں کی مدد سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ یہاں ثقیف کاجو قبیلہ آباد تھاوہ قریش کا قریباً ہمسر تھا ___ نہایت شجاع' دلیراور فنونِ جنگ سے واقف۔ عروہ بن مسعود یہاں کا رئیس تھا۔ سورۃ الزّخرف میں مشرکین کاجو یہ قول نقل ہوا ہے : ﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ ﴾ "اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اُترا یہ قرآن کسی بڑے شخص پر دو بستیوں میں سے"۔ قریتین سے ان کی مُراد مکّہ اور طائف کے شہر تھے اور طائف کے بڑے آدمی سے مراد یہی عروہ بن مسعود تھا۔ عروہ کاذکر صلح حدیبیہ کے ضمن میں آچکاہے۔ وہ بعد میں ایمان لے آئے تھے لہٰذا صحابیت کے شرف سے مشرف ہوئے۔

شہرِ طائف کے گرد مضبوط فصیل تھی اور وہاں ایک مضبوط قلعہ بھی موجود تھا' جس میں طائف والوں نے سال بھر کا سامانِ خورد و نوش جمع کر لیا تھا۔ فصیل پر چاروں طرف منجنیق اور جابجا تیر انداز معین کر دیئے گئے تھے۔ اسلامی فوجوں نے محاصرہ کیا اور یہ پہلا موقع تھا جب اسلامی فوج کی طرف سے فصیل شکن آلات کا استعمال ہوا۔ طائف کے لوگوں نے فصیل کے اوپر سے لوہے کی گرم سلاخیں اور آگ برسائی اور اتنی شدت سے تیر پھینکے کہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ بیس دن محاصرہ جاری رہا لیکن شہر فتح نہ ہو سکا۔ نبی اکرم ﷺ نے مشاورت کے بعد محاصرہ اُٹھالیا۔ اس موقع پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اہلِ طائف کے لئے بد دُعا فرمائیں۔ لیکن نبی رحمت ﷺ نے بد دعا کے بجائے یہ دُعا فرمائی : ((اَللّٰھُمَّ اھْدِ ثَقِیْفًا وَائْتِ بِھِمْ)) "اے اللہ! ثقیف کو ہدایت بخش کہ وہ میرے پاس حاضر ہو جائیں"۔ رسول اللہ ﷺ کی دُعا قبول ہوئی اور محاصرہ اُٹھالینے کے چند دنوں بعد ہی عروہ بن مسعود اپنے چیدہ چیدہ ساتھیوں کے ساتھ خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ بعد ازاں انہی حضرات کی دعوت و تبلیغ سے ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں کے تمام افراد ایمان لے آئے۔

فراستِ نبویؐ کا عظیم شاہکار :
ایک خاص واقعہ

سیرۃُ النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی سایہ دار ہموار شاہراہ پر چلنے (Smooth Sailing) والا معاملہ نہیں تھا کہ جس میں کوئی پیچیدگی نہ ہو' کوئی تکلیف نہ ہو' کوئی نشیب و فراز نہ ہوں اور انقلاب کی تکمیل ہو جائے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی انقلابی جدوجہد کی راہ میں جتنی مشکلات اور رکاوٹیں آسکتی ہیں وہ ہمیں آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں بتمام و کمال نظر آتی

ہیں۔ نبوت و رسالت کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد حضور ﷺ کی بائیس تیئس سالہ حیاتِ طیبہ نہایت شدید اور جاں گسل جدّوجُہد میں گزری ہے اور آپؐ کو بے پناہ مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ خود آپؐ کا ارشادِ گرامی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجھ پر تنہا وہ سب تکلیفیں اور مشکلیں بیتی ہیں جو تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام پر بیتی تھیں ـــــــ اگرچہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے' اگر اس کی مشیت ہوتی تو وہ اپنے محبوب ﷺ اور اپنے حبیب ﷺ کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی چبھنے نہ دیتا اور انقلابِ اسلامی کی تکمیل بھی ہو جاتی' لیکن بالفعل ایسا نہیں ہوا۔ حضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کو بے حد و حساب تکلیفیں جھیلنی پڑی ہیں' مصائب برداشت کرنے پڑے ہیں' بارہا آپؐ کو پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونا پڑا ہے۔ مشرکین و کفار کی طرف سے استہزاء' تمسخر اور طعن و تشنیع سے جو ذہنی اذیت و کوفت آپؐ کو پہنچتی رہی ہے' وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ متعدد مواقع پر ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ لوگ جو حضورؐ کا کلمہ پڑھ رہے تھے ان کے ہاتھوں بھی نبی اکرم ﷺ کو شدید نوعیت کی قلبی و ذہنی کوفت اور اذیت اُٹھانا پڑی ـــــــ آخر عبداللہ بن اُبی اور اس کے دوسرے منافق ساتھی بھی تو کلمہ گو تھے اور ان کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا تھا۔ یہی عبداللہ بن اُبی ہے جس نے کئی بار مہاجرین و انصار میں پھوٹ ڈالنے' انہیں باہم دگر دست و گریباں کرانے اور مہاجرین کی توہین و تذلیل کی کوششیں کیں۔ اسی طرح ان منافقین نے غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق کے مواقع پر مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے جو اوچھے ہتھکنڈے اختیار کئے وہ بھی آنحضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے انتہائی ذہنی اذیت کا باعث بنے۔

پھر یہی عبداللہ بن اُبی ہے جس نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی' جس کے نتیجے میں نبی اکرم ﷺ کو انتہائی ذہنی و قلبی اذیت جھیلنی پڑی۔ پھر یہ کہ اس معاملے میں چند وہ لوگ بھی ملوث ہو گئے جو صادق الایمان تھے۔ اس لئے کہ انسان کی

طبعی کمزوری کے پیشِ نظراس میں ذہنی آمادگی رہتی ہے کہ کسی کے بارے میں بُری بات بیان ہو تو اسے وہ جلد قبول کرلیتا ہے' جبکہ اگر کسی کے بارے میں اچھی بات بیان ہو تو اسے آسانی سے قبول نہیں کیا جاتا۔ واقعہ افک کے بعد جناب مُحمّدؐ رسول اللہ ﷺ کامتواتر ایک مہینہ نہایت سخت کرب کی حالت میں گزرا۔ اس لئے کہ قریباً سوا مہینہ کے بعد سورۂ نور نازل ہوئی جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگائی گئی تہمت کی تردید کی گئی اور آپؓ کی پاک دامنی کی شہادت دی گئی۔ اس واقعے کا بظاہر حیاتُ النبی ﷺ کے انقلابی پہلو سے کوئی تعلق نہیں' تاہم یہ بات نہیں بھولنا چاہئے کہ انقلابی جِدّوجُہد کے شدائد کے ساتھ ساتھ آپ کو ذہنی کوفت کے بدترین تجربات بھی پیش آئے۔ مگر ذہن کو بری طرح متأثر کرنے والے یہ واقعات آپ کی انقلابی جِدّوجُہد کو ذرا بھی متزلزل نہ کرسکے۔

غنائم اور اسیرانِ جنگ

ہوازن اور ثقیف کے قبائل بہت طاقتور اور دولت مند تھے۔ چنانچہ ان معرکوں میں کثیر مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ معتبر روایات میں مذکور ہے کہ قریباً چوبیس ہزار اونٹ اور چالیس ہزار بھیڑ بکریاں مالِ غنیمت میں ملیں۔ عرب کا اصل مال اور سرمایہ یہی مویشی ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈھیروں مال و اسباب کے ساتھ چار ہزار اوقیہ چاندی بھی تھی جو مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔ یہ قبائل اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لائے تھے تاکہ ان کے لشکر اپنے اہل و عیال کے تحفظ کی خاطر بے جگری سے لڑیں اور میدانِ جنگ سے پیٹھ نہ موڑیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد آ گئی اور جب کافروں کو سزا دینے کا غیبی فیصلہ ہو گیا گویا ﴿ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ والی صورت حال عملاً پیدا ہو گئی تو ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور جان بچانے کیلئے جس کا جدھر منہ اُٹھا فرار ہو گیا۔ مال مویشی ہی کیا وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی چھوڑ بھاگے۔ چنانچہ مال مویشی کے علاوہ

قریباً چھ ہزار افراد جن میں عورتوں بچوں کی عظیم اکثریت تھی اسیر بنالئے گئے[1]۔

تقسیم غنائم اور ایک پیچیدہ صورتِ حال

مختصراً یہ کہ اس غزوہ کی فتح کے نتیجے میں بے شمار مال واسباب ہاتھ آیا ـــــ صدقات کی تقسیم کے لئے سورۂ توبہ میں جو مدّات بیان ہوئی ہیں ان میں ایک مدّ "اَلْمُؤَلَّفَةُ قُلُوْبُهُمْ" بھی ہے۔ یعنی وہ لوگ بھی ان صدقات کے مستحق ہیں جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے غنائم کی تقسیم میں قریش کے ان لوگوں کو زیادہ نوازا جو فتح مکہ کے بعد نئے نئے ایمان لائے تھے۔ ان میں سے بھی خاص طور پر جو قریش کے مختلف گھرانوں کے سربراہان اور سردار تھے ان کو مالِ غنیمت میں سے نسبتاً زیادہ حصہ عطا فرمایا۔

اب اس تقسیم پر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں' کیونکہ اس عمل میں اتفاقی اور واقعاتی اعتبار سے یہ صورت حال موجود تھی کہ مکہ والے بہرحال نبی اکرم ﷺ کے قبیلہ کنبہ کے لوگ تھے' آپؐ کے رشتہ دار تھے۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اگر مکہ کے لوگ آپؐ کے ہم قبیلہ اور رشتہ دار نہ ہوتے تب بھی حضورؐ ان کے ساتھ یہی معاملہ کرتے۔ اب صورتِ واقعہ یہ بنی کہ اگرچہ حضورؐ یہ معاملہ تالیفِ قلبی کی

---

(1) اِن اسیران میں شیما نامی ایک خاتون بھی تھیں جو حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی اور حضور ﷺ کی رضاعی بہن تھیں۔ گرفتاری کے موقع پر انہوں نے کہا کہ "میں تمہارے نبی کی بہن ہوں"۔ لوگ تصدیق کے لئے فوراً ان کو نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لائے۔ حضرت شیما نے پہچان کے طور پر اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی' کیونکہ حضور ﷺ نے ایک دفعہ بچپن میں پیٹھ پر دانتوں سے کاٹا تھا' اس کا نشان موجود تھا۔ حضور ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپؐ نے ان کے بیٹھنے کے لئے خود اپنی رداءِ مبارک بچھائی' دلجوئی کی باتیں کیں' چند اونٹ اور بکریاں مرحمت فرمائیں اور ارشاد فرمایا کہ جی چاہے تو میرے ساتھ چل کر رہو یا گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے۔ پہلے تو وہ ایمان لائیں' پھر عرض کیا کہ مجھے میرے اہل خاندان تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ان کو عزت واحترام کے ساتھ ان کے قبیلہ میں پہنچا دیا گیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ (مرتب)

غرض سے فرمارہے تھے لیکن بالفعل تو معاملہ یہ ہو گیا کہ یہ تالیفِ قلب جن کی ہو رہی تھی وہ آپؐ کے رشتہ دار اور کنبے قبیلے والے لوگ تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لشکر میں جو تھوڑے بہت منافقین شامل تھے' اب ان کو موقع مل گیا اور انہوں نے اس معاملے کو خوب اُچھالا ـــــ اور یہ معاملہ چونکہ بہت نازک (Sensitive) تھا لہٰذا منافقین کے پروپیگنڈے سے عام مسلمانوں میں بھی تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ آخر وہ لوگ بھی انسان ہی تھے اور انسان کی جو طبعی و فطری کمزوریاں ہیں وہ تو موجود رہتی ہیں۔ چنانچہ قرآن نے اسی حقیقت کو کہیں یوں بیان فرمایا ہے کہ : ﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴾ کہیں اس طرح کہ : ﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ﴾ اور کہیں یوں کہ ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴾ ـــــ یعنی انسان میں خِلقی طور پر کچھ کمزوریاں رکھی گئی ہیں' تب ہی تو وہ امتحان اور آزمائش کے اندر ڈالا گیا ہے۔ اگر وہ ہر اعتبار سے کامل (Perfect) ہوتا' اس کی خلقت میں کسی پہلو سے بھی کوئی نقص نہ ہوتا تو پھر وہ فرشتہ ہوتا' پھر اس کے امتحان کی کیا احتیاج تھی؟۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اس واقعے سے مسلمانوں میں ایک عام بے چینی پھیل گئی اور خاص طور پر انصار میں سے بہت سے مسلمانوں کی زبانوں پر' جن میں مومنین صادقین بھی شامل تھے' یہ بات آگئی کہ :

> "دیکھا! جب جان دینے کا وقت آتا ہے' قربانیوں کا موقع ہوتا ہے تو ہم (یعنی مدینہ والے انصار) یاد آتے ہیں اور جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا مرحلہ آیا ہے تو مکہ والے' اپنے قبیلے والے' اپنے اعزہ و اقرباء یاد آ گئے۔"

یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی اور چہ میگوئیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے گوشِ مبارک تک یہ تمام باتیں پہنچ رہی تھیں اور حضور ﷺ کے قلب پر جو کیفیات گزر رہی ہوں گی اس کا احساس ہر حساس شخص کر سکتا ہے۔

خطابتِ نبویؐ کا شاہکار

نبی اکرم ﷺ نے اس پیچیدہ صورت حال کو جس عمدگی سے حل فرمایا وہ

درحقیقت حضورؐ کی فراست اور حسنِ تدبیر کا شاہکار ہے۔ یہ اور اسی نوعیت کی دیگر باتیں ہیں جن پر مستشرقین دنگ رہ جاتے ہیں' چاہے وہ منٹگمری واٹ ہو' چاہے ایچ جی ویلز ہو' چاہے کوئی اور نامی گرامی مستشرق' یہ کہ انسانی فطرت اور نفسیات سے واقفیت! یہ انسان شناسی! ــــــ اور یہ صلاحیت کہ پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال کو خوب صورتی سے حل کرلینا' یہ تمام اوصاف اُس ذاتؐ میں بدرجۂ کامل جمع تھے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان میں تعریف و توصیف کے کوئی الفاظ ایسے باقی نہیں رہ گئے جو مسٹر منٹگمری واٹ نے اپنی کتاب "Mohammad at Madina" میں حضورؐ کے لئے استعمال نہ کردیئے ہوں۔ اس نے لکھا ہے کہ : اعلیٰ ترین تدبّر و تفہم' معاملہ فہمی' انسان شناسی' دُور اندیشی' ان تمام اعتبارات سے جو اوصاف کسی بلند پایہ مدبّر' کسی سیاست دان' کسی حکمران' کسی statesman کے اندر ہونے چاہئیں وہ بتمام و کمال محمدؐ (ﷺ) میں موجود تھے۔

اسی فراست اور حسنِ تدبیر کی ایک نمایاں مثال ہے جو اس واقعہ میں سامنے آتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ چہ میگوئیاں سننے کے بعد حضور ﷺ نے ایک بہت بڑا خیمہ لگانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ایک بہت بڑا خیمہ نصب کیا گیا۔ پھر آپؐ نے تمام انصار رضی اللہ عنہم کو وہاں جمع کرلیا۔ وہاں آپؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ فصاحت و بلاغت کی معراج کے علاوہ فراست و ذکاوت اور تدبّرِ نبویؐ کے ساتھ ساتھ علمِ نفسیاتِ انسانی کے ادراک میں آپؐ کی مہارت کا بھی شاہکار ہے۔ حضورؐ نے انصار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

"اے معشر الانصار! کیا یہ درست نہیں ہے کہ تم گمراہ تھے' اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے تمہیں ہدایت بخشی؟"۔

انصارؓ نے بیک زبان یہی جواب دیا : "بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ" (کیوں نہیں' اے اللہ کے رسول!) پھر حضورؐ نے ارشاد فرمایا :

"یا معشر الانصار! کیا یہ درست نہیں ہے کہ تم ایک دوسرے کے خون کے

پیاسے تھے' میرے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر اُلفت و محبت اور اتفاق پیدا فرمایا؟"[1]

پھر حضور ﷺ نے فرمایا :

"یا معشر الانصار! کیا یہ درست نہیں ہے کہ تم مفلس تھے' اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے تمہیں غنی کر دیا؟"

اس طرح آپؐ وہ احسانات و انعامات گنواتے چلے گئے جو حضور ﷺ کے ذریعہ سے انصار پر بالخصوص اور نوعِ انسانی پر بالعموم ہوئے تھے۔ اور ہر ہر جملہ پر تمام انصار رضی اللہ عنہم بیک زبان عرض کرتے رہے کہ : "بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ" (کیوں نہیں! اے اللہ کے رسولؐ ہم تسلیم کرتے ہیں)

اس ارشاد کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطاب کا رُخ بدلا اور ارشاد فرمایا :

"یا معشر الانصار! تم جواب میں یہ کہہ سکتے ہو کہ : اے محمد! (ﷺ) جب تمہاری قوم نے تمہیں جھٹلایا' تمہاری تکذیب کی تو ہم تم پر ایمان لائے اور ہم نے تمہاری تصدیق کی —— میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو"۔

---

(1) اشارہ ہے اس دشمنی کی طرف جو اوس و خزرج کے قبائل میں برسوں سے نسلاً بعد نسل چلی آ رہی تھی جس کے باعث وقفہ وقفہ سے ان میں بار بار انتہائی خونریز اور خوفناک جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور یہ دونوں قبیلے قریباً ختم ہوا چاہتے تھے اگر نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف نہ لا چکے ہوتے۔ اسی کا ذکر ہے سورۂ آل عمران میں بایں الفاظ مبارکہ :

﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ﴾

پھر فرمایا :

"یا معشر الانصار! تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب تمہارے دشمنوں نے ہجرت پر مجبور کر دیا تو ہم نے تمہیں پناہ دی ـــــ میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو۔"

پھر حضورؐ نے فرمایا :

"یا معشر الانصار! تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اے محمد (ﷺ) تمہارا کوئی مدد کرنے والا نہیں تھا' ہم نے اپنی جانیں دی ہیں' ہم نے اپنا خون بہایا ہے جس کی بدولت آپ کو یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے ـــــ اور میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو۔"

نبی اکرم ﷺ کے اس پُر تاثیر خطبہ سے جب جذبات کی ایک خاص فضا پیدا ہو گئی تو آپؐ نے ایک بار پھر خطاب کا رُخ بدلا اور ارشاد فرمایا :

"یا معشر الانصار! کیا تمہیں یہ پسند اور منظور نہیں ہے کہ لوگ اونٹ بھیڑیں اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو واپس جائیں ـــــ اور تم محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھروں کو واپس لوٹو؟"

اس پر شدّتِ جذبات سے تمام انصار رضی اللہ عنہم کی چیخیں نکل گئیں اور وہ سب بیک زبان پکار اُٹھے :

"رضینا۔ رضینا۔ رضینا" ـــــ ہم بالکل راضی ہیں (ہمیں نہ اونٹ چاہئیں نہ بھیڑیں اور بکریاں۔ ہمیں تو صرف اللہ کے رسول محمد ﷺ درکار ہیں۔)

مجمع میں اکثر کا یہ عالم تھا کہ روتے روتے بے حال ہو گئے۔ آنسوؤں سے ڈاڑھیاں تر ہو گئیں۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے انصارؓ کے سامنے یہ حکمت بیان فرمائی کہ مکّہ کے لوگ تازہ تازہ ایمان لائے ہیں' ان کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ کسی ناحق جانبداری کی بنا پر نہیں دیا گیا ہے بلکہ تالیفِ قلب کے لئے دیا گیا ہے۔

اس انتہائی نازک اور پیچیدہ صورتِ حال پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ

ایک بالکل اتفاقیہ امر تھا کہ واقعتاً جن کی تالیفِ قلب کی گئی وہ نبی اکرم ﷺ کے قبیلہ والے تھے' بہت سے حضورؐ کے رشتہ دار تھے۔ لہٰذا ایسی صورت حال پیدا ہو جانا بالکل فطری تھا ـــــ لیکن فراستِ نبویؐ اور آپؐ کے حسنِ تدبیر نے کس خوبی سے اسے حل کیا! الغرض کسی بھی دوسرے انقلاب کے جو بھی اساسی تقاضے (Pre-requisites) ہوتے ہیں وہ سب کے سب آپ ﷺ کی انقلابی جدوجُہد میں پورے کئے گئے تب وہ انقلاب برپا ہوا جو بلاشبہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا۔

اسیرانِ جنگ کی رہائی

مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد اسیرانِ جنگ کی باقاعدہ تقسیم کا مسئلہ پیش آیا۔ یہ تمام افراد اس وقت تک جعرانہ میں محفوظ تھے۔ اصول کے مطابق ان کو لشکر میں شریک لوگوں میں تقسیم کرنا باقی تھا کہ ہوازن و ثقیف کی جانب سے ایک معزز سفارت نبی اکرم ﷺ کے خیمہ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اسیرانِ جنگ کی رہائی کی درخواست پیش کی۔ رئیس سفارت نے کھڑے ہو کر حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا کہ "اے محمدؐ (ﷺ) جو عورتیں محبوس اور اسیر ہیں ان میں تمہاری پھوپھیاں اور خالائیں بھی ہیں۔ تم نے ہمارے قبیلہ کی ایک خاتون کا دودھ پیا ہے۔ (مُراد ہیں حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا) لہٰذا ہم سب تمہارے قرابت دار ہیں۔ خدا کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بھی کچھ امیدیں وابستہ ہوتیں اور تم سے تو کہیں زیادہ توقعات ہیں" ـــــ نبی اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ خاندانِ عبدالمطلب کا جس قدر حصہ ہوگا وہ میری طرف سے آزاد ہے۔ لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے اجتماع میں یہ درخواست پیش کرو۔ چنانچہ نمازِ ظہر کے بعد رئیسِ سفارت نے یہ درخواست مجمع میں پیش کی۔ حضورؐ نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "مجھے صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے

جس کا حصہ میں چھوڑتا ہوں' اور تمام مسلمانوں سے بھی اسیران کی رہائی کی سفارش کرتا ہوں۔" مہاجرین و انصار اور دوسرے لوگ پکار اُٹھے "ہمارا حصہ بھی حاضر ہے۔" چنانچہ اس طرح دفعتاً چھ ہزار اسیران آزاد ہو گئے۔

فتح مکّہ کے بعد پہلا حج (۸ھ)

فتح مکّہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کا تدبّر ملاحظہ کیجئے۔ اگرچہ آپؐ کو یہ پہلے سے اندازہ تھا کہ قریش میں بالکل دم خم نہیں ہے کہ وہ اسلامی فوج کا مقابلہ کر سکیں' ان کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا کوئی امکان ہی نہیں تھا' اسی وجہ سے آپؐ نے صلح کی تجدید سے اعراض فرمایا تھا ـــــ لیکن فتح مکّہ کے بعد آپؐ نے ایسا نہیں کیا کہ وہاں کے پورے نظام کو یکسر بدل دیا ہو۔ اس کے بالکل برعکس آپؐ نے ان مختلف ذمہ داریوں کو جو قریش کے مختلف خاندانوں کے سربراہوں کی تحویل میں تھیں انہی کے سپرد رہنے دیا' قطع نظر اس سے کہ وہ ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں۔ آپؐ نے وہاں کے انتظامی معاملات کو قطعاً نہیں چھیڑا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اپنا کوئی امیرِ حج تک مقرر نہیں کیا کہ اب اس کی سرکردگی میں حج ہو گا' حالانکہ دو ماہ بعد حج ہونے والا تھا۔ بلکہ آپؐ نے نہایت نرم روش اختیار کی اور فتح مکّہ کے بعد ذوالحجہ ۸ھ میں جو پہلا حج آیا وہ حسب سابق مشرکین ہی کے زیر انتظام و انصرام ہوا ـــــ صرف اس فرق کے ساتھ کہ مشرکین اپنے طریقے سے حج کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے اُمتی موحدین اسلامی طریق پر حج کر رہے تھے۔

دوسرا حج (۹ھ)

فتح مکّہ کے دوسرے سال ۹ھ میں جب حج کا موقع آیا تو اس میں رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کی شرکت کی اجازت تو برقرار رکھی کہ وہ بھی حج کریں اور مسلمان بھی حج کریں' لیکن حج کے جملہ انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ حضور ﷺ حج کے لئے خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ آپؐ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر ان

کے ہمراہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک قافلہ حج کے لئے بھیج دیا۔

مشرکین عرب کو آخری تنبیہہ

حج کے لئے قافلہ روانہ ہو چکا تھا کہ چند دنوں بعد ہی سورۃ التوبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں' جو دراصل اندرون عرب انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل کے اعلان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ درحقیقت جزیرہ نمائے عرب میں شرک کے قطعی اور مکمل قلع قمع کا آخری اقدام یہی ہے جو ان آیات میں بیان ہوا۔

سورۂ توبہ کے ساتھ بسم اللہ کا نہ ہونا

یہ بات تو ہر وہ شخص جانتا ہے جو قرآن مجید سے ادنیٰ شغف اور تعلق بھی رکھتا ہو کہ سورۃ التوبہ سے پہلے آیۂ بسم اللہ لکھی ہوئی نہیں ہے۔ قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے یہ واحد سورۃ ہے کہ جس کے آغاز میں بسم اللہ نہ لکھی جاتی ہے نہ پڑھی جاتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ ــــــ مختلف لوگوں نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں ــــــ اصل وجہ تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورۃ کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھوائی۔ اس کے سوا کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ دلیل تو صرف حضورؐ کا فرمان ہے۔ لیکن اس دلیل کی حکمت معلوم کرنے کے لئے' اس کی توجیہہ میں مختلف آراء ہو سکتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ تلوار ہاتھ میں لے کر نازل ہوئی ہے' یہ مُخْزِیَۃ ہے' یہ مُشَرِّدَۃ ہے' یہ مُفْضِحَۃ ہے۔ یہ تو مشرکین کو فضیحت کرنے والی ہے۔ یہ ان کے لئے دنیا و آخرت کی رسوائی کا اعلان کرنے والی ہے' یہ ان کے آخری استیصال اور بیخ کنی کا فرمان (Extermination Proclamation) لے کر آئی ہے۔ لہٰذا اس کے آغاز میں بسم اللہ کیسے لکھی جائے' جس میں اللہ تعالیٰ کے دو عظیم ترین اسمائے حسنیٰ کے حوالے سے دو ارفع صفات یعنی رحمانیت اور رحیمیت کا ذکر ہے۔ آیتِ بسم اللہ تو رحمتِ الٰہی کا بہت عظیم خزانہ ہے' جبکہ اس سورۂ مبارکہ کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ

کا غیظ و غضب اور انتقامی شان ظاہر ہو رہی ہے ـــــ لہٰذا یہ واحد سورۂ مبارکہ ہے' جس کے آغاز میں آیت بسم اللہ نہیں ہے۔

سورۂ توبہ کی ابتدائی چھ آیات کے مطالب و مفاہیم

سورۃ التوبہ کی پہلی آیت ہے :

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ ﴾

"اعلانِ براءت ہے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے ان سب مشرکین کے لئے جن سے (اے مسلمانو!) تم نے معاہدے کئے تھے"۔

اس کی شرح بعد میں آئی ہے کہ جن مشرکین نے معاہدہ کی شرائط اپنی طرف سے پوری کی ہیں تم بھی اپنی طرف سے ان شرائط کو پورا کرو' لیکن اُس مدت تک جس کے لئے معاہدہ ہوا ہے ـــــ اب کسی مشرک قبیلہ کے ساتھ معاہدہ کی تجدید (Renewal) نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ اب انقلابِ محمّدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کی تکمیل کا مرحلہ آگیا ہے۔ آگے فرمایا :

﴿ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ○ ﴾

"پس (اے مشرکو!) تم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے مزید چل پھر لو' اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے' اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رُسوا کرنے والا ہے"۔

چونکہ یہ اَشہرِ حُرم ہیں' ان میں خونریزی ممنوع ہے' لہٰذا تمہیں چار مہینوں کی مہلت ہے۔ لیکن یہ جان لو کہ تم اللہ تعالیٰ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور تم وہ صورت دیکھ چکے ہو کہ ﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○ ﴾ کے مصداق باطل تو اب زائل ہو چکا ہے' اس کے لئے اب زوال مقدر ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی جان لو کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو رُسوا اور ذلیل و خوار کر کے چھوڑے گا۔ اور تکمیل کا اعلان

تیسری آیت میں ہے : ﴿ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ... ﴾ ”یہ اعلانِ عام ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے تمام نوعِ انسانی کی طرف حج اکبر کے دن....“

”حج اکبر“ کی صحیح نوعیت : ”حجِ اکبر“ کے متعلق ہمارے یہاں ایک غلط تصور ذہنوں میں بیٹھ گیا ہے کہ حج اگر جمعہ کے روز ہو تو وہ ”حج اکبر“ ہوتا ہے۔ یہ بالکل بے بنیاد اور غلط تصور ہے۔ حج اکبر درحقیقت حج ہی کو کہتے ہیں۔ عرب میں اسلام سے پہلے عمرہ کو ”حج اصغر“ کہا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں قیامِ منیٰ، وقوفِ عرفات، رمی جمرات اور قربانی کو چھوڑ کر دوسرے مناسک جو خالصتاً بیت اللہ سے متعلق ہیں، جیسے احرام، طوافِ قدوم، سعی بین الصّفا والمروۃ اور طوافِ وداع شامل ہیں۔ چنانچہ عمرہ حج اصغر ہے اور ۹ ذی الحجہ کو وقوفِ عرفات حج اکبر ہے۔ وقوفِ عرفہ کا جمعہ کے دن آجانا کوئی خصوصی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن غلط العام کے طور پر یہ بات پھیل گئی ہے کہ وقوفِ عرفہ کا جمعہ کے دن آنا حج اکبر ہے۔

براءت کا اعلانِ عام : فرمایا :

﴿ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ ﴾

”اعلانِ عام ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے لوگوں کے لئے حج اکبر کے دن کہ اللہ اور اس کا رسولؐ مشرکین سے بری الذّمّہ ہیں۔ اب اگر تم توبہ کرو (یعنی اسلام قبول کرلو) تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے —— اور (اے مشرکو!) اب بھی اگر تم نے روگردانی کی تو اچھی طرح جان لو کہ تم اللہ کو عاجز

نہیں کرسکتے۔ اور (اے نبیؐ) ان کافروں کو آپ دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے۔ سوائے ان مشرکین کے جن سے تمہارے معاہدے ہیں' پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا' تو ایسے لوگوں کے ساتھ جو تمہارا معاہدہ ہے تم اسے مدتِ معاہدہ تک وفا کرو۔ بے شک اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے"۔

عذابِ استیصال والی آیت : اب پانچویں آیت وہ ہے جو مشرکین عرب کے لئے عذابِ استیصال کا اعلان کرنے والی سخت ترین آیت ہے۔ اس سے زیادہ سخت کوئی آیت قرآن مجید میں نہیں ہے ـــــ اور اس سورۂ مبارکہ کی یہی آیت ہے جس میں تلوار ہاتھ میں لے کر اُترنے والی شان نمایاں نظر آتی ہے۔ فرمایا :

﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ ﴾

"پس جب حرمت والے یہ مہینے ختم ہو جائیں تو قتل کرو ان مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ اور ان کو پکڑو' ان کا محاصرہ کرو اور ان کی خوب خبر لینے کے لئے ہر گھات میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کریں (یعنی ایمان لائیں) اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ غفور اور رحیم ہے۔"

یہ آیت عام نہیں ہے۔ یعنی یہ دنیا کے تمام مشرکوں کے لئے نہیں ہے' بلکہ یہ صرف جزیرہ نمائے عرب کے اُن مشرکین کے لئے ہے جو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں وہاں آباد تھے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ ان ہی میں سے تھے۔ ان کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا اور ان پر آخری درجہ میں اتمامِ حجت ہو چکا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا کہ اب بھی اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔

بالکل وہی قانون ہے کہ جس قانون کے تحت قومِ نوحؑ‘ قومِ ہودؑ‘ قومِ صالحؑ اور قومِ لوطؑ کو ہلاک کر دیا گیا۔ یعنی جس قوم کی طرف تعین کے ساتھ رسول کو بھیج دیا جائے اور رسول دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے اپنی قوم پر اتمامِ حجت کر دے لیکن قوم اس کی بات کو نہ مانے تو وہ قوم کسی رعایت کی مستحق نہیں رہتی اور اسے اس دنیا میں نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ کسی عام داعی کی بات نہیں ہے‘ یہ رسول کی بات ہے۔ رسول تو اللہ تعالیٰ کی برہان بن کر مبعوث ہوتا ہے‘ وہ اللہ کی طرف سے بیّنات لے کر آتا ہے‘ اللہ کے حکم سے معجزات دکھاتا ہے‘ اس پر اللہ کا کلام نازل ہوتا ہے کہ جس سے بڑی کوئی برہان اور کوئی بیّنہ ممکن نہیں ہے۔ اب ان تمام باتوں کے بعد بھی لوگ ایمان نہ لائیں تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اس قوم کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ اللہ کا وہ غیر مبدل قانون ہے جس کے تحت پوری کی پوری قومیں ہلاک کر دی گئیں اور نقشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ ﴿لَا یُرٰی اِلَّا مَسٰکِنُھُمْ﴾ یعنی قوم ختم ہو گئی‘ مسکن رہ گئے‘ کھنڈرات رہ گئے۔ مکان نظر آ رہے ہیں‘ مکین نظر نہیں آ رہے۔ مختلف قوموں پر عذابِ استیصال مختلف صورتوں میں آیا ہے۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ ایک عالمگیر نوعیت کا سیلاب لا کر پوری کی پوری قوم کو غرق کر دیا گیا‘ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ ہوا۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ قوم کے چیدہ چیدہ لوگوں کو نکال کر سمندر میں غرق کر دیا گیا‘ جیسے آلِ فرعون کے ساتھ ہوا۔ کہیں ایسا ہوا کہ منکرین کی بستیوں ہی میں عذاب آیا۔ کہیں زلزلہ آ گیا‘ کہیں پتھراؤ کیا گیا‘ کہیں طوفان باد و باراں آ گیا‘ کہیں بستیوں کو اٹھا کر پلٹ دیا گیا۔ کہیں ایسی چنگھاڑ اور گرج بھیج دی گئی کہ جسے سن کر پوری کی پوری بستی ختم ہو گئی ـــــ تو عذابِ استیصال کی یہ مختلف صورتیں رہی ہیں۔

حضور ﷺ کی دو بعثتیں : درحقیقت حضور ﷺ کی بعثتیں دو ہیں۔ ایک بعثتِ خصوصی‘ اہل عرب یعنی بنی اسمٰعیل کی طرف ہے‘ جن میں سے نبی اکرم ﷺ خود تھے۔ جن کی زبان میں حضورؐ پر اللہ کا کلام نازل ہوا۔ دوسری بعثتِ عمومی ہے ”اِلٰی

كَافَّةً لِلنَّاسِ " یعنی پوری نوعِ انسانی کی طرف۔ یہ اس وقت موضوعِ بحث نہیں ـــــ البتہ جن کی طرف رسول اللہ ﷺ کی بعثت خصوصی تھی تو ان پر دعوت و تبلیغ' وعظ و نصیحت' انذار و تبشیر' تذکیر و موعظت کے ذریعہ سے حضور ﷺ رسالت کی تمام ذمہ داریاں بنفس نفیس ادا فرما چکے تھے۔ اس طرح ان پر اتمامِ حُجت کیا جا چکا تھا' لہٰذا ان کے لئے اب رعایت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ان پر اللہ کا جو عذاب آیا اس کی پہلی قسط غزوۂ بدر کی صورت میں ظاہر ہوئی' جہاں ان کے بڑے بڑے سردار کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی مانند پڑے ہوئے تھے۔ انہی میں ابو جہل تھا' عتبہ بن ابی معیط تھا' انہی میں عتبہ بن ربیعہ اور اس کا بھائی اور بیٹا بھی تھے۔ الغرض ان کے اکثر نامی گرامی سردار اس غزوہ میں کھیت رہے تھے۔ انہی میں نضر بن حارث بھی تھا جو پکڑا گیا تھا اور بعد میں حضورؐ نے اسے قتل کرایا تھا۔ پھر مختلف غزوات میں بہت سے صنادید مشرکین بتدریج اس دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں مقتول ہو کر واصلِ جہنم ہوتے رہے۔

مکمل قلع قمع کا مرحلہ : سورۃ التوبہ کی ابتدائی چھ آیات میں درحقیقت عرب سے شرک کے مکمل خاتمہ اور قلع قمع (Mopping up Operation) کا اعلانِ عام ہے کہ اب اہلِ عرب میں سے مشرکین کیلئے کوئی رعایت نہیں ہے' اب ان سے کوئی نئی صلح نہیں ہوگی۔ صلح کے جو معاہدے پہلے ہو چکے ہیں' ان میں سے کسی کی بھی مدت ختم ہو جانے کے بعد آئندہ تجدید نہیں ہوگی۔ کسی نے صلح توڑ دی' معاہدہ کی خلاف ورزی کی تو وہ اسی وقت ختم اور کالعدم ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ چار مہینے گزرنے کے بعد پورے عرب میں مشرکین کا قتل عام شروع ہو جائے گا' کسی کی کوئی رُو رعایت نہیں کی جائے گی' کسی کی جان بخشی نہیں کی جائے گی' سوائے اس کے جو ایمان لے آئے۔ دل کا حال اللہ جانتا ہے' اس کا حساب وہ عزّوجلّ خود لے گا ـــــ یہاں اسے اپنے ایمان کا اقرار و اعلان کرنا ہوگا' کلمۂ شہادت ادا کرنا ہوگا' نماز قائم کرنی ہوگی' زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ جو بھی ان شرائط کو پورا کر دے گا اس کا راستہ چھوڑ دو

جائے گا یعنی جو لوگ نظامِ اسلام کو قبول کر لیں اور مسلم ہو جائیں' ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ رہا یہ معاملہ کہ ان کے دلوں میں ایمان داخل ہوا یا نہیں' اس کا فیصلہ اللہ کرے گا۔ کیونکہ دلوں کا حال اسی "عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" کو معلوم ہے۔ چنانچہ اسی مضمون پر مشتمل رسول اللہؐ کی بڑی پیاری حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا :

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَیُقِیْمُوا الصَّلَاةَ وَیُؤْتُوا الزَّکَاةَ فَاِذَا فَعَلُوا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ))

"مجھے (اللہ کی طرف سے) یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ لا اِلٰہ اِلا اللہ محمدؐ رسول اللہ کی شہادت دیں' نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ پس جب وہ یہ (کام) کریں گے تو وہ مجھ سے اپنے خون اور اپنے اموال بچا لیں گے' سوائے اس کے کہ کوئی اسلام کے قانون کی زد میں آ جائے (باقی رہا) ان کا حساب تو وہ اللہ کے ذمے ہے۔"

معلوم ہوا کہ مشرکینِ مکہ کی جان بخشی کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں تھی کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کریں' نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔

<u>قتل عام کی نوبت نہیں آئی</u> : ان چار مہینوں کے اختتام پر مشرکین عرب میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اسلام نہ لے آیا ہو۔ گنتی کے چند افراد کے بارے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ آخر وقت تک کفر پر قائم رہے' لیکن ایسے لوگ معین وقت ختم ہونے سے پہلے ہی سرزمینِ عرب کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ چنانچہ کوئی حبشہ چلا گیا اور کسی نے شام یا مصر میں پناہ لی ـــــ بہرحال خونریزی کا مرحلہ نہیں آیا۔ لیکن اصل میں اس اعلان کی حیثیت جزیرہ نمائے عرب سے کفر و شرک کے استیصال (Mopping up Operation) کی ہے کہ اگر اہلِ عرب بنی اسمٰعیل میں سے

کوئی بھی انکار کرتا تو اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جاتی۔ البتہ دوسرے غیر عرب کُفّار کا معاملہ دوسرا ہے۔

نظم کی اہمیت کا ایک اہم واقعہ

سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات کے نازل ہونے سے پہلے حج کے لئے قافلہ روانہ ہو چکا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج مقرر فرمایا تھا۔ اب ان آیات کے نزول کے بعد حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ روانہ فرمایا اور آنجناب ؓ کو یہ ذمہ داری سپرد کی کہ حج کے موقع پر جبکہ میدانِ عرفات میں پورے عرب کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگ جمع ہوں گے' جن میں مشرکین بھی ہوں گے تو اس مجمع میں یہ آیات میرے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے کھڑے ہو کر سنا دینا تاکہ تمام اہل عرب کو معلوم ہو جائے کہ اشہر حرم کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے مشرکین عرب سے کیا معاملہ ہو گا!

یہ چھ آیات اور نبی اکرم ﷺ کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داری لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ روانہ ہو گئے اور راستہ ہی میں قافلۂ حج کو جالیا۔ جب وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سلام و دعا کے بعد دریافت فرمایا : "اَمِیْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟" یعنی یہ بات واضح کر دیجئے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو امیر بنا کر بھیجا ہے یا مامور بنا کر؟ ــــ کسی اسلامی جماعت میں کسی بھی فرد کے لئے دو ہی صورتیں ممکن ہیں' یا تو وہ خود صاحب امر یعنی امیر ہو گا' بصورت دیگر کسی امیر کے تابع یعنی مامور ہو گا ــــ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ اَمِیْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟ ــــ یعنی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضور ﷺ نے آپ کو امیر بنا دیا ہو' تو آیئے چارج سنبھالئے' اپنی پوزیشن میں آیئے' تاکہ مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میں اب مامور ہوں اور میں آپ کا حکم سنوں اور مانوں۔ اور اگر دوسری صورت ہے کہ میں ہی امیر حج ہوں اور آپ مامور ہیں تو یہ پوزیشن بھی واضح ہو جانی چاہئے۔ حضرت علی

رضی اللہ عنہ نے جواب میں فوراً کہا : مَاْمُوْرٌ ـــــ یعنی میں امیر بن کر نہیں آیا میں مامور ہی ہوں' اس قافلۂ حج کے امیر آپ ہی ہیں۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ذمہ یہ کام سپرد کیا ہے کہ آپؓ کی روانگی کے بعد جو چھ آیات نازل ہوئی ہیں ان کا اعلانِ عام حج کے مجمع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندہ کی حیثیت سے کر دوں۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی بحیثیتِ امیرِ قافلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلان فرما سکتے تھے تو یہ ذمہ داری خصوصیت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیوں کی گئی؟ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں دستور تھا کہ کوئی اہم اور خاص اعلان کسی قبیلہ کے سردار کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی قریب ترین عزیز ہی کیا کرتا تھا جو اسی قبیلہ سے تعلق بھی رکھتا ہو۔ ایسی صورت میں اس اعلان کی اہمیت مسلّم ہوتی تھی۔ اگرچہ رشتہ داری کے اعتبار سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر تھے' لیکن آپؓ بنو ہاشم میں سے نہیں تھے جبکہ ابھی تک قبائلی نظام بڑی حد تک باقی (Intact) تھا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ آپؐ کے قریب ترین عزیز بھی تھے اور قبیلہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا یہ ذمہ داری حضرت علیؓ کے سپرد کی گئی۔

ایک رعایت

اس کے بعد چھٹی آیت میں مشرکین کے لئے ایک رعایت کا ذکر ہے۔ فرمایا :

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

"اور (اے نبیؐ) اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے' پھر اسے اس کے مامن یعنی مستقل قیام گاہ تک پہنچا دیجئے۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے"۔ یعنی ان کو اسلام کے پیغام کی پوری واقفیت نہیں ہے۔

آیت مبارکہ کے ترجمہ ہی سے پوری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ تاہم مفہوم یہ ہے کہ

مہلت کے چار مہینوں کے اندر کوئی مشرک دین کو جاننے اور سمجھنے کے لئے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دی جائے' اسے دین سمجھایا جائے۔ اگر اس کام میں چار ماہ کی مدّت ختم ہو جائے اور وہ ایمان نہ لائے تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے اس کی قیام گاہ تک پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں پہنچ کر وہ جو فیصلہ کرے اس کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔ ایمان لے آئے تو چھوڑ دیا جائے گا' ترکِ وطن کرنا چاہے تو راستہ نہیں روکا جائے گا۔ دونوں اختیارات میں سے کوئی بھی اس کے لئے قابل قبول نہ ہو تو اب وہ واجب القتل ہو گا۔

مشرکین کے لئے بیتُ اللہ میں داخلہ کی ممانعت

مشرکین کے لئے آئندہ حج کرنے اور بیت الحرام میں داخل ہونے کی ممانعت کا حکم پہلے نازل ہو چکا تھا :

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا . . . ﴾ (التوبہ : ۲۸)

"اے اہل ایمان' مشرکین ناپاک ہیں' لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں....."

بیت اللہ کی تطہیر اب مکمل ہو گئی۔ لہٰذا آئندہ مشرکین کو نہ حج کی اجازت ہو گی نہ وہ حرم شریف میں داخل ہو سکیں گے۔

میں انقلابِ محمّدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے اس مرحلے کو Mopping up Operation سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جب ہر نوع کی مزاحمت و رکاوٹ (Resistance) ختم کر کے اور آخری وارننگ دے کر جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل کر دی گئی۔ اس بات کا اشارہ سورۃ المائدہ میں بھی ملتا ہے' جہاں فرمایا گیا :

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ

وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ﴾ (المائدہ : ۳)

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔"

یہ وہ آیتِ مبارکہ ہے جس کے متعلق یہودی بڑی حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ اگر اس مفہوم کی کوئی آیت ہمیں عطا ہو جاتی تو ہم اس کے یومِ نزول کو اپنی سالانہ عید کے طور پر مناتے۔

سورۃ المائدہ کی یہ آیت نہایت اہم، عظیم اور مہتم بالشان مطالب و مفاہیم کی حامل ہے۔ کیونکہ اس آیت میں تکمیل دین کا اعلان ہے۔ یعنی نوعِ انسانی کو ایک ایسا مستقل اور بھرپور نظامِ زندگی عطا کردیا گیا ہے کہ جس میں قیامت تک کے لئے بنی نوعِ انسان کے جملہ انفرادی و اجتماعی مسائل کا نہایت معتدل تفصیلی یا اصولی حل موجود ہے۔ پھر اسی آیت میں اتمامِ نعمت کا اعلان بھی ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ دین مکمل ہو گیا بلکہ نعمت کی تکمیل بھی ہو گئی۔ اور نعمت سے یہاں مُراد ہے سلسلۂ وحی اور نبوت و رسالت۔ نبوت و رسالت کا بنیادی مقصد لوگوں تک اللہ کے دین کو پہنچانا اور اپنے قول و فعل سے لوگوں پر حجّت قائم کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس یہ کام کرکے دکھایا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دین کو بالفعل غالب فرما کر گویا اتمامِ حجت کا حق ادا کردیا۔ اور اس طرح سلسلۂ نبوت و رسالت بھی اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ اب چونکہ اللہ کا آخری اور مکمل پیغام بنی نوعِ انسان تک پہنچ گیا تھا اور اس آخری وحی کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ نے لے لیا تھا اور دوسری جانب حضورؐ کی ذات میں سلسلۂ رسالت بھی اپنے کمال کو پہنچ چکا تھا اور اس میں مزید کسی اضافے (improvement) کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا سلسلۂ وحی اور نبوت و رسالت کو اب ہمیشہ کے لئے منقطع کردیا گیا ـــــ اس پہلو سے یہ آیت اتمام و اختتامِ نبوت و رسالت پر بھی دلالت کرتی ہے۔

انقلابِ محمدیؐ کی تکمیل

فتح مکہ اور معرکۂ حنین واوطاس نیز محاصرۂ طائف کے بعد اہل طائف خود ہی مطیع ہو کر مشرف باسلام ہو گئے تھے ـــــ اسلامی انقلاب کی تکمیل ہو چکی تھی اور نقشہ یہ بن گیا تھا کہ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اللہ کا دین دوسرے تمام باطل نظام ہائے حیات پر غالب و حکمران ہو گیا تھا۔

نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔ عرب کے جن قبائل نے اُس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا ان میں مشاورتیں منعقد ہوئیں اور مدینہ میں ان کے وفود کا تانتا بندھ گیا۔ ہر روز کسی نہ کسی قبیلہ کا وفد آ کر سرِ اطاعت خم کرتا تھا اور اسلام قبول کر لیتا تھا۔ گویا کہ اسلام کے خلاف مزاحم قوتوں کا بڑی تیزی سے خاتمہ ہوتا جا رہا تھا۔

اسلام کا اصل مفہوم ہی فرمانبرداری اور اطاعت قبول کرنا ہے۔ فارسی میں اس مفہوم کو "گردن نہادن" اور انگریزی میں to give up resistance اور to surrender کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کیفیت کو سورۃ النصر میں یوں بیان کیا گیا ہے :

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ○ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا○ ﴾

"جب پہنچ چکی اللہ کی مدد اور (حاصل ہو گئی) فتح تو تم نے دیکھا لوگوں کو اللہ کے دین میں داخل ہوتے فوج در فوج۔"

اس طرح جزیرہ نمائے عرب میں بسنے والے تمام عرب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ انقلاب کے ان چھ کے چھ مراحل سے گزرنے کے بعد انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کی تکمیل ہو گئی۔

دوسرے منکرین و کُفّار کا معاملہ

اندرونِ جزیرہ نمائے عرب جو غیر اسماعیلی آباد تھے' یہ یہود اور نصاریٰ تھے۔ یہ بنی اسماعیل میں سے نہیں تھے۔ اس طرح حضور ﷺ کے ہم نسل نہیں تھے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے چھوٹے بھائی حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام سے' جن کا لقب اسرائیل تھا' جو نسل چلی وہ اسرائیلی یا بنی اسرائیل کہلائی۔ یہود و نصاریٰ اسی نسل سے تھے۔ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جا کر یہ دونوں نسلیں مل جاتی ہیں' لیکن چونکہ اسی وقت سے حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کی رہائش گاہوں میں اتنا بُعدِ مکانی تھا کہ جس کے باعث حضرت ابراہیمؑ کی ذُرّیت دو علیحدہ نسلوں کی حیثیت سے پھیلی۔ لہٰذا اسی دور سے یہ جدا جدا نسلیں شمار ہوتی چلی آ رہی ہیں ـــــ پھر بنی اسرائیل کے پاس پہلے آسمانی کتابیں اور صحیفے موجود تھے۔ یہود کے پاس شریعت کا ایک ڈھانچہ بھی موجود تھا۔ چاہے ان چیزوں میں تحریف ہو چکی تھی لیکن بہرحال وہ اہل کتاب تھے اور قرآن مجید نے ان کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا ان کی کیٹیگری کو علیحدہ رکھا گیا اور ان کے متعلق سورۂ توبہ کی آیت ۲۹ میں احکامات آ گئے۔ فرمایا :

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۝ ﴾

"(اے مسلمانو!) قتال کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے جو نہ اللہ کو مانتے ہیں (جیسا کہ اس کے ماننے کا حق ہے) اور نہ روزِ آخرت کو اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اور نہ دین حق (اسلام) کو قبول کرتے ہیں۔ (ان سے جنگ کرو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

بنی اسماعیل کے لئے تو دو اختیارات میں سے ایک قبول کرنا تھا کہ یا ایمان لائیں یا قتل

ہونے کے لئے تیار رہیں ـــــ اس کے نتیجہ میں تیسرا اختیار (option) از خود بن گیا تھا کہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں ـــــ عرب میں رہتے ہوئے کوئی تیسرا option ان کے لئے نہیں تھا۔ عرب میں کسی نوع کی غیراللہ کی پرستش نہیں ہو سکتی' چاہے وہ اصنام پرستی ہو' چاہے مظاہرِ قدرت کی پرستش۔ لیکن بنی اسرائیل کے ساتھ معاملہ مختلف رکھا گیا۔ انہیں رعایت دی گئی اور ان کے سامنے تین صورتیں رکھی گئیں۔ پہلی یہی کہ ایمان لے آؤ تو ہمارے برابر کے بھائی ہو' کوئی مغائرت باقی نہیں رہے گی' حقوق و فرائض میں سب مکمل طور پر مساوی ہوں گے ـــــ یہ منظور نہیں تو دوسری صورت یہ ہے کہ چھوٹے بن کر رہو۔ دین حق کے غلبہ کو تسلیم کرو' نظام اجتماعی (Law of the land) اللہ کے دین کے مطابق نافذ و رائج ہو گا اور تمہیں اس کی اطاعت کرنی ہو گی اور اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کرنا ہو گا۔ دینُ اللہ کے تحت تم یہودی یا عیسائی ہو کر رہ سکتے ہو۔ تمہارے احوال شخصیہ (Personal Law) میں اسلامی حکومت کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اس کی اجازت ہے۔ [1] لیکن تم چھوٹے بن کر اور جزیہ ادا کر کے اسلامی حکومت کے تحت رہ سکتے ہو ـــــ اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو پھر تیسری صورت قتال کی ہے۔ اس کے سوا چوتھی شکل کوئی اور نہیں۔ اس میں از خود یہ بات بھی مضمر ہے کہ اسلامی حکومت کے دائرۂ اختیار سے نکل کر کسی اور جگہ جا کر آباد ہو سکتے ہو۔

سورۃ التوبہ کی یہی وہ آیت ہے جو اسلامی انقلاب کے بین الاقوامی مرحلہ میں بنیاد بنی ہے کہ بعد میں خلافت راشدہ کے دوران جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فوجیں اعلائے کلمۃ اللہ اور اظہارِ دین حق کے لئے نکلتیں تو وہ ہمیشہ یہی تین شرائط (options) پیش کرتے تھے۔ (i) ایمان لے آؤ' تم ہمارے برابر کے بھائی ہو گے' تمہاری تمام املاک جوں کی توں تمہاری ملکیت میں رہیں گی' ہم کسی کو ہاتھ تک

---

[1] یہ بات سورۃ البقرہ میں بایں الفاظ پہلے فرما دی گئی تھی کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

نہیں لگائیں گے۔ ہمارا تمہارا معاملہ ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے بالکل مساوی ہو جائے گا ـــــ (ii) اگر یہ منظور نہیں کرتے تو تمہیں چھوٹے بن کر رہنا پڑے گا۔ غالب دین اللہ کا ہو گا' حکومت اللہ کی ہو گی' تم ماتحت بن کر اور جزیہ دے کر خواہ عیسائی بن کر رہو' یہودی رہو' مجوسی رہو' ہندو رہو' سکھ رہو' جو چاہو رہو اس کی اجازت ہو گی۔ تمہارے احوالِ شخصیہ میں اسلامی حکومت قطعاً کوئی مداخلت نہیں کرے گی' لیکن تمہیں چھوٹے ہو کر اور اللہ کے دین کو بحیثیت نظامِ اجتماعی ذہناً قبول کر کے اسلامی حکومت میں رہنے کی اجازت ہو گی۔ لاء آف دی لینڈ اسلام ہی ہو گا ـــــ (iii) اگر یہ دونوں باتیں تمہارے لئے قابلِ قبول نہیں ہیں تو قتال کے لئے میدان میں آؤ۔ تلوار ہمارے اور تمہارے مابین فیصلہ کر دے گی۔ چوتھی کوئی شکل نہیں ہے ـــــ تو یہ تین شرائط درحقیقت مذکورہ بالا آیتِ مبارکہ پر مبنی ہیں۔

و آخر دَعوانا ان الحَمدُ لِلّٰہ ربّ العالمین ○○

خطاب دہم

✸

بیرونِ عرب

انقلابِ محمدیؐ کی توسیع و تصدیر

☆

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا

☆

ع "تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا"

★ حقیقی انقلاب کی لازمی خصوصیّت

● چند مثالیں

★ توحید کا عملی تقاضا

★ آنحضورؐ پر تکمیلِ نبوّت ورسالت

اور اس کے منطقی تقاضے

★ انقلابی دعوت کے ضمن میں ایک اہم اصُول

★ دعوتِ محمّدیؐ کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز

● نامہ ہائے مبارک

★ بیرونِ عرب مسلح تصادم کا آغاز

● غزوۂ موتہ
● غزوۂ تبوک

★ حجّۃ الوداع

★ خاتمۂ کلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ مسنونہ ' تلاوتِ آیاتِ قرآنی ' احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

انقلاب کی خصوصیت

ہر انقلاب کی فطری خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جغرافیائی یا علاقائی یا ملکی اور قومی حدود کا پابند نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ پھیلتا ہے۔ کسی بھی انقلابی نظریہ کو نہ پاسپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے نہ ویزا کی ' بلکہ وہ ان قیود سے آزاد ہوتا ہے۔ جدید اصطلاح میں اسے "تصدیر الانقلاب" کہتے ہیں۔ یعنی انقلاب ایکسپورٹ کرنا ' اس کو بیرونِ ملک برآمد کرنا ' اس کا دائرہ وسیع کرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ دوسرے ممالک میں بھی وہ انقلاب ظہور پذیر ہو۔ یہ انقلاب کا خاصہ ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ پھیلے اور وسعت پذیر ہو۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کسی انقلاب کے حقیقتاً "انقلاب" ہونے کا حتمی ثبوت یہی ہے کہ وہ کسی علاقائی و جغرافیائی حد میں محدود ہو کر نہ رہ جائے ' بلکہ پھیلے اور وسعت پذیر ہو۔ اگر وہ جغرافیائی حدود کے اندر محدود ہو کر رہ گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں جان نہیں تھی ' اس کے بنیادی فلسفہ میں قوت تسخیر نہیں تھی ' اس میں آفاقیت اور عالمگیریت نہیں تھی ' بلکہ شاید اس کے اندر اصل فیصلہ کن عوامل صرف قومی و ملکی تھے۔ اس میں کوئی ایسا نظریہ ' کوئی ایسا پیغام نہیں تھا جو بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہو اور جو قومی اور جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر نوعِ انسانی کے اذہان و قلوب میں اپنی جگہ بنا سکے۔

انقلاب کی چند مثالیں

کامل انقلاب کی مثال تو تاریخ انسانی میں ایک اور صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام ـــــ جس کے نتیجہ میں انسانی زندگی کا

ہر گوشہ بدل گیا تھا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں میں انقلاب آگیا یعنی معاشرتی' سماجی' سیاسی' معاشی' عدالتی' دستوری اور آئینی غرضیکہ وہ تمام شعبے یکسر بدل گئے جو اجتماعیاتِ انسانی سے متعلق ہیں' بلکہ انفرادی زندگی بھی پورے طور پر اس کی لپیٹ میں آگئی تھی' چنانچہ اخلاق بدل گئے' عقائد بدل گئے' صبح و شام کے معمولات اور رہن سہن کے طور طریقے سب بدل گئے۔ مختصراً یہ کہ ایک ایسا انقلاب جو پوری انسانی زندگی کو اپنی گرفت اور اپنے احاطہ میں لے لے' یعنی جسے ہم کامل انقلاب (Complete Revolution) کہہ سکیں' وہ تو صرف انقلابِ محمدیؐ ہے جو آج سے چودہ سو سال قبل جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب میں برپا کیا تھا۔ لیکن اس سے نیچے اتر کر وہ انقلابات جو کسی نہ کسی درجہ میں "انقلاب" کا عنوان پانے کے مستحق بن سکتے ہیں ان میں دو انقلابات قابل ذکر ہیں۔ ایک ہے انقلابِ فرانس' جس کے نتیجہ میں سیاسی ڈھانچہ بدل گیا تھا۔ یعنی ملوکیت کا دور ختم ہوا اور جمہوریت کے دور کا آغاز ہوا۔ اسی طرح دوسرا انقلاب جس پر لفظ انقلاب کا کسی درجہ میں اطلاق ہوتا ہے وہ ہے روس کا انقلاب یعنی بالشویک انقلاب جس کے نتیجہ میں معیشت کا پورا ڈھانچہ بدل گیا' تمام ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت سے نکل کر اجتماعی ملکیت میں لے لئے گئے۔ آغاز میں تو وہاں بہت انتہاپسندی تھی کہ انفرادی ملکیت کی کامل نفی تھی' لیکن ہوتے ہوتے پھر وہ یہاں تک پہنچے کہ ذاتی استعمال کی چیزیں انفرادی ملکیت ہو سکتی ہیں۔ جیسے ایک شخص کے پاس سائیکل ہے جس پر وہ دفتر یا کارخانے جاتا ہے تو یہ اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ کسی شخص کے پاس رہنے کے لئے مکان ہے تو وہ اس کی ذاتی ملکیت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے پاس گھریلو استعمال کا جو سامان ہے' وہ بھی اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ لیکن ذرائع پیداوار (Means of Production) جن سے انسان مزید پیدا کرتا ہے' جسے وہ آمدنی کا ذریعہ بناتا ہے' کسی فرد کی ملکیت میں نہیں رہیں گے' بلکہ وہ پوری قوم اور ریاست کی ملکیت قرار پائیں گے اور حکومت ان کا انتظام کرے گی۔ ان ذرائع پیداوار سے

جو یافت ہو گی، حکومت کوشش کرے گی کہ اس کو پوری قوم میں ایک مقررہ معیار کے مطابق حصہ رسدی کے اصول پر تقسیم کر دیا جائے ـــــ بہرحال یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے اور اس تبدیلی کے اعتبار سے بالشویک ریوولیوشن بھی یقیناً ایک انقلاب تھا۔ الغرض سیاسی سطح پر انقلابِ فرانس اور معاشی سطح پر انقلابِ روس یقیناً "انقلابات" قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں۔ اور ان دونوں میں آپ کو یہ قدرِ مشترک نظر آئے گی کہ یہ انقلابات اپنے ملکوں تک محدود نہیں رہے بلکہ وسعت پذیر ہوئے۔ انقلابِ فرانس کے نتیجہ میں جمہوریت کا جو سیاسی نظام آیا وہ صرف فرانس تک محدود نہیں رہا بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں جمہوریت کے قیام کیلئے تحریکیں چلیں اور کامیاب ہوئیں۔ اگرچہ آپ کو یہ عجیب بات نظر آئے گی کہ یورپ میں بعض ممالک نے ابھی تک بادشاہت کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے لیکن دراصل اس کی حیثیت محض آرائشی و زیبائشی نوعیت کی ہے۔ ورنہ درحقیقت ملوکیت کا دور ختم ہو چکا ہے اور اب جمہوریت ہی کا دور ہے۔ اسی طرح روس کا جو انقلاب تھا اس کے بطن سے نہ معلوم کتنے انقلابات برآمد ہوئے اور کرۂ ارضی پر نصف کے لگ بھگ ممالک ایسے ہوں گے جن پر کسی نہ کسی شکل میں اس نظریہ کی حکمرانی قائم ہوئی جس کے تحت ۱۹۱۹ء میں روس میں پہلا انقلاب آیا تھا۔

انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کے حوالے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ کسی بھی حقیقی و واقعی انقلاب میں بنیادی طور پر وسعت پذیری کی خصوصیت و صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے معاملے میں تو اس کی اہمیت و ضرورت کئی گنا بڑھ جاتی ہے کہ آپؐ کا لایا ہوا انقلاب محض جزیرہ نمائے عرب کی حد تک محدود نہ ہو جائے بلکہ آگے بڑھے اور پھیل جائے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ خاتم النبیین بھی ہیں اور آخر المرسلینؐ بھی ـــــ اور آپ کی دعوت محض اہل عرب کے لئے نہ تھی بلکہ پوری نوعِ انسانی کے لئے تھی۔ لہٰذا آپؐ کے مقصد بعثت کا بھی یہ تقاضا تھا کہ آپؐ نہ صرف یہ کہ عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل بنفسِ نفیس فرمائیں

بلکہ اپنی حیاتِ طیبہ ہی میں اس کے بین الاقوامی مرحلہ کا آغاز فرماکر مستقل طور پر اُمّت کی رہنمائی فرمادیں۔

تاہم انقلابِ محمّدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل درحقیقت اُس وقت ہوگی جب پورے کرۂ ارضی پر دین حق اسی طرح غالب ہو جائے جیسے نبی اکرم ﷺ نے آج سے چودہ سو سال قبل جزیرہ نمائے عرب پر غالب فرمادیا تھا۔ چنانچہ آفاقی سطح پر انقلابِ محمّدیؐ کی تکمیل کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ اس مفہوم کو علامہ اقبال مرحوم نے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے کہ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے!
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

یعنی جب تک نورِ توحید سے پورا کرۂ ارضی جگمگا نہیں اُٹھتا اُس وقت تک اُمت مرحومہ اطمینان کا سانس نہیں لے سکتی۔ اس پر تو لازم ہے کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کی جدوجہد مسلسل جاری رکھے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ .... ﴾ "اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کیلئے جہاد کا حق ہے۔ (اے اُمت مسلمہ) اُس (اللہ) نے تمہیں (اس کام کیلئے) چن لیا ہے..."

اقسامِ توحید

توحید کی ایک قسم علمی و فکری یعنی عقیدہ کی توحید ہے کہ اللہ کو ذات و صفات کے اعتبارات سے ایک مانا جائے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل : ۱۱۱)

"اور کہہ دو سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں' جس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کا سلطنت میں شریک ہے اور نہ کوئی کمزوری کی وجہ سے اس کا مددگار ہے۔ اور اس کی بڑائی بیان کرتے رہو' کمال درجے کی بڑائی"۔

جبکہ توحید کی دوسری قسم عملی توحید ہے' یعنی صرف اللہ ہی کے بندے بن جانا۔ فرمایا:

﴿ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ .... ﴾

"اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے (اس) رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا۔"

اللہ کی اطاعت کو اپنے آپ پر اس طرح لازم و فرض کرلینا کہ اُس کی اطاعت سے آزاد کسی اور کی اطاعت اس میں شامل نہ ہو۔ اس عملی توحید کا اجتماعی سطح پر تقاضا اُس وقت پورا ہوگا جب وہ نظام قائم ہو جائے گا جس میں حاکمِ مطلق (Supreme Authority) صرف اللہ کو مانا جائے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ یعنی نہ صرف یہ تسلیم کیا جائے کہ قانون و شریعت دینے کا اختیار صرف اُس (تعالیٰ) کے پاس ہے۔ بلکہ بالفعل اللہ کے دین اور اس کی شریعت کو پورے اجتماعی نظام پر غالب و نافذ کر دیا جائے۔ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا۔ یہی عملی توحید ہے۔ اور توحید کی یہ شکل جب تک عالمی سطح پر عملی اعتبار سے مکمل طور پر قائم و نافذ نہیں ہوتی اُس وقت تک انقلابِ محمدی ؐ کی تکمیل کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ گویا

ع نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

آنحضور ؐ پر تکمیلِ نبوّت و رسالت اور اس کے تقاضے

آفاقی رسالت

قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کے اعتبار سے یہ بات بہت اہم ہے کہ حضور ﷺ سے پہلے جتنے رسول آئے' ان سب میں بلا استثناء یہ بات مشترک نظر آتی ہے کہ ان کی رسالت دو اعتبارات سے محدود تھی۔ ایک مکانی لحاظ سے ' کہ وہ اپنی اپنی قوموں

کی طرف یا کسی مخصوص علاقہ کی طرف مبعوث ہوئے۔ سورۂ ہود اور سورۂ قصص میں رسولوں کا ذکر اسی انداز میں ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی رسالت زمانی اعتبار سے بھی محدود تھی کہ ہر رسول کی رسالت اُس وقت تک کے لئے تھی جب تک اگلا رسول نہیں آجاتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اگلا رسول آتا تھا پہلے کا دَورِ رسالت ختم ہو جاتا تھا۔ یعنی آنے والے رسول کو ملنے والی ہدایت اور شریعت میں جتنی سابقہ چیزیں برقرار رکھی جاتیں وہ آنے والی ہدایت اور شریعت کا جزو بن جاتیں' باقی منسوخ ہو جاتیں ــــــ گویا نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل رسالت کا معاملہ مکانی اور زمانی دونوں اعتبارات سے محدود رہا ہے۔

تکمیلِ نبوّت و رسالت

نبوت کی تکمیل کا مظہر یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہدایت کامل کر دی گئی۔ سابقہ انبیاء و رُسل علیہم السلام کو جو کچھ بذریعہ وحی ملتا رہا ہے اس کا کامل' مکمل اور محفوظ ایڈیشن قرآن مجید ہے ؎

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رحمۃٌ لّلعالمیں!

چنانچہ ہدایت الٰہی کا یہ آخری اور کامل ایڈیشن آگیا تو گویا کہ نبوت کامل ہو گئی۔

رسالت کی تکمیل کے دو مظہر ہیں۔ ایک یہ کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی رسالت مکانی اور زمانی دونوں اعتبارات سے غیر محدود ہے۔ اس لئے کہ ایک جانب آپؐ کی رسالت کرۂ ارضی پر بسنے والی تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے اور دوسری جانب آپؐ کی رسالت کا دور دائمی ہے۔ یعنی تا قیامِ قیامت آپؐ ہی کی رسالت کا دور ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارات موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ سبا میں ارشاد ہے : ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا.... ﴾ "اور (اے نبیؐ) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام نوعِ انسانی کے لئے بشیر و نذیر بنا کر...."

گویا کہ مکانی حدود ختم ہوئیں۔ کیونکہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پورے کرۂ ارضی کے لئے ہے اور آپؐ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہوئی ہے۔ آپؐ کی مخاطب کوئی ایک قوم' کوئی ایک قبیلہ' کوئی ایک نسل' کوئی ایک علاقہ' کوئی ایک ملک اور کسی ایک دور کے انسان نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی ہے۔ یہ چیز جہاں مکانی اعتبار سے غیر محدود ہے وہاں زمانی اعتبار سے بھی غیر محدود ہے کہ اب تا قیامِ قیامت کوئی نبی اور رسول آنے والا نہیں۔ اب حضور ﷺ کا دورِ رسالت ہے جو قیامت تک قائم و دائم رہے گا۔

تکمیل و ختمِ نبوت کا منطقی تقاضا

قرآن حکیم سے جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں اور آپؐ کی رسالت تا قیامِ قیامت دائم اور جاری و ساری ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خاتم الانبیاء و آخر الرسل محمد ﷺ جو دین حق دے کر مبعوث فرمائے گئے تھے اور جس دین کو تمام نظامہائے حیات پر غالب کرنا آپؐ کا فرضِ منصبی قرار دیا گیا تھا' اس دین کی دعوت و تبلیغ اور اقامت کا کام جاری رہے۔ چنانچہ اب یہ فریضہ اُمّتِ مسلمہ کے سپرد ہوا۔ یعنی ایک طرف اللہ کا پیغام تمام بنی نوعِ انسان تک اس درجہ میں پہنچا دینا کہ لوگوں پر حجت قائم ہو جائے کہ وہ اللہ کے یہاں یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ ہم تک تیرا پیغام نہیں پہنچا۔ اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ پورے کرۂ ارضی پر دین حق کو بالفعل غالب و قائم کرنا بھی اس اُمت کی ذمہ داری ہے۔ اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ بنفسِ نفیس اپنے مشن کی ایک حد تک تکمیل فرما کر اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل ہو گئی' لیکن آپؐ کا مشن تو در حقیقت اُس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچے گا جب پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا پرچم سب سے بلند ہو گا۔

اس پہلو سے جہاں تک نبی اکرم ﷺ کا تعلق ہے تو حضورؐ اپنے فرضِ منصبی کے

اعتبار سے اس پر مامور تھے کہ آپؐ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل بنفس نفیس فرمادیں۔ یہ گویا آپؐ کی آفاقی‘ عالمی اور دائمی بعثت و رسالت کا اولین مرحلہ تھا جو پورا ہوا ___ لیکن ابھی بین الاقوامی اور عالمی سطح پر دعوت و تبلیغ کا کام باقی تھا جس کا نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ دُنیوی کے دوران بنفسِ نفیس آغاز فرما کر پھر اس مشن کو اُمّت کے حوالے فرمادیا کہ اب اس فریضہ کی عالمی سطح پر تکمیل تمہارے ذِمّہ ہے۔ اب ایک ایک فردِ نوعِ بشر تک دعوت و تبلیغ اور شہادت علی الناس کا فرض تمہیں انجام دینا ہے اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا بول بالا کرنا یعنی ''اسلامی انقلاب'' تم نے برپا کرنا ہے۔

دعوت و تبلیغ کے ضمن میں ایک اصولی بات

یہ بات واضح ہونے کے بعد کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت و رسالت آفاقی و عالمی ہے اور تاقیامِ قیامت حضورؐ ہی کا دَورِ رسالت جاری رہے گا۔ ہمیں سیرتِ مطہرہ کے حوالے سے اور تاریخی اعتبار سے یہ اصولی بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کے مرکز مکّہ مکرمہ سے اس وقت تک قدم باہر نہیں رکھا جب تک آپ اہل مکّہ سے قطعی طور پر مایوس نہیں ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ پر وحی کا آغاز ۶۱۰ء عیسوی میں ہوا۔ اس کے بعد سے لے کر مسلسل اٹھارہ اُنیس برس تک حضور ﷺ کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ صرف عرب تک محدود رہا۔ ان میں بھی ابتدائی دس برس تو وہ ہیں کہ آپؐ دعوت و تبلیغ کا کام مکّہ ہی میں انجام دیتے رہے۔ اس میں اگر کوئی استثناء ہے تو صرف یہ کہ مکّہ کے آس پاس جو میلے لگتے تھے ان میں دعوت و تبلیغ کے لئے آپؐ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ان میں عُکّاظ کا میلہ یا بازار بہت مشہور رہے۔ یہ ان میلوں میں سب سے بڑا ہوتا تھا اور اس میں عرب کے کونے کونے سے شعراء اور خطباء آکر جمع ہوتے تھے‘ وہاں مجلسیں اور محفلیں جمتی تھیں اور شعراء کے مابین مقابلے ہوا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کا دعوت و تبلیغ کے لئے

ان میلوں میں تشریف لے جانا تاریخی طور پر ثابت ہے۔ یا پھر آپؐ اسی مقصد کے لئے ان قافلوں کی طرف تشریف لے جاتے تھے جو وقتاً فوقتاً مختلف ضروریات کے لئے مکّہ آتے تھے اور مکّہ سے باہر پڑاؤ ڈالتے تھے' مکّہ سے ضروریاتِ زندگی کی چیزیں لیتے اور پھر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ ان مستثنیات کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے دعوت و تبلیغ کے لئے کامل دس برس تک مکّہ سے باہر قدم نہیں نکالا اور حضورؐ کی ساری دعوت و تبلیغ مکّہ تک محدود رہی۔

۱۰نبوی میں دار النّدوۃ میں مشورہ کے بعد محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے قتل کا فیصلہ کر لیا گیا۔ چنانچہ اہل مکّہ سے نا اُمید ہو کر رسول اللہ ﷺ نے طائف کا سفر اختیار فرمایا' لیکن اہل طائف کی طرف سے ایک ہی روز میں جس توہین و تذلیل اور جسمانی اذیت سے سابقہ پیش آیا اس کی دس سالہ مکی دور میں نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ آپؐ کو ایک مشرک مطعم بن عدی کی پناہ لے کر واپس مکّہ آنا پڑا۔

جب بظاہر احوال ہر طرف سے راستہ بند نظر آیا تو اللہ تعالیٰ نے یثرب کی طرف ہجرت کا راستہ کھول دیا۔ ہجرت کے بعد چھ برس کے دوران دعوتِ توحید کا دائرہ بتدریج جزیرہ نمائے عرب میں پھیلنے لگا۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ان چھ برسوں کے دوران رسول اللہ ﷺ نے نہ اپنا کوئی داعی یا مبلغ عرب کی حدود سے باہر بھیجا اور نہ ہی اپنے کسی جان نثار کو اپنا نامہ مبارک دے کر یا کوئی پیغام دے کر بیرون عرب بھیجا۔ البتہ ٦ ھ میں جب صلح حدیبیہ ہو گئی' جسے قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا' تب حضورؐ کی دعوتی سرگرمیاں جہاں اندرونِ عرب عروج پر پہنچیں' وہاں حضورؐ نے بیرون عرب بھی دعوت و تبلیغ کا آغاز فرمایا۔

دعوت و تبلیغ کے بین الاقوامی مرحلہ کا آغاز

فتح خیبر کے بعد ۷ ھ کے اوائل ہی میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے دعوتی و تبلیغی نامہ ہائے مبارک دے کر چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قیصر روم' کسریٰ ایران' عزیزِ مصر'

شاہِ حبشہ اور ان رؤسائے عرب کی طرف بھیجا جو جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں پر آباد تھے اور جنہوں نے اُس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ان میں سے بعض قبائل قیصر روم کے اور بعض کسریٰ ایران کے باج گزار تھے۔ سیرت کی تمام مستند کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے نامہ ہائے مبارک کی ترسیل سے قبل مسجد نبویؐ میں تمام صحابہ کرام ؓ کو جمع کیا اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں حضور ﷺ نے اسی حقیقت کو بیان کیا کہ میری بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام جہان والوں کے لئے رحمت اور رسول بنا کر بھیجا ہے ''بفحوائے آیت قرآنی ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ میں نے اب تک دعوت تمہیں پیش کی ہے۔ اب اے مسلمانو! تمہارے ذمہ ہے کہ تم اس دعوت اور پیغام کو لے کر تمام اطراف و اکناف عالم میں پھیل جاؤ اور اللہ کی توحید کو عام کرو۔ گویا نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلہ کا افتتاح اس خطبہ کے ذریعہ سے فرمایا۔

خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ملوک و سلاطین کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے خطوط تحریر کرائے اور اپنے مختلف اصحاب کے ہاتھ آس پاس کے علاقوں کے حکمرانوں اور سرداروں کو اپنے نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے۔ ظاہر بات ہے کہ اس ضمن میں "اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ" کا لحاظ ضروری تھا۔ یوں تو ہندوستان بھی تھا' چین بھی تھا' ایشیا اور یورپ کے نہ معلوم کتنے ممالک تھے لیکن پہلا دائرہ تو قریب کے علاقوں کا ہی ہو سکتا تھا جو جزیرہ نمائے عرب کے چاروں طرف تھے۔

قیصرِ روم کے دربار میں حضرت دحیہ کلبی ؓ نامۂ مبارک دے کر بھیجے گئے۔ یہ وہ صحابی ہیں جن کے بارے میں روایت آتی ہے کہ وہ شکل و صورت میں نبی اکرم ﷺ سے بہت مشابہ تھے اور نہایت حسین تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب انسانی شکل میں تشریف لاتے تھے تو حضرت دحیہ کلبی ؓ کی شکل میں آتے تھے

حضرت عبداللہ بن حذیفہ سہمی رضی اللہ عنہ کو خسرو پرویز کسریٰ ایران کی طرف بھیجا گیا۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ عزیزِ مصر کی طرف بھیجے گئے۔ مصر اُس وقت ایک نیم آزاد ملک تھا جو سلطنت روما کا باج گزار تھا۔ عزیز مصر خود بھی عیسائی تھا اور سلطنت روما کے ماتحت تھا۔ حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو شاہِ حبش نجاشی کی طرف بھیجا گیا۔ حبشہ بھی مصر کی طرح سلطنت روما کا باج گزار تھا اور وہاں کا بادشاہ بھی مذہباً عیسائی تھا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ وہ نجاشی رحمۃ اللہ علیہ جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کا ایمان اس اعتبار سے بالکل انفرادی نوعیت کا تھا کہ اس موقع پر کوئی "Mass Convertion" نہیں ہوئی تھی۔ یعنی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ان کے تمام درباری اور پوری رعایا نے اسلام قبول کر لیا ہو' بلکہ قبولیتِ اسلام کا معاملہ ان کی ذات تک محدود تھا۔ جب ان کے انتقال کی خبر بذریعہ وحی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپؐ نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ ان کے بعد جو نجاشی تخت نشین ہوا وہ عیسائی تھا۔

حضرت سلیط بن عمر بن عبد شمس رضی اللہ عنہ رؤسائے یمامہ کی طرف بھیجے گئے۔ یمامہ جزیرہ نمائے عرب ہی کا شمال مشرقی علاقہ ہے۔ آج کل یہ علاقہ نجد میں شامل ہے۔ حضرت شجاع بن وہب الاسدی رضی اللہ عنہ حدودِ شام میں حارث غسانی کے پاس بھیجے گئے۔ شام بھی اُس وقت سلطنت روما کے زیرِ حکومت تھا اور وہاں قیصر کی طرف سے غسانی خاندان حکمران تھا۔ گویا کہ شام کی وہی پوزیشن تھی جو انگریزی دورِ حکومت میں برِّصغیر کی بڑی ریاستوں کو حاصل تھی۔ ان کے علاوہ بعض دیگر رؤساء و سرداران کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے۔

ان نامہ ہائے مبارک کے نتیجہ میں سلاطین کی جانب سے مختلف ردعمل سامنے آئے۔ ایک طرف ان بادشاہوں اور حکمرانوں کا ردعمل ہے جو مذہباً عیسائی تھے۔ ان کے مقابلہ میں بالکل برعکس ردعمل کسریٰ ایران کا ہے۔ وہ مجوسی تھا' مشرک تھا اور وحی و نبوت اور اُمورِ رسالت سے بالکل نابلد اور ناواقف تھا' جبکہ عیسائیوں کا

معاملہ یہ تھا کہ وہ اہل کتاب تھے' ان کے پاس تورات اور انجیل موجود تھی۔ وہ حضرت ابراہیم' حضرت اسحٰق' حضرت اسمٰعیل' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے ناموں سے واقف تھے اور ان سب پر ایمان رکھتے تھے۔ قیصر روم کے بارے میں مستند تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بہت بڑا عالم تھا۔

قیصرِ روم کے نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک

حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ جو قیصر روم کے نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر چلے تھے جب دمشق کے قریب بصریٰ کے مقام پر پہنچے جو غسانیوں کا دارالحکومت تھا تو ان کو پتہ چلا کہ قیصر ان دنوں یروشلم میں ہے۔ اُس وقت اس خاندان کا رئیس حارث غسانی تھا۔ حارث غسانی نے حضرت دحیہؓ کو قیصر کے پاس بیت المقدس بھیج دیا۔ چنانچہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک لے کر یروشلم پہنچ گئے۔

جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک جب قیصر کو پہنچا تو چونکہ وہ خود توراۃ و انجیل کا عالم تھا للٰہذا خط پڑھتے ہی جان گیا کہ یہ وہی آخری رسول ہیں کہ جن کی بعثت کی ہمارے یہاں پیشین گوئیاں موجود ہیں ـــــ آخر وہ بھی شام کا عیسائی راہب ہی تھا جس نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو یہ خبر دے کر مدینہ کی طرف بھیجا تھا کہ میرا علم بتاتا ہے کہ نبی آخر الزماں کے ظہور کا وقت آ گیا ہے اور ان کی بعثت عرب کے ریگستان اور کھجوروں کے جھنڈ میں ہو گی۔ معلوم ہوا کہ یہ بات عیسائیوں کے خدا ترس رہبان و احبار جانتے تھے کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت اب قریب ہے ـــــ قیصر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ آخری نبی کا ظہور شام میں ہو گا' مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی بعثت عرب میں ہو گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک پڑھ کر اور آپؐ کو پہچان کر قیصر کا جو طرزِ عمل سامنے آتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چاہتا تھا کہ اگر میری پوری مملکت ایمان لے آئے تو گویا ہم اجتماعی طور پر (En Bloc) مسلمان ہو جائیں گے' اور اس طرح میری مملکت بھی قائم رہے گی اور

میری حکومت بھی برقرار رہے گی۔

گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ غیر عرب غیر مسلموں کے لئے مسلمانوں کی تین شرطیں ہوتی تھیں۔ ایک یہ کہ اگر تم ایمان لے آؤ تو تم ہمارے بھائی ہو گے' تمہاری تمام املاک' تمہاری عزت و آبرو الغرض تمہاری ہر شے محفوظ اور برقرار (Intact) رہے گی۔ تمہیں وہ تمام حقوق مساوی طور پر حاصل ہوں گے جو بحیثیت مسلمان ہم کو حاصل ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ منظور نہیں اور تم ایمان نہیں لاتے تو چھوٹے یعنی ماتحت اور ذِمی بن کر رہو اور جزیہ ادا کیا کرو : ﴿ . . . يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝﴾ ملکی قانون (Law of the land) بہرصورت اسلام کا ہو گا۔ ہاں کسی کو بزورِ شمشیر اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ تمام غیر مسلموں کو ان کے احوالِ شخصیہ (Personal law) میں پوری آزادی ہو گی' حتیٰ کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق پوجا پاٹ کا جو طریقہ اختیار کرنا چاہیں اس میں اسلامی حکومت کوئی مداخلت نہیں کرے گی ــــــ اور تیسرے یہ کہ اگر یہ بھی منظور نہیں ہے تو پھر میدان میں آؤ' ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ ان تین کے سوا چوتھی اور کوئی صورت نہیں ہے۔

قیصر کی اس خواہش اور کوشش کا بھی ایک تاریخی پس منظر ہے کہ اس کے عمائدین سلطنت اور اس کی رعیت مجموعی طور پر ایمان لے آئے اور اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ جن لوگوں نے یورپ اور خاص طور پر عیسائیت کی تاریخ پڑھی ہے' ان کے علم میں ہو گا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کے قریباً ساڑھے تین سو برس بعد روما۔ الکبریٰ (موجودہ اٹلی) کے شہنشاہ کنسٹنٹائن (قسطنطین) اور اس کی پوری رعایا نے مجموعی طور پر (En Bloc) عیسائیت قبول کر لی تھی۔ لہٰذا کسی نوعِ کا اعتقادی یا سیاسی مسئلہ اور تنازعہ کھڑا نہیں ہوا اور قسطنطین کی شہنشاہیت جوں کی توں برقرار رہی۔ اسی سبب سے ایک طرف یورپ میں عیسائیت نے فروغ پایا اور دوسری طرف شہنشاہِ روم نے اپنا پایۂ

تخت روم کو چھوڑ کر استنبول کو قرار دیا۔ چنانچہ اس کے نام پر اس شہر کا نام قسطنطنیہ رکھا گیا۔ وہاں سے اس نے ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ پر فوج کشی کی اور عیسائیت کو فروغ دینے کی مہمات شروع کیں جن میں اس کو خاطرخواہ کامیابی حاصل ہوئی ـــــ اس تاریخی تناظر میں دیکھئے تو قیصر کا طرز عمل سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ نامہ مبارک کے ذریعے حضورؐ کو پہچان لینے کے بعد اس نے چاہا کہ اس کی پوری مملکت اسی طرح اسلام کو قبول کرے جیسے قریباً ساڑھے تین سو سال قبل پوری سلطنت روم نے عیسائیت کو بطور مذہب اختیار کر لیا تھا تاکہ اس کی حکومت قائم و برقرار رہے۔

لیکن اس کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ اس کے لئے تدبیر کیا ہو؟ اس کے دربار میں بڑے بڑے جغادری عیسائی علماء موجود تھے' قِسّیسِین تھے' بطریق تھے' تمام عمائد و اعیانِ حکومت تھے' پھر فوج تھی' اب ان سب کو کس طرح راضی کیا جائے؟ ان منصب داروں اور امراء (Lords) کے بل پر اس کی حکومت قائم تھی۔ لہٰذا جب تک یہ لوگ مطمئن ہو کر ایمان نہ لائیں اس کی حکومت کو خطرہ لاحق تھا۔ اس نے کچھ دیر توقف کیا' ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی' اس نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ ان دنوں عربوں کا کوئی تجارتی قافلہ تو یہاں نہیں آیا؟ بتایا گیا کہ عربوں کا ایک تجارتی قافلہ اس علاقے میں آیا ہوا ہے اور فی الوقت غزہ میں مقیم ہے۔ قیصر نے فوراً قاصد بھیج کر قافلے کے لوگوں کو یروشلم بلا لیا۔ اس قافلہ کے رئیس ابوسفیان تھے جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔

ہرقل قیصر روم نے ایک عالی شان دربار منعقد کیا۔ اس موقع پر بیت المقدس میں اس کے جو اعیان و عمائد مملکت اور سپہ سالار موجود تھے' ان کو جمع کیا۔ پھر بطارقہ' قِسّیسِین اور اَحبار و رُہبان کی صفیں لگوائیں اور دربار میں ابوسفیان کو ان کے ہمراہیوں سمیت بلایا گیا۔ پہلے تو دربار میں نبی اکرم ﷺ کا نامہ مبارک پڑھ کر سنایا گیا۔ (اس نامہ گرامی کا متن ابن ہشام اور طبری نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا

ہے اور بحمد اللہ یہ نامہ مبارک اپنی اصل حالت میں اب بھی قسطنطنیہ کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔)

نبی اکرم ﷺ کے نامہ مبارک کی عبارت یہ ہے :

((مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى هِرْقل عَظِيمِ الرُّوْمِ' سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى' اَمَّا بَعدُ فَاِنِّي اَدْعُوكَ بِدعايَةِ الاسْلَامِ' اَسْلِمْ تَسْلِمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ' فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ عَلَيْكَ اِثْمَ اَلاَرِيسِيِّيْنَ' و يا اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلاَّ نَعْبُدَ اِلاَّ اللّٰهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ))

"محمد (ﷺ) کی طرف سے 'جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں' ہرقل کے نام جو روم کا رئیس اعظم ہے۔ سلامتی ہے ہر اُس شخص کے لئے جس نے ہدایت (ربانی) کی پیروی کی۔ اس کے بعد (اے رئیس اعظم!) میں تجھے دعوتِ اسلام کی طرف بلاتا ہوں' اسلام قبول کرلے تو تُو سلامت رہے گا۔ (بلکہ) اللہ تعالیٰ تجھے دہرا اجر عطا فرمائے گا۔ اگر تُو نے (قبول کرنے سے) اعراض کیا (تو نہ صرف تو اکیلا مجرم ٹھہرے گا بلکہ) اہل ملک کا گناہ (بھی) تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف پیش قدمی کرو جو ہمارے اور تمہارے مابین مساوی ہے' (وہ) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کریں اور نہ ہی ہم اس ہستی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں' اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو (اپنا) پروردگار تسلیم کرے۔ پس اگر وہ (اہل کتاب دعوتِ اسلام کو قبول کرنے سے) اعراض کریں تو (اے مسلمانو!) تم (انہیں) کہہ دو کہ (اے اہل کتاب ہمارے معاملہ میں) تم گواہ رہو کہ ہم تو (ہر حال میں اس دعوت پر) سرِ تسلیم خم کردینے

والے ہیں۔"

نامۂ مبارک کے چند اہم نکات

نامہ مبارک میں حضور ﷺ نے جو یہ بات رقم کرائی کہ : ((يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ)) تو حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اہل کتاب میں سے جو مجھ پر ایمان لاتا ہے' اسے اللہ دوہرا اجر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ پہلے نبیوں اور رسولوں کو ماننے والا بھی تھا اور اب وہ مجھ پر بھی ایمان لے آیا ہے۔ آگے جو حصہ ہے کہ : ((فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ عَلَيْكَ اِثْمُ الاَرِيسِيِّيْنَ)) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی حیثیت ایسی ہوتی ہے جیسے قیصر روم کی تھی کہ اگر وہ ایمان لے آتا تو چاہے پوری رعیت ایمان نہ لاتی لیکن لاکھوں لوگ تو ایمان لے آتے' چنانچہ ان کا اجر بھی اس کے حصہ میں آتا۔ لیکن اس نے روگردانی کی جس کے باعث رومی دولت ایمان سے محروم ہو گئے تو ان کا وبال بھی قیصر کے حصہ میں آئے گا۔ اس لئے کہ کسی ملک' کسی قوم' کسی قبیلہ کے سربراہ کفر پر اَڑے رہیں تو وہ دعوتِ اسلامی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ جو بھی نظامِ باطل کسی جگہ قائم ہوتا ہے تو وہ نظامِ حق کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ نے اس بات کو ایک مختصر سے جملہ میں نہایت بلاغت و فصاحت کے ساتھ سمو دیا۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۶۴ اپنے نامہ مبارک میں درج کرائی ہے۔ اکثر اہل علم کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں اہل کتاب کو توحید کی دعوت اور اسلام کا پیغام دینے کے جتنے بھی اسالیب آئے ہیں ان میں اس آیت کا اسلوب نہایت بلیغ اور مؤثر ترین ہے۔ نجران سے جب عیسائی اَحبار و رُہبان کا ایک وفد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اسلام کی دعوت سمجھنے کے لئے آیا تھا تو اس موقع پر حضورؐ پر جو وحی نازل ہوئی تھی' اس میں یہ آیت مبارکہ بھی شامل ہے۔ اس سے اس کی عظمت' اس کے جلال' اس کی تاثیر اور اس کے محکم ہونے کا

اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس آیت کا ایک ٹکڑا ہے : ﴿ وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ "ہم میں سے کوئی اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا رب نہ بنا لے۔" اللہ کے سوا جن ہستیوں کو رب بنایا جاتا ہے ان میں مذہبی رب بھی ہوتے ہیں' جیسے اصنام اور مظاہرِ قدرت کی پرستش' اوتار' حلول اور اسی نوع کے دوسرے عقائد ـــــ اور سیاسی نوعیت کے رب بھی ہوتے ہیں۔ یعنی جسے بھی اللہ کے سوا مختار و مطاعِ مطلق تسلیم کر لیا جائے وہی تسلیم کرنے والوں کا رب ہے۔ درحقیقت فرعون و نمرود نے خدائی کا دعویٰ اسی اعتبار سے کیا تھا کہ وہ بادشاہ اور حاکمِ مطلق ہیں' چنانچہ وہ اپنی رعیت کے رب اور خدا ہیں۔ یہ دراصل سیاسی شرک ہے۔ آج جو لوگ عوام کی مطلق حاکمیت کے نظریہ کے حامی اور پرچارک ہیں وہ اسی سیاسی شرک میں مبتلا ہیں۔ لیکن عظیم اکثریت کو اس کا شعور حاصل نہیں ہے۔

قیصر اور ابوسفیان کا مکالمہ

اس کے بعد قیصر اور ابوسفیان کے مابین جو مکالمہ ہوا اس پر غور کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہرقل نے ابوسفیان سے بالکل اسی انداز میں جرح کی جیسے وکلاء بحث و جرح کرتے ہوئے حقائق و دلائل کو واضح کرنے کے لئے Suggestive Questions کرتے ہیں۔ یعنی ایسے سوالات کہ جن کے جوابات کے ذریعے از خود جرح کرنے والے کے موقف کی تائید ہوتی چلی جائے اور بات اس انداز میں کھل کر سامنے آ جائے کہ سامعین کے لئے حق کو پہچان لینا بالکل آسان ہو جائے۔ ابوسفیان سے ہرقل نے جس گہرائی کے ساتھ سوالات کئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس پایہ کا عالم تھا اور یہ کہ وہ حضور ﷺ کو نبی آخر الزمان کی حیثیت سے پہچان چکا تھا۔ ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کا ایک قول ملتا ہے' جو ایمان لانے کے بعد کا ہے کہ خدا کی قسم اس مکالمہ کے دوران کئی بار میرا جی چاہا کہ میں جھوٹ بول دوں' اس لئے کہ قیصر کے سوالات مجھے گھیرتے چلے جا رہے تھے اور میں محسوس کر رہا

تھا کہ میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی ہے ــــ لیکن میں نے سوچا کہ میرے ساتھی کیا کہیں گے کہ قریش کا اتنا بڑا سردار جھوٹ بول رہا ہے۔ چنانچہ میں جھوٹ نہیں بول سکا۔ اس بات سے عربوں کی یہ ایک مزاجی خصوصیت سامنے آتی ہے کہ دورِ جاہلیت میں بھی بے شمار برائیوں کے باوجود ان میں چند اعلیٰ انسانی اوصاف موجود تھے۔ مکالمہ ملاحظہ فرمائیے۔

قیصر ــــ مدّعیٔ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان ــــ شریف ہے۔

قیصر ــــ اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان ــــ نہیں۔

قیصر ــــ اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان ــــ نہیں۔

قیصر ــــ جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے' وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحبِ اثر؟

ابوسفیان ــــ کمزور لوگ ہیں۔

قیصر ــــ اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جا رہے ہیں؟

ابوسفیان ــــ بڑھتے جا رہے ہیں۔

قیصر ــــ کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہوا ہے؟

ابوسفیان ــــ نہیں۔

قیصر ــــ وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان ــــ ابھی تک تو نہیں کی' لیکن اب جو نیا معاہدۂ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

قیصر ــــ تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی؟

ابوسفیان ــــ ہاں۔

قیصر ــــ نتیجۂ جنگ کیا رہا؟

ابو سفیان ـــــ کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔

قیصر ـــــ وہ کیا سکھاتا ہے۔

ابو سفیان ـــــ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو' کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ' نماز پڑھو' پاکدامنی اختیار کرو' سچ بولو' صلہ رحمی کرو۔

علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ اس مکالمہ کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے یہ تبصرہ کیا :

"تم نے اس کو شریف النسب بتایا' پیغمبر اچھے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا' اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا' اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا' جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا' وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے (تو) پیغمبر کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے' سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا' پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے' اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ مجھے یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے' لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہو گا۔ اگر میں وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔"

یہ ہے ہرقل قیصر روم کا تبصرہ جو کتب سیر میں محفوظ ہے۔

قیصر کی بدبختی

اب اصل امتحان آتا ہے جرأت کا' ہمت کا' قربانی کا' ایثار کا۔ اور اس بات کا کہ انسان حق کے لئے کیا کچھ چھوڑنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اس مکالمہ کے دوران

قیصر نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے گفتگو آگے بڑھ رہی ہے اور درباریوں کو اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ قیصر کا جھکاؤ اسلام کی جانب ہے اسی نسبت سے دربار میں موجود بطارقہ اور احبار و رہبان کے نتھنے اندرونی غیظ و غضب کے باعث پھول رہے ہیں' اور برہمی و غصہ سے ان کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی ہیں اور اسی طرح اس نے اپنے عمائد و اعیانِ حکومت اور اپنے سپہ سالاروں کے تیور بگڑتے ہوئے دیکھے تو اسے اپنے اقتدار کو خطرہ محسوس ہوا۔ چنانچہ اس صورت حال سے خوف زدہ ہو کر اس نے عربوں کو دربار سے اٹھادیا اور رسول اللہ ﷺ کے سفیر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو کسی جواب کے بغیر واپس جانے کا حکم سنادیا۔ ورنہ قرائن بتاتے ہیں کہ اس کے دل میں نورِ ایمان کی کرن پہنچ چکی تھی لیکن تاج و تخت' اقتدار و حکومت اس کے پاؤں کی بیڑیاں بن گئیں اور حق کی روشنی بجھ گئی۔ اقتدار' حکومت' غلبہ' قیادت و سیادت اور تکبر وہ چیزیں ہیں جو حق کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹیں بن جایا کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں یہود کے علماء کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ﴾ کہ یہ محمد (ﷺ) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ لیکن پہچاننا اور ہے' ماننا اور ہے۔ پھر محض زبانی ماننا اور ہے' دل سے یقین کرنا اور ہے۔ یہ تو کئی مراحل ہیں ؎ زعشق تابہ صبوری ہزار فرسنگ است! راہِ حق میں تو بڑی بڑی رکاوٹیں' بڑے بڑے موانع اور بڑے بڑے امتحانات آتے ہیں۔ پس قیصر کی سلطنت و حکومت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی' وہ ایمان نہیں لایا اور محروم رہ گیا۔ بہرحال حضور ﷺ کے نامہ ہائے مبارک کے جواب میں عیسائی بادشاہوں کی جانب سے یہ ایک نمائندہ طرز عمل تھا۔

دیگر سلاطین کے نام حضورؐ کے نامہ ہائے مبارک

عزیز مصر (مقوقس) : اُس وقت مصر میں مقوقس نامی شخص کی حکومت تھی جو قیصر روم کے زیر اثر تھا۔ موجودہ اسکندریہ اس کا دارالحکومت تھا۔ قیصر کی طرح

مقوقس بھی عیسائی تھا اور صاحبِ علم شخص تھا۔ وہ ایمان تو نہیں لایا لیکن اس نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کا اعزاز و اکرام کیا اور حضور ﷺ کے نامہ مبارک کے جواب میں عربی میں یہ خط لکھا :

لِمُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ مِنَ الْمَقُوْقَسِ عَظِیْمِ الْقِبْطِ ' سَلاَمٌ عَلَیْکَ' اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَرَاْتُ کِتَابَکَ وَفَھِمْتُ مَا ذَکَرْتَ فِیْہِ وَمَا تَدْعُوْا اِلَیْہِ' وَقَدْ عَلِمْتُ اَنَّ نَبِیًّا بِقَیَ وَکُنْتُ اَظُنُّ اَنْ یَخْرُجَ مِنَ الشَّامِ' وَقَدْ اَکْرَمْتُ رَسُوْلَکَ وَبَعَثْتُ اِلَیْکَ بَجَارِیَتَیْنِ لَھُمَا مَکَانٌ مِنَ الْقِبْطِ عظِیمٌ وکِسْوَۃً واَھْدَیْتُ اِلَیْکَ بَغْلَۃً لِتَرْکَبُھَا' وَالسَّلاَمُ عَلَیْکَ

(ترجمہ) "محمد بن عبد اللہ (ﷺ) کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے۔ سلام علیک کے بعد: میں نے آپ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا۔ مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے' لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے۔ میں نے آپؐ کے قاصد کی عزت کی۔ اور آپ کی طرف دو لڑکیاں بھیجتا ہوں' جن کی قبطیوں (مصر کی قوم) میں بہت عزت کی جاتی ہے۔ اور میں آپؐ کے لئے پوشاک اور سواری کے لئے ایک خچر (بطور ہدیہ) بھیج رہا ہوں۔ والسلام"

مقوقس نے جو دو لڑکیاں بھیجی تھیں' وہ کنیزیں یا لونڈیاں نہیں تھیں بلکہ شاہی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ دونوں اثناءِ سفر ہی میں حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی تبلیغ و تعلیم سے ایمان لے آئی تھیں۔ ان میں ایک حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کے حرم میں شامل ہوئیں۔ دوسری جن کا نام سیرین تھا حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ یہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ خچر کا نام دلدل تھا۔ جنگِ حنین میں حضور اکرم ﷺ اسی پر سوار تھے۔

نجاشی شاہِ حبشہ : علامہ شبلیؒ نے اپنی تحقیق کے مطابق نجاشی کے متعلق جو

لکھا ہے' وہ درج ذیل ہے :

"نجاشی بادشاہ حبش کو آپ نے دعوت اسلام کا جو خط بھیجا' اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے سچے پیغبر ہیں"۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ جو ہجرت کرکے حبش چلے گئے تھے یہیں موجود تھے۔ نجاشی نے ان کے ہاتھ پر بیعت اسلام کرلی۔ ابن اسحٰق نے روایت کی ہے کہ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہ رسالت میں عرض نیاز کے لئے بھیجا' لیکن جہاز ڈوب گیا اور یہ سفارت ہلاک ہوگئی۔"

علامہ شبلیؒ نے یہ روایت طبری کے حوالے سے لکھی ہے۔ آگے علامہؒ لکھتے ہیں :

"عام اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ھ میں وفات پائی' آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور یہ خبر سن کر آپ نے غائبانہ اس کے جنازے کی نماز پڑھائی' لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح مسلم میں تصریح ہے کہ جس نجاشی کی نماز جنازہ آپ نے پڑھی وہ یہ نہ تھا۔" (واللہ اعلم)

ان تین عیسائی بادشاہوں کے طرزِ عمل کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ انہوں نے نہ تو نبی اکرم ﷺ کے قاصدوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی اور نہ ہی حضورؐ کے نامہ گرامی کی کوئی توہین کی' بلکہ ہرقل قیصر روم کے رویہ سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اس کی پوری مملکت اجتماعی طور پر اسلام کی دعوت قبول کرے لیکن اس کوشش میں وہ ناکام ہوگیا اور اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر دولتِ ایمان سے محروم رہ گیا۔

کسریٰ ایران : ایران میں اُس وقت خسرو پرویز فرمانروائے سلطنت تھا اور پچھلے شہنشاہوں کے طرح "کسریٰ" کے لقب سے ملقّب تھا۔ اس کا طرزِ عمل عیسائی بادشاہوں کے بالکل برعکس تھا۔ وہ مجوسی یعنی آتش پرست تھا اور وحی' نبوت اور رسالت کے بارے میں قطعی لاعلم تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک پڑھ کر وہ نہایت برہم ہوگیا اور اس نے نہایت تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا۔ اس کے نام حضور

ﷺ کانامۂ مبارک جو علامہ شبلی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے' درج ذیل ہے :

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ' مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى كِسْرٰى عَظِيْمِ فَارِس' سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَاٰمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَشَهِدَ اَنْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا' اَسْلِمْ تَسْلَمْ فَاِنْ اَبَيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْمَجُوْسِ))

"خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے' محمدؐ پیغمبر خدا کی طرف سے کسریٰ رئیسِ فارس کے نام' سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور یہ کہ اللہ نے مجھے تمام دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے۔ تو اسلام قبول کر لے تو سلامت رہے گا ورنہ مجوسیوں (کے اسلام قبول نہ کرنے) کا وبال بھی تیری گردن پر ہو گا۔"

خسرو پرویز کا غرور اور گستاخی : بادشاہت کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ عام طور پر ہر بادشاہ مغرور ہو ہی جاتا ہے' لیکن خسرو پرویز بہت زیادہ مغرور تھا۔ اس کے دور میں دربارِ شاہی کو جو عظمت و شوکت اور جلال حاصل ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس کے نام رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک لے کر حضرت عبداللہ بن حذیفہ رضی اللہ عنہ گئے تھے۔ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھے جاتے تھے ان میں بادشاہ کا نام پہلے ہوتا تھا اور مکتوب نگار کا بعد میں۔ حضور ﷺ کے نامہ مبارک کی ترتیب یہ تھی کہ پہلے بسم اللہ پھر خود حضورؐ کا اسم گرامی تھا اور پھر کسریٰ کا نام تھا۔ یہ دیکھ کر کسریٰ آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر نہایت گستاخانہ رویہ اختیار کیا۔ نقل کفر کفر نہ باشد' اس نے حضرت عبداللہؓ سے کہا کہ اگر تم قاصد نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کرا دیتا' تمہارے صاحب کی یہ جرأت کہ میرے غلام ہوتے ہوئے میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا۔ ایسا گستاخ شخص! میں ابھی اس کی

گرفتاری کا فرمان جاری کرتا ہوں اور اسے بلوا کر اپنے دربار میں اپنے ہاتھ سے اس کی گردن اُڑا دوں گا[1]۔ ان گستاخانہ کلمات کے ساتھ اس نے نبی اکرم ﷺ کا نامۂ مبارک چاک کر ڈالا[2]۔

نبی اکرم ﷺ کی پیشین گوئی : بعد میں جناب رسول اللہ ﷺ کو خسرو پرویز کی اس گستاخی کی خبر پہنچی تو آپؐ نے بطور پیشین گوئی فرمایا کہ "اس نے میرا خط نہیں پھاڑا' اپنی سلطنت کے پُرزے اُڑا دیئے"۔ اُس وقت عالم واقعہ میں تو کیفیت یہ تھی کہ سلطنت کسریٰ موجود تھی' اس کی لاکھوں کی فوج تھی' اس کی سلطنت لاکھوں میل پر پھیلی ہوئی تھی' اس کی سطوت' شان و شوکت اور رعب و دبدبہ مرعوب کن تھا۔ اس کے پرزے تو کئی سال بعد خلافتِ فاروقی کے دور میں ہونے شروع ہوئے اور اس کی تکمیل حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت کے ابتدائی تین چار سالوں میں ہوئی۔ لیکن حضور ﷺ نے اسی وقت پیشین گوئی فرما دی کہ کسریٰ کی سلطنت کے پرخچے اُڑ جائیں گے اور اس کا نام تک باقی نہیں رہے گا۔

خسرو پرویز کا انجام : خسرو پرویز نے حضور ﷺ کے قاصد اور آپؐ کے نامۂ مبارک کے ساتھ گستاخی پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اس نے یمن میں اپنے گورنر کو جو ایرانی تھا' فرمان بھیجا کہ "یہ مدینہ کا کون گستاخ شخص ہے جس نے میری شان میں ایسی گستاخی کی ہے اور جو نبوت کا مدعی ہے' اسے فوراً گرفتار کر کے میرے دربار میں حاضر کرو"۔ بازان گورنر یمن نے اپنے دو گماشتوں کو مدینہ بھیجا۔ ان دونوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر کہا کہ ہمارے شہنشاہ نے آپ کو طلب کیا ہے۔ اگر آپ حکم کی تعمیل نہیں کریں گے تو وہ آپ کو اور آپ کے پورے ملک کو تباہ و برباد

---

(۱) یمن میں اُس وقت ایران کی حکومت تھی اور ایران کے بادشاہ پورے عرب کو آزاد قبائل کا علاقہ سمجھتے تھے اور اسے اپنی قلمرو کا حصہ گردانتے تھے۔

(۲) واضح رہے کہ اُس وقت کسریٰ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے نامۂ مبارک کا ترجمہ تھا جسے اس نے چاک کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کا اصل نامۂ مبارک محفوظ رہا۔ (مرتب)

کر کے رکھ دے گا۔ اس پر حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا کہ تمہارا بادشاہ رات کو اپنے بیٹے (شیرویہ) کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ اب تم واپس جاؤ اور اپنے گورنر سے کہہ دینا کہ جلد ہی اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی۔ چنانچہ خسرو پرویز کا یہ انجام ہوا کہ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا' جس کی خبر حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے پہنچائی۔

<u>قیصرو کسریٰ کے انجام میں ایک نمایاں فرق</u> : نبی اکرم ﷺ کے دورِ سعید ہی میں اُس دَور کی دونوں عظیم سلطنتوں یعنی روم و فارس سے مسلمانوں کی چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی تھی' جس نے حضرت ابو بکر صدیق' حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت میں باقاعدہ جنگوں کی صورت اختیار کرلی' جن کے دو علیحدہ علیحدہ نتائج نکلے۔ وہ یہ کہ جہاں تک قیصر روم کا تعلق ہے تو اگرچہ وہ شام کے تمام علاقوں سے بالکل بے دخل کر دیا گیا تھا۔ اور شمالی افریقہ کے تمام علاقے از مصر تا مراکش اس کی فرمانروائی میں نہیں رہے تھے لیکن اس کی حکومت بالکل ختم نہیں ہوئی' بلکہ ایشیائے کوچک کے تھوڑے سے علاقے اور بلقان کی ریاستوں میں اس کا اقتدار قائم رہا۔ قسطنطنیہ جو اس کا پایۂ تخت تھا وہ بعد میں پندرھویں صدی عیسوی میں ترکانِ عثمانی کے ہاتھوں فتح ہوا۔ خلافتِ راشدہ میں اس کی حکومت کا بالکل ختم نہ ہونا اس کے اس رویہ کی برکت تھی جو اس نے نبی اکرم ﷺ کے نامۂ مبارک کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ اس کے برعکس خلافتِ فاروقی میں کسری کی حکومت قریباً ختم ہو چکی تھی جس کا خلافت عثمانیہ میں نام بھی باقی نہیں رہا۔ یزدگرد مارا گیا اور وہ پورا علاقہ جو کسریٰ عظیم فارس کے زیر نگیں تھا اسلامی حکومت کا جزو بن گیا۔ یہ انجام تھا اس گستاخانہ رویے کا جو خسرو پرویز نے حضور ﷺ کے نامہ مبارک کو چاک کرنے کی صورت میں کیا تھا۔ یہ ایک نمایاں فرق ہے جو ہمیں تاریخ اسلام کے قرنِ اول میں نظر آتا ہے۔

بیرونِ عرب مسلّح تصادم کا آغاز

غزوۂ موتہ

صلح حدیبیہ کے بعد ۷ ھ کے بالکل اوائل میں حضور ﷺ نے ان رؤساءِ عرب کے نام بھی نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے تھے جو عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں آباد تھے۔ ان میں غسان کا قبیلہ تعداد میں بھی بڑا تھا اور کافی طاقت ور بھی تھا۔ اس قبیلہ کے لوگ اگرچہ عرب تھے، لیکن ایک مدت سے عیسائی تھے۔ یہ قبیلہ قیصرِ روم کے ماتحت اور اس کا باج گزار تھا۔ اس وقت قبیلہ کا رئیس و حکمران شُرَحبِیل بن عمرو نامی شخص تھا۔ اس کے پاس حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ بطورِ قاصد حضور ﷺ کا نامہ مبارک لے کر گئے تھے۔ اس بدبخت نے حضور ﷺ کے قاصد کو شہید کر دیا۔ حضورؐ نے انؓ کے خون کے قصاص کے لئے تین ہزار کا لشکر تیار کر کے جمادی الاولیٰ ۸ ھ میں شام کی طرف بھیجا۔ اس لشکر کا سپہ سالار حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا اور پہلے ہی سے معین کر دیا کہ اگر ان کو دولتِ شہادت نصیب ہو تو حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی) سپہ سالار ہوں گے۔ اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں حضرت زید بن رواحہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار ہوں گے جو انصاری تھے اور مشہور شاعر تھے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو لشکر کی سرداری اور سپہ سالاری کس بنا پر سپرد کر گئی ہے۔ لیکن اسلام جس مساواتِ عام کو قائم کرنے کیلئے آیا تھا اس کیلئے یہ عملی نظیر ضروری تھی تاکہ لوگوں میں ایثار کا جذبہ پیدا ہو اور امیر خواہ کوئی بھی ہو اس کی اطاعت فی المعروف کی تربیت حاصل ہو ـــــ مرضِ وفات کے شروع ہونے سے قبل حضور ﷺ نے انہی زیدؓ بن حارثہ کے فرزند حضرت اُسامہؓ کو اس لشکر کا

افسروامیر مقرر کیا تھا جو شام کی سرحدوں کی طرف بھیجا جانے والا تھا۔ حضرت اُسامہؓ کی ماتحتی میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے۔ حضور ﷺ نے مساواتِ انسانی کے محض وعظ ارشاد نہیں فرمائے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس طور پر تزکیہ فرمایا تھا کہ وہ لوگ جو نسلی اور قبائلی تفاخر کو حرزِ جان بنائے رکھتے تھے ایک کنگھی کے دندانوں کی طرح باہم مربوط اور بنیانِ مرصوص بن گئے تھے۔ سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اسی نوع کے واقعات کو دیکھ کر ایچ جی ویلز جیسے دشمن اسلام کو بھی یہ لکھنا پڑا کہ "مساواتِ انسانی' اخوت اور حریت پر نہایت بلند پایہ مواعظ تو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اِن اُصولوں پر دُنیا میں سب سے پہلا عملی معاشرہ محمد (ﷺ) نے قائم فرمایا۔

اگرچہ یہ مہم قصاص لینے کے لئے بھیجی گئی تھی' لیکن چونکہ تمام مہمات کا بنیادی و حقیقی مقصد اسلام کی تبلیغ و دعوت تھا اس لئے لشکر کی روانگی سے قبل اسے حضور ﷺ نے ہدایات دیں اور ارشاد فرمایا کہ راہ میں جو قبائل آباد ہیں ان کو اسلام کی دعوت دی جائے اور شُرَحبیل بن عمرو غسانی کو بھی پہلے اسلام کی دعوت دی جائے۔ اگر وہ قبول کرلے تو جنگ کی ضرورت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ فوج کے ساتھ مدینہ سے باہر کچھ دُور تک بنفسِ نفیس تشریف لے گئے۔

اِدھر مدینہ میں مسلمانوں کا لشکر ترتیب پا رہا تھا اور اُدھر جاسوسوں نے شُرَحْبِیل کو خبر کردی۔ چنانچہ شُرَحبیل نے اس لشکر کے مقابلہ کے لئے قریباً ایک لاکھ کی فوج تیار کی' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ معاملہ قصاص اور انتقام کا ہے' لہٰذا جنگ ضرور ہوگی۔ پھر خود قیصر روم (ہرقل) ایک بہت بڑی فوج لے کر غسانیوں کے دارالحکومت بصریٰ سے چند میل کے فاصلہ پر آکر بیٹھ گیا تاکہ اگر غسانی شکست کھائیں تو وہ ان کی مدد کے لئے اپنی فوج لے کر پہنچ جائے۔ اہل ایمان کے لشکر کو جب غسانیوں کی تیاری اور اس کی پشت پر ہرقل کی فوج کی موجودگی کا علم ہوا تو مشورہ ہوا

کہ ان حالات میں کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ کہاں صرف تین ہزار اور کہاں ایک لاکھ! گویا ایک اور تینتیس کی نسبت بن رہی تھی' چنانچہ مشورہ ہوا کہ دریں حالات مقابلہ کا خطرہ (Risk) مول لینا چاہئے یا حضور ﷺ کو اطلاع دی جائے اور توقف کر کے آپؐ کے حکم کا انتظار کیا جائے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن!

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہی تھی کہ ہمیں سردست مقابلہ نہیں کرنا چاہئے اور حضورؐ کے حکم کا انتظار کرنا چاہئے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ اٹھے اور انہوں نے تقریر کی کہ مسلمانو! ہم دنیا کے طالب ہو کر نہیں نکلے' فتح اور شکست سے ہمارا کوئی تعلق نہیں' ہم تو شہادت کے متمنی ہیں' اللہ نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا ہے تو ہم تاخیر کیوں کریں؟"۔ اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ فیصلہ ہو گیا کہ مقابلہ کیا جائے گا ـــــ چنانچہ تصادم ہو گیا۔ اب کہاں تین ہزار کہاں ایک لاکھ! لیکن جوشِ ایمانی اور شوقِ شہادت سے سرشار یہ مختصر سا لشکر ایک لاکھ کی فوج پر حملہ آور ہوا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو ان کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے عَلَم اپنے ہاتھ میں لیا۔ ان کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ جب انہوں نے عَلَم سنبھالا اور لشکر ان کی قیادت میں آیا تو گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کی ٹانگوں پر تلوار ماری اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تاکہ گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہونے کا خیال بھی دل میں نہ آئے۔ پھر نہایت بے جگری سے دشمنوں کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ ایک ہاتھ قلم ہوا تو دوسرے ہاتھ میں عَلَم تھام لیا۔ وہ بھی قلم ہوا تو باقی ماندہ بازوؤں سے جھنڈا آغوش میں لے لیا تاکہ عَلَم ان کے جیتے جی زمین بوس نہ ہو۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حضرت جعفرؓ زخموں سے چور چور ہو کر زمین پر گرے اور اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا کہ جعفرؓ کو اللہ تعالیٰ نے کٹے ہوئے دو بازوؤں کی جگہ دو پر عطا فرما دیئے ہیں جن سے وہ جنت میں اُڑتے پھر رہے ہیں۔ اسی وقت سے آپ کا لقب "طیار" قرار پایا اور وہ جعفر طیار کے نام سے موسوم ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما' جو اس غزوہ میں شریک تھے' ان کا بیان ہے کہ میں نے جعفرؓ کی لاش بعد میں خود دیکھی تھی' اس پر تلواروں اور برچھیوں کے نوے زخم تھے' لیکن سب سامنے کی طرف تھے' پشت پر کوئی زخم نہیں تھا۔ یہ تھے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ۔ ان کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی

جناب رسول اللہ ﷺ نے ان تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یکے بعد دیگرے سپہ سالار نامزد کیا تھا' لیکن مزید کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ چنانچہ جب وہ تینوں شہید ہو گئے تو اب مسلمانوں کے لشکر میں سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر کمان سنبھالی اور نہایت بہادری اور بے جگری سے لڑے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اس غزوہ میں ان کے ہاتھ سے آٹھ تلواریں ٹوٹ ٹوٹ کر گریں[1]۔ لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا مقابلہ تھا۔ اس نازک صورت حال میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ ایسی جنگی چال کے ذریعے رومیوں کو مرعوب کر کے اتنی کامیابی کے ساتھ

---

(۱) صحیح بخاری میں "غزوۂ موتہ" کے باب میں حدیث ہے کہ جنگ موتہ کی خبر وحی کے ذریعہ سے حضور ﷺ کو مل رہی تھی۔ آپؐ نے از رُوئے وحی فرمایا "اب اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد بن ولید سیف من سیوف اللہ نے مسلمانوں کا علم اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا"۔ حدیث میں الفاظ آئے ہیں کہ "فتح اللہ علیھم" غلبہ اور فتح کی تشریح میں ارباب سیر اور اہل روایت کی مختلف آرا ملتی ہیں۔ مولانا شبلیؒ نے ان کو اپنی تالیف سیرۃ النبیؐ میں "غزوہ موتہ" کے باب کے اختتام پر حاشیہ میں درج کر دیا ہے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید کا لقب "سیف اللہ" اسی حدیث کی رُو سے مشہور ہوا۔ (مرتب)

مسلمانوں کو پیچھے ہٹالیں کہ رومیوں کو تعاقب کی ہمت نہ ہو۔ جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ یہ روایات بھی موجود ہیں کہ غسانیوں کے ہراول دستے نے جب حملہ کیاتو واقعتاً اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور ہراول دستہ شکست کھاکر فرار ہو گیا۔ بعد میں دشمن کی پوری فوج نے یکبارگی حملہ کر کے مسلمانوں کی فوج کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے پہاڑ کی جانب سے دشمنوں کا گھیرا توڑا اور اپنے لشکر کو لے کر پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے اور اس طرح اپنی فوج کو دشمنوں کے حملوں سے بچالائے۔

جب یہ فوج مدینہ پہنچی تو بعض روایات میں آتا ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ بھاگ کر آئے ہیں۔ چند لوگوں نے شہر سے باہر نکل کر ان پر کنکریاں اور ریت پھینکی کہ تم لوگ بھگوڑے ہو۔ تم لوگ اللہ کی راہ میں قتال کے لئے گئے تھے لیکن اپنی جان بچاکر آگئے ہو۔

نبی اکرم ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپؐ بنفس نفیس مدینہ سے باہر تشریف لائے۔ آپؐ نے بڑے تپاک سے فوج کا استقبال کیا اور یہ ارشاد فرماکر ان کو تسلی دی کہ تم مفرور نہیں ہو' بلکہ دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو ___ جیسے سورۃ الانفال میں آچکا تھا کہ پینترا بدلنے اور جنگی چال کے طور پر پائی قوت کے ساتھ پھر مقابلے کی نیت کے ساتھ پیچھے ہٹا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے[1] غزوۂ موتہ سے بچ کر آنے والے اہل ایمان دراصل اسی زمرے میں آتے تھے' یہ جان بچاکر فرار نہیں تھا۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اس فوج کو تسلی دی۔ ادھر نہ صرف غسانی بلکہ سارا عرب اور مشرق وسطیٰ یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کے اس مقابلہ میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آسکے۔ مسلمانوں کے جتنے لوگ شہید ہوئے

---

(۱) سورۂ انفال کی آیت نمبر۱۶میں کفار کے مقابلہ میں جان بچاکر پیٹھ پھیرنے والوں کے لئے اللہ کے غضب اور جہنم کی وعید آئی ہے۔ اسی آیت کے درمیان میں یہ استثنائی الفاظ آئے ہیں : ﴿اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ﴾۔ (مرتب)

اس سے کہیں زیادہ تعداد میں کفار مقتول ہوئے۔ پھر ایک لاکھ کی فوج کے نرغہ سے تین ہزار کی مختصر سی فوج کو بچالے جانا بھی فوجی اعتبار سے بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ یہی چیز تھی جس نے شام اور عراق کی سرحدوں پر آباد قبائل اور نجدی قبائل کو اسلام کی دعوت توحید سے متاثر کیا اور اس غزوہ کے بعد ہزاروں کی تعداد میں ان قبائل کے لوگ ایمان لے آئے۔

غسانیوں کا خوف اور جنگی تیاریاں : جنگِ موتہ کے اس معرکے نے غسانیوں اور رومیوں کو ہلا کر رکھ دیا اور ان کو خوف لاحق ہو گیا کہ مسلمان چین سے بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ وہ یقیناً دوبارہ حملہ کریں گے۔ چنانچہ ایک طرف غسانیوں نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں' دوسری طرف انہوں نے قیصر روم کو لکھا کہ اس اُبھرتی ہوئی طاقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے' امسال پورا عرب قحط میں مبتلا ہے لہٰذا یہ بہترین موقع ہے کہ اس اُبھرتی ہوئی قوت کو کچل دیا جائے۔ چنانچہ ہرقل نے بھی چالیس ہزار کی فوج شام بھیج دی اور خود مزید فوج کے ساتھ حمص پہنچ گیا۔ اس طرح غسانیوں اور رومیوں نے ایک لشکر جرار تیار کر لیا۔

غزوۂ تبوک

شام اور عرب کے مابین تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔ چنانچہ تاجروں کے ذریعہ سے یہ خبر پورے عرب میں پھیل گئی کہ غسانی رومی فوج کے ساتھ مل کر عنقریب مدینہ پر حملہ کرنے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے والے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی یہ خبریں برابر مل رہی تھیں چنانچہ آپؐ نے بھی فوج کی تیاری کا حکم دے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حضور ﷺ کی طرف سے نفیر عام ہوئی۔ یعنی ہر مسلمان جس کو کوئی عذر شرعی لاحق نہ ہو اس کا اس غزوہ کے لئے نکلنا اور فوج میں شامل ہونا لازم قرار دے دیا گیا۔ اس سے قبل یہ ہوتا تھا کہ جب بھی کہیں کوئی مہم بھیجنی ہوتی تھی تو نبی اکرم ﷺ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرماتے اور مہم کے لئے مطلوبہ تعداد کے

مطابق یا خود انتخاب فرماتے یا اُن اصحاب کو شامل فرمالیتے جو خود کو اس مہم کے لئے پیش کرتے۔ لیکن اس مرتبہ صورتحال مختلف تھی۔ چنانچہ نفیرعام کے نتیجہ میں تیس ہزار کی فوج تیار ہو گئی اور آپؐ اس لشکر کو لے کر تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔

سورۃ التوبہ کا اکثر حصہ غزوۂ تبوک سے متصلاً قبل اور متصلاً بعد کے واقعات پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ یہی موقع ہے کہ جس میں منافقین کا کردار نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور ان کے نفاق کا پردہ چاک ہوتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سخت ترین امتحان : غزوۂ احزاب کی طرح غزوۂ تبوک بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے نہایت سخت امتحان کا موقع تھا۔ اس لئے کہ اب ٹکراؤ وقت کی دو عظیم ترین طاقتوں میں سے ایک طاقت یعنی سلطنت روما سے درپیش تھا۔ اب بات عربوں کی باہمی جنگ کی نہیں تھی جہاں ایک اور تین چار یا ایک اور دس یا بیس کی نسبت ہو۔ اب تو سلطنتِ روما سے ٹکراؤ کا مسئلہ درپیش تھا کہ جس کے پاس لاکھوں کی تعداد میں ہر وقت باقاعدہ فوجیں تیار رہتی تھیں' جو اُس دور کے اعتبار سے اعلیٰ ترین ہتھیاروں سے لیس تھیں۔ غسانیوں نے لاکھوں کا لشکر تیار کر رکھا تھا' جس کی پشت پر خود ہرقل قیصر روم اپنی کثیر فوج کے ساتھ شام میں موجود تھا اور وہ کسی طرح بھی اپنے ان مقبوضات سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک طرف یہ صورت حال تھی' دوسری طرف عالم یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتنا سخت امتحان لیا کہ ہر مسلمان کا جنگ کے لئے نکلنا لازم فرمایا' اِلاّ یہ کہ وہ ضعیف یا بیمار ہو۔ پھر یہ کہ قحط کا عالم اور شدت کی گرمی کا موسم تھا کہ لوگوں کو ویسے بھی گھر سے نکلنا شاق گزرتا تھا۔ ان حالات میں طویل سفر گویا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر منافقین کا پردہ چاک ہو گیا' جو خود بھی جنگ کے لئے نکلنے سے جی چراتے تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ ﴿ لَا تَنۡفِرُوۡا فِی الۡحَرِّ ﴾ "گرمی میں نہ نکلو"۔ مزید یہ کہ کھجوروں کی فصل تیار تھی اور یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اگر اب چلے گئے تو یہ کھجوریں کون اُتارے

گا۔ یہ درختوں ہی پر گل سڑ کر ختم ہو جائیں گی۔ پہلے ہی کھانے کے لالے پڑے ہیں‘ یہ فصل بھی اگر برباد ہو گئی تو پھر کیا ہو گا؟

سب پر مستزاد یہ کہ طویل ترین سفر اور سلطنت روما سے ٹکراؤ کا مرحلہ درپیش تھا‘ لہٰذا ساز و سامان بھی کافی درکار تھا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ترغیب دے رہے تھے کہ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ مالی انفاق بھی کرو۔ نبی اکرم ﷺ کی اس ترغیب کے نتیجہ میں پرستارانِ حق نے ساز و سامان کی فراہمی میں اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آسودہ حال تھے انہوں نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ یہی وہ موقع ہے جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا نصف ساز و سامان اور اثاثہ جبکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنا سارے کا سارا اثاثہ نذر کر دیا اور گھر میں جھاڑو پھیر دی۔ غریب صحابہ رضی اللہ عنہم نے محنت مزدوری کر کے جو کچھ کمایا لا کر حاضر کر دیا۔ ایک صحابیؓ نے رات بھر ایک باغ میں پانی سینچا اور اس کے معاوضہ میں انہیں جو کھجوریں ملیں وہ لا کر خدمتِ اقدس میں پیش کر دیں۔ عورتوں نے اپنے زیور اُتار کر دے دیئے۔ الغرض تمام اہل ایمان میں جوش جہاد کی لہر دوڑ گئی۔

یہ نفیرعام اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب منافقوں کے لئے کسوٹی بن گئی۔ اس موقع پر پیچھے رہ جانے اور انفاق سے ہاتھ روکنے کے معنی یہ تھے کہ ایسے شخص کا اسلام کے ساتھ تعلق کا معاملہ مشتبہ ہو جاتا۔ چنانچہ منافقین کے لئے یہ موقع ان کے نفاق کا پردہ چاک کرنے کا سبب بن گیا۔ دوسری طرف وہ اہلِ ایمان بھی تھے جو سواریوں کی کمی اور سامان کی قلت کی وجہ سے تبوک کے سفر پر جانے سے معذور تھے۔ حالانکہ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نکلیں۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں رو رو کر کہتے کہ اگر آپؐ ہمیں بھی لے چلیں تو ہماری جانیں قربان ہونے کے لئے حاضر ہیں۔ ان مُخلِصین کی بے تابیوں کو دیکھ کر حضور ﷺ کا دل بھر آتا تھا ___ چنانچہ سورۃ التوبہ میں جہاں ضعفاء اور مریضوں کو اس غزوہ میں شرکت سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے تسلی دی گئی وہاں ان مخلص اہلِ ایمان صحابہ کی

تسلی کے لئے یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی :

﴿ وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ص تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ○ ﴾ (آیت ۹۲)

"اور (اسی طرح) ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے جو (اے نبی) آپ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ ہم کو سواری دیجئے (تاکہ ہم بھی ساتھ چلیں) تو آپ نے کہا کہ میرے پاس سواری نہیں ہے جس پر تم کو سوار کر سکوں تو وہ واپس چلے گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہم اس جہاد میں حصہ لینے کی مقدرت نہیں رکھتے۔"

تبوک کی طرف کوچ : الغرض رجب ۹ھ میں نبی اکرم ﷺ نے ۳۰ ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے شام کی طرف کوچ فرمایا اور تبوک کے مقام پر قیام فرمایا جو شام اور جزیرہ نمائے عرب کا سرحدی مقام ہے۔ اس سفر میں دس ہزار گھڑسوار آپؐ کے ہمراہ تھے۔ اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔

قیصر کا جنگ سے اعراض : غسانیوں نے لاکھوں کی فوج تیار کر رکھی تھی اور قیصر نے چالیس ہزار رومی سپاہ ان کی مدد کے لئے بھیج رکھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک لشکر جرار کے ساتھ غسانیوں کی مدد کے لئے حمص میں موجود تھا۔ لیکن جب قیصر کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا جو لشکر مدینہ سے آرہا ہے اس کی قیادت خود جناب مُحمّد رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں تو اس نے غسانیوں اور رومی فوجوں کو حکم بھیجا کہ سرحد سے تمام فوجیں واپس چلی آئیں۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ حضور ﷺ اللہ کے رسولؐ ہیں اور یہ کہ اللہ کے رسولؐ سے مقابلے کا نتیجہ شرمناک شکست کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا۔ پھر غزوۂ موتہ میں ایک جانب تین ہزار اور دوسری جانب ایک لاکھ فوج کے مقابلہ کی جو کیفیت اس کے علم میں تھی تو اس کے بعد اس کی ہمت

نہ پڑی کہ وہ تیس ہزار فدائین کے اس لشکر سے مقابلہ کرے جس کی کمان خود نبی اکرم ﷺ فرما رہے تھے۔ حالانکہ اُس وقت اس کے پاس غسانیوں اور رومیوں کی دو لاکھ سے بھی زیادہ فوج موجود تھی۔ چنانچہ وہ طرح دے گیا اور اس نے سرحد سے تمام فوجیں واپس ہٹا کر مسلح تصادم کا ہر امکان روک دیا۔

نبی اکرم ﷺ کے اقدامات : نبی اکرم ﷺ نے اس مرحلہ پر قیصر کے اعراض اور پسپائی کو کافی سمجھا اور از خود تبوک سے آگے بڑھ کر شام کی سرحد میں داخل ہونے کے بجائے اس بات کو ترجیح دی کہ اس طرح لشکر اسلام کو جو اخلاقی اور نفسیاتی فتح حاصل ہوئی تھی اس سے زیادہ سے زیادہ سیاسی اور جنگی فوائد حاصل کئے جائیں۔ حضورؐ وہاں بیس دن تک مقیم رہے تاکہ اگر قیصر مقابلہ میں آتا ہے تو آئے ـــــ اس عرصہ کے دوران آپؐ نے سرحد کے اردگرد جو قبائل آباد تھے' ان کے رئیسوں اور سرداروں سے معاہدے کئے اور اس طرح اس علاقے میں اپنی پوزیشن مضبوط بنالی۔ گویا ہجرت کے بعد غزوۂ بدر سے قبل حضورؐ نے قریش کے خلاف جو اقدام (Active Resistance) کیا اور قریش کی سیاسی ناکہ بندی (Political Isolation) کی وہی کام حضور ﷺ نے تبوک کے ۲۰ یوم کے قیام کے دوران انجام دیا۔ اس کے بعد آپؐ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

الغرض یہ ہیں سیرت کے وہ اہم واقعات یعنی سلاطین و رؤساء کو نامہ ہائے مبارکہ کی ترسیل' جنگ موتہ اور غزوۂ تبوک جن سے انقلابِ محمدیؐ کی بین الاقوامی تصدیر (Export) کے کام کا آغاز ہوا۔ یعنی جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر اب اطراف و اکنافِ عالم میں حضورؐ کی انقلابی دعوت پہنچانے اور توحید کا علم کرۂ ارضی پر بلند کرنے کا جو کام اُمت کے سپرد تھا' اس کا راستہ حضور ﷺ نے بنفسِ نفیس کھول دیا۔

حجۃ الوداع

نبی اکرم ﷺ نے ۱۰ھ میں فریضۂ حج ادا فرمایا۔ ہجرت کے بعد آپؐ کا یہی پہلا اور آخری حج ہے۔ اسی لئے اسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنا مشن اُمت کے حوالہ فرمادیا۔ اس موقع پر سوا لاکھ کا مجمع موجود تھا۔ آپؐ نے پہلے تو مجمع سے گواہی لی کہ میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچادیا کہ نہیں؟ جب تین مرتبہ پورے مجمع نے اقرار کیا کہ بے شک آپؐ نے حق تبلیغ، حق نصیحت اور حق امانت ادا فرمادیا تو پھر آپؐ نے فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) "یعنی (میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچادیا) اب وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں (ان کی ذمہ داری ہے کہ اس دین کو) پہنچائیں ان تک جو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی میں گویا یہ بات از خود مضمر ہے کہ میں نے جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل کردی ہے اور اس عمل کا آغاز کردیا ہے جس کا تعلق بین الاقوامی مرحلہ سے ہے۔ لہٰذا انقلاب کی عالمی سطح پر تکمیل کی ذمہ داری اب تمہارے کاندھوں پر ہے۔

رفیقِ اعلیٰ کی طرف مراجعت

حجۃ الوداع کے بعد ۱۲/ ربیع الاول ۱۱ھ تک حضور ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے ۸۰ دن بنتے ہیں جس کے بعد ((اَللّٰهُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی)) فرماتے ہوئے آپؐ نے اس دُنیا سے پردہ فرمایا اور رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت فرمائی۔ اس مراجعت سے چند دن قبل آپؐ نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سرکردگی میں شام کی سرحد کی طرف پیش قدمی کے لئے ایک لشکر تیار فرمادیا تھا، جسے بجا طور پر اس بات کا ثبوت قرار دیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس انقلاب کی بین الاقوامی سطح پر پیش قدمی کرنے کے لئے اُمت اور اپنے جانشینوں کے لئے ایک واضح لائحہ عمل کی جانب رہنمائی فرمادی تھی اور اس ضمن میں قابلِ تقلید عملی نمونہ بھی پیش فرمادیا تھا۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمُسلمات ○○

ضمیمہ

★

منہجِ انقلابِ نبویؐ

کے

حالاتِ حاضرہ پر انطباق

کے ضمن میں

اِقدام اور مسلّح تصادم کا متبادل

قرآن اور حدیث کی روشنی میں

★

(وسط دسمبر ۸۴ء کے دو خطاباتِ جمعہ کی تلخیص)

★

مسلّح تصادم

کے اعتبار سے دورِ نبویؐ اور موجودہ حالات میں دو اہم فرق

★

مسلّح بغاوت کی شرعی حیثیت

★

تمدّنی ارتقاء سے پیدا شدہ دو اہم تبدیلیاں

★

اقدام اور مسلّح تصادم کا متبادل

نہی عن المنکر بالید

★

قرآن حکیم کی اصولی رہنمائی

★

احادیثِ نبویہ کی تفصیلی وضاحت

★

خلاصۂ مباحث اور تین ممکنہ نتائج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ مسنونہ، تلاوتِ آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبویؐ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

گزشتہ دس خطابات میں مَیں اپنی سی امکانی کوشش کر چکا ہوں کہ سیرتِ مطہّرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کا ایک مطالعہ اور ایک جائزہ اس انداز میں آپ کے سامنے رکھ دوں کہ اسلامی انقلاب کے مراحل اور مدارج نکھر کر سامنے آجائیں۔

اب ہمیں گہرے غور و فکر اور نہایت احتیاط کے ساتھ یہ دیکھنا ہو گا کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جِدّوجُہد کے کن کن مراحل اور امور کو ہمیں جوں کا توں لینا ہو گا اور وہ کون سے مراحل ہیں کہ جن کے بارے میں حضور ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کو من حیث المجموع سامنے رکھ کر ہمیں موجودہ حالات کے پیش نظر استنباط کرنا ہو گا اور اس معاملے میں ہمیں کس حد تک اجتہاد کرنا ہو گا۔ اس مسئلہ پر گفتگو سے قبل پہلے ہمیں اس فرق کو سمجھنا ہو گا جو دو اعتبارات سے دورِ نبوی ﷺ اور آج کے حالات میں واقع ہوا ہے۔

مسلّح تصادم کے اعتبار سے

دورِ نبویؐ اور موجودہ حالات میں دو اہم فرق

پہلا فرق : دورِ نبویؐ اور موجودہ حالات میں پہلا واضح ترین اور نمایاں ترین فرق تو یہ واقع ہوا ہے کہ نبی اکرمؐ کی بعثت مبارکہ ایک خالص کافرانہ و مشرکانہ معاشرے میں ہوئی تھی، جبکہ ہمارا تعلق ایک مسلمان معاشرہ سے ہے اور ہمیں اس میں کام کرنا ہے۔ ہمارے ملک ہی کی طرح دوسرے بہت سے مسلم ممالک ہیں جن میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد اسّی فیصد سے زائد ہے اور ان تمام ممالک کے سربراہ اور

حکمران بھی مسلمان ہی ہیں۔ رعایا اور حکمرانوں کے کردار' ان کے اخلاق' ان کی سیرت اور دین سے ان کے عملی تعلق کے معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ بات تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یہ سب کے سب قانوناً مسلمان ہیں۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ کہیں بھی مکمل اسلامی نظام اپنی آئیڈیل صورت میں عملاً قائم و نافذ نہ ہو بلکہ پورے کا پورا لادینی (Secular) نظام رائج ہو تب بھی وہ مسلمان معاشرہ کہلائے گا اور اس کے حکمران مسلمان ہی تسلیم کیے جائیں گے۔ پھر حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان معاشروں میں کردار کے اعتبار سے ہر طرح کے طبقات موجود ہیں۔ شرابی' زانی' قمار باز اور کئی اعتبارات سے صرف اسلامی اخلاق و کردار ہی سے نہیں عام انسانی سیرت و کردار سے تہی دست افراد بھی موجود ہیں اور اسلامی نظام کے عملاً نافذ نہ ہونے کے باوجود انہی معاشروں میں کچھ نہ کچھ ایسے مسلمان بھی لازماً موجود ہوں گے جو نمازی' روزے دار' اسلامی شعائر کی پاس داری کرنے والے اور انفرادی سطح پر صالح اور متقی مسلمان ہوں۔ بہر حال عملاً یہ تمام لوگ قانوناً مسلمان ہیں اور انہیں کلمہ کی ڈھال حاصل ہے۔ لہٰذا ان حالات میں جن میں نبی اکرم ﷺ نے توحید کی انقلابی دعوت پیش کی اور اس صورت حال میں جس سے ہمارا سابقہ ہے' ایک نہایت نمایاں فرق موجود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا جس معاشرے سے مقابلہ تھا' وہ فکری و عملی دونوں اعتبارات سے خالص مشرکانہ اور کافرانہ معاشرہ تھا اور ان کا پورا نظام شرک کی بنیادوں پر استوار اور قائم تھا۔ کچھ سعید روحیں ضرور موجود تھیں جو فکری طور پر موحد اور عملی طور پر بُت پرستی کی نجاست کی آلودگی سے محفوظ تھیں۔ لیکن غالب اکثریت مشرکین ہی کی تھی۔ چنانچہ پہلا اور بنیادی فرق جس کو سامنے رکھ کر ہمیں سوچنا ہوگا یہ ہے کہ آیا ہم نبی اکرمؐ کا پورا منہج انقلاب جوں کا توں اور بعینہٖ اختیار کریں گے یا اس میں کوئی فرق و تفاوت ہو گا!

دوسرا فرق : دوسری اہم بات یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا جو تمدنی ارتقا ہوا ہے اس کے اعتبار سے اب کسی بھی ملک میں جو حکومت ہوتی ہے اس کے پاس تمام وسائل

اور پوری قوت موجود ہوتی ہے' جبکہ عوام اب بالکل نہتے ہو گئے ہیں۔ چنانچہ حکومت اور عوام کے مابین فرق و تفاوت اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ وہ جو مسلح تصادم (Armed Conflict) والا مرحلہ ہے' یعنی پہلے سے قائم شدہ باطل نظام سے مسلح تصادم کا معاملہ وہ نظری اور عملی دونوں اعتبارات سے قریباً ناممکن ہو چکا ہے۔ یہ دونوں تبدیلیاں ایسی بنیادی ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ہمیں معروضی طور پر غور کرنا ہے کہ اگر ہم اسلامی انقلاب برپا کرنے کا تہیّہ اور عزم کرتے ہیں تو ان تمام مراحل میں جن سے نبی اکرمؐ کی جدوجہد اور سعی و کوشش گزری آیا ہمیں بعینہٖ وہی طریقہ اختیار کرنا ہو گا جو ہمیں سیرتِ مطہرہ میں ملتا ہے یا یہ کہ اُن اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر مرحلہ پر ہم یہ دیکھیں کہ کس کس پہلو سے ہمارا لائحہ عمل مختلف ہو گا۔

زیر بحث موضوع کی وضاحت سے پہلے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اس صورت حال کو ایک مفروضہ کی حیثیت سے سامنے رکھیں اور سردست اس بات کو ذہن سے نکال دیں کہ اس وقت پیشِ نظر پاکستان کی حکومت اور اس کا معاشرہ ہے۔ ورنہ اس مسئلہ میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

گفتگو کی عکسی ترتیب

اصلاً تو ترتیب یہ ہونی چاہئے کہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسلام کے جو چھ مراحل بیان کئے گئے تھے' انطباق کے معاملہ میں بھی وہی ترتیب اختیار کی جائے۔ یعنی پہلے اس مسئلہ پر اظہار خیال ہو کہ دعوت کے مرحلہ میں کوئی فرق و تفاوت ہو گا یا نہیں' اور اگر ہو گا تو وہ کیا ہو گا؟ پھر تنظیم کے مرحلہ اور اس کے طریق کار میں کوئی فرق و تفاوت ہو گا یا نہیں' اگر ہو گا تو کیا ہو گا؟ تربیت کے عمل میں کوئی فرق و تفاوت ہو گا یا نہیں' اگر ہو گا تو کیا ہو گا؟ اسی کے ساتھ صبر محض (Passive Resistance) کا مرحلہ ہے' جس کے بعد اقدام (Active Resistance) کا مرحلہ آتا ہے۔ گنتی اور ترتیب کے اعتبار سے تو یہ دونوں مرحلے چوتھے اور

پانچویں نمبر کے طور پر بیان ہوتے ہیں جبکہ حقیقت کے اعتبار سے صبر محض کا مرحلہ پہلے مرحلے یعنی دعوت کے ساتھ ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ تو سوچنا ہو گا کہ آیا ان کے ضمن میں بھی کسی اجتہادی تبدیلی کی ضرورت ہو گی یا نہیں۔ اسی طرح آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا معاملہ ہے کہ آیا اس میں بھی کوئی فرق و تفاوت ہے یا نہیں ہے' اگر ہے تو وہ کیا ہے؟

موضوع کی نزاکت

زیر بحث موضوع بڑا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے' کیونکہ اِس دَور میں اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کی بظاہر احوال اُس وقت تک کوئی صورت ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس مسئلہ کو تمدنی ارتقاء کی روشنی میں حل نہ کیا جائے اور اس کے صحیح متبادل طریقہ کو تلاش نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس اعتبار سے بھی یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارا اصل ہدف اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے' جس کے چھ مراحل کا تذکرہ کافی تفصیل کے ساتھ ہو چکا۔ چونکہ قانونی اعتبار سے آخری مراحل میں ہی سب سے بڑا فرق واقع ہوتا ہے اس لئے انہی مراحل کا ذکر پہلے ہو گا اور یہ فرض کیا جائے گا کہ ابتدائی مراحل کسی معاشرہ میں مکمل ہو چکے ہیں۔ یعنی خالص اسلام کی دعوت پر ایک تحریک اُٹھی' اس کو اس معاشرہ میں مقبولیت حاصل ہوئی' اسے response ملا' لوگوں نے شعوری طور پر اس دعوت کو قبول کیا' پھر وہ منظم ہوئے اور سمع وطاعت والی ایک تنظیم کا نظام قائم ہو گیا۔ پھر ان کی تعداد بھی اتنی معتدبہ ہو گئی کہ وہ تنظیم اب رائج نظام کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ پھر یہ کہ تنظیم کے کارکنوں کی تربیت بھی ایسی ہو چکی ہے کہ ان کے انفرادی کردار و اخلاق اور ان کی سیرت کے اعتبار سے ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ان کے متعلق یہ حسن ظن موجود ہے کہ وہ فی الواقع اپنی انفرادی زندگی میں اپنے امکان بھر اسلام کو عملاً نافذ کر چکے ہیں' انہوں نے تزکیہ کے مراحل بھی طے کر لئے ہیں اور ان کے دل راہِ حق میں قربانیاں دینے

کے لئے بے تاب ہیں۔ یہ مفروضات (Pre-suppositions) ہیں جو پیشِ نظر ہوں گے۔ کسی انقلابی عمل کا آخری مرحلہ مسلح تصادم ہوتا ہے' مگر یہ آج کا مسئلہ نہیں ہے' یہ فوری طور پر عمل کرنے والی بات نہیں ہے' لہٰذا اس آخری مرحلہ کو صرف علمی طور پر سمجھنا ہوگا۔

مزید بر آں ہمارا سابقہ ایسے حالات سے ہے کہ ایک مسلمان معاشرہ میں' جو ایمان اور عمل دونوں اعتبارات سے سخت مضمحل ہو چکا ہے' نیز جس میں حکومت کرنے والے بھی مسلمان ہیں' خواہ وہ بادشاہ ہوں' جیسے سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک میں ہیں' چاہے وہ چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر ہوں اور خواہ وہ جمہور کے منتخب نمائندے ہوں' جیسے بہت سے ممالک میں جمہوری حکومتیں قائم ہیں' بہرحال کچھ بھی ہو مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور حکمران بھی مسلمان ہیں' ان کی تکفیر نہیں کی گئی ہے۔ اپنی نجی زندگیوں میں وہ کچھ بھی ہوں' فاسق و فاجر ہوں' یا نمازی اور روزہ دار ہوں' دونوں صورتوں میں وہ مسلمان ہیں' لیکن اس معاشرہ میں اسلامی نظام قائم نہیں ہے' تو اس نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر صحیح و حقیقی اسلامی نظام کے قیام کے لئے آخری اقدام کی صورت کیا ہوگی یا بالفاظ دیگر کیا ہو سکتی ہے جو مسلح تصادم کا بدل (alternative) بن سکے؟

ایک اسلامی تحریک کے اوصاف

آگے بڑھنے سے قبل بات کی تفہیم کے لئے ایک بار پھر ایسی تحریک کے اوصاف ذہن میں تازہ کر لیجئے جو ٹھیٹھ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کسی معاشرہ میں اُٹھی ہو۔ وہ تحریک کسی فرقہ واریت کی بنیاد پر نہ اُٹھی ہو' وہ محض رائج الوقت نظام کی کسی جزوی اصلاح کے لئے نہ اُٹھی ہو' وہ صرف کسی انتخابی عمل کے ذریعے اس نظام کو چلانے والے ہاتھوں کو بدلنے کے لئے میدان میں نہ آئی ہو' بلکہ اس جماعت کا مقصد خالص اسلامی انقلاب برپا کرنا ہو۔ یعنی معاشرہ میں علمی و عملی دونوں اعتبارات سے

توحید کے نفاذ و انعقاد کی جِدّ و جُہد ہی اس کا مقصود و مطلوب ہو۔ پھر یہ کہ ایک معتد بہ تعداد میں لوگوں نے اسے شعوری طور پر قبول کیا ہو۔ پھر یہ کہ وہ منظم ہو چکے ہوں اور منظم بھی اس درجہ میں کہ "وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا" کی کیفیت پیدا ہو گئی ہو۔ وہ کبھی مشتعل نہ ہوئے ہوں۔ انہوں نے کبھی بھی گالی کا جواب گالی سے نہ دیا ہو۔ یعنی وہ ان مراحل سے بڑی حد تک گزر چکے ہوں جو صبر محض کے عنوان کے تحت سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مکی دور کے حالات کے ضمن میں قبل ازیں بیان ہو چکے ہیں' کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سختیاں جھیلیں' استہزاء اور تمسخر برداشت کیا' ذہنی و جسمانی تشدد جھیلا' معاشرہ نے اہل ایمان کا بائیکاٹ کیا' شعب بنی ہاشم کی تین سالہ جاں گسل محصوری سے سابقہ پیش آیا' ایمان لانے والے سعید و صالح نوجوانوں کو ان کے خاندان والوں نے گھروں سے نکالا' ان پر معیشت دائرہ تنگ سے تنگ تر کیا گیا' لیکن انہوں نے ان سب کو جھیلتے اور برداشت کرتے ہوئے توحید کا علم ہاتھ میں لئے توحیدی انقلاب اور توحیدی نظام قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ کسی ادنیٰ درجہ میں ہی سہی' اُس جماعت کے وابستگان میں بھی ان باتوں کی کوئی جھلک نظر آنا ضروری ہے۔

نکتہ توحید کی تفسیر

توحید کی بنیاد پر جو نظام قائم ہوتا ہے صرف اور صرف وہی نظامِ عدل و[illegible] کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ یہ نظام توحید ہی سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات [illegible] کرتا ہے۔ یعنی نسل' رنگ' زبان' پیشہ اور جنس کی بنیاد پر نہ کوئی بلند و اعلیٰ ہو[illegible] نہ کوئی کم تر و پست۔ پھر مرد و عورت کے منصفانہ طور پر حقوق اور فرائض کو[illegible] کرتا ہے۔ معاشی سطح پر یہ نظام ملک کے ہر شہری کی ناگزیر بنیادی ضروریاتِ زن[illegible] کفالت کا ذمہ دار ریاست کو قرار دیتا ہے۔ آجر و مستأجر (مزدور و کارخانہ دا[illegible] درمیان عدل و انصاف اور اخوت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ جاگیرداری کی لعنت[illegible]

خاتمہ کرتا ہے۔ اس نظامِ توحید میں سیاسی سطح پر حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ ملک کی پارلیمنٹ یا اسمبلی ﴿ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ کے اصول پر شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے دیگر انتظامی و فلاحی اُمور کے لئے قانون سازی کی مجاز ہوتی ہے' لیکن وہ اللہ اور رسول ؐ یعنی کتاب و سنت میں بیان کردہ حدود و تعزیرات میں ایک شوشہ کے برابر بھی تغیر و تبدل کی مجاز نہیں ہوتی۔

اقدام کا مرحلہ

سوال یہ ہے کہ اگر ایک اسلامی تحریک مختلف مراحل سے گزر کر اقدام کے مرحلہ تک آ گئی تو بحالاتِ موجودہ اقدام کی صورت کیا ہو گی؟ ظاہر ہے کہ اقدام کے بغیر نظام نہیں بدلے گا۔ بیٹھے رہیں گے تو وہ نظام خود بخود تبدیل نہیں ہو گا۔ اس موقع پر یہ بات بھی گرہ میں باندھ لیجئے کہ محض وعظ و نصیحت سے بھی ہرگز ہرگز کوئی نظام تبدیل نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس فاسد نظام میں چند نیک' صالح باکردار اور متقی لوگوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ نظام کی تبدیلی کے لئے اقدام ناگزیر ہے' اس کے بغیر انقلاب نہیں آتا۔

مسلّح بغاوت کی شرعی حیثیت

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض حضرات کے ذہنوں میں جو یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کسی مسلمان حکمران کے خلاف مسلح اقدام کی شریعت میں سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اگرچہ ہمارے یہاں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے لیکن یہ بات بھی متفق علیہ نہیں ہے کہ کسی بھی حالت اور کسی بھی صورت میں کسی مسلمان حکمران کے خلاف خروج نہیں ہو سکتا یا بغاوت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اس بات کو تسلیم کرنے کے معنیٰ تو یہ ہوں گے کہ فُسّاق و فُجّار کی حکومت کبھی ختم نہیں ہو گی۔ جو فاسق و فاجر ایک

بار مسلّط ہو گیا تو پھر اس کا یہ تسلط دائمی ہو گا اور سوائے زبانی و کلامی نصیحت کرنے یا خاموش رہنے کے کوئی عملی اقدام کرنے کا حق اور اختیار باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ اکثر حالات میں تو زبان پر بھی پہرے بٹھا دیئے جائیں گے کہ تنقید تو کجا' دلسوزی' ہمدردی اور خیر خواہی سے نصیحت کرنے پر بھی زبان بندی کر دی جائے گی۔ ایسی صورت میں ظاہر بات ہے کہ وہ تسلط ہمیشہ باقی رہے گا اور کبھی ختم نہیں ہو گا۔

اس سلسلہ میں غور کا مقام ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر بن العوام رضی اللہ عنہما نے حکومت کے خلاف جو اقدام فرمایا' تو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ ان حضرات گرامی کا اقدام خلافِ شریعت تھا یا وہ کوئی ناجائز کام کر رہے تھے۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ!

حضرت حسین بن علی اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے اقدامات ان حضرات کی اجتہادی غلطی تو ہو سکتی ہے' اس میں خطا کا امکان ہو سکتا ہے' لیکن اسے ناجائز کام یا ہوسِ اقتدار ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس بات کا شائبہ بھی دل میں آ گیا تو عدالتِ خداوندی میں لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ یہی معاملہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کی رائے کے متعلق کہا جائے گا کہ اگر انہوں نے ان حضرات کو اقدام کرنے سے روکا اور یزید کی بیعت کر لی تو یہ ان کی اجتہادی رائے ہے جس میں خطاء کا امکان ہے' لیکن اس کو بھی حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دو انتہاؤں کے درمیان میں ہمارے سلف و خلف کے علمائے ربانی کی رائے یہی ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ناپسندیدہ مسلمان حکومت کے خلاف خروج کی دین میں گنجائش موجود ہے۔ تب ہی تو ان دونوں بزرگوں نے اقدامات کئے۔ البتہ اقدام کے مرحلے پر یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کے لئے موقع و محل بھی مناسب ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق خالص اجتہاد سے ہے' جس میں خطاء و صواب دونوں کا برابر امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ للذا اس بات کو ذہن سے نکال دیجئے کہ مسلمان حکمران کے خلاف خروج اور بغاوت سرے سے ہو ہی نہیں سکتی۔

خروج کے بارے میں احناف کا موقف

ہمارے اس ملک میں بسنے والے سُنّی مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت حنفی المسلک ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہی ہے کہ فاسق و فاجر مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کے لئے شرائط بڑی کڑی ہیں۔ امام صاحبؒ کے حالاتِ زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت نفس زکیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تائید بھی کی تھی اور ان کو مالی اعانت بھی فراہم کی تھی جنہوں نے بنو عباس کی حکومت کے خلاف خروج کیا تھا۔ البتہ امام صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ بنفسِ نفیس میدان میں نہیں آئے تھے۔ تاریخ کی تمام مستند کتابوں میں ان باتوں کا ثبوت موجود ہے۔ لہٰذا دینی اور شرعی اعتبار سے ایسا معاملہ نہیں ہے کہ کسی حال اور کسی صورت میں بھی کسی فاسق و فاجر حکمران کے خلاف خروج یا بغاوت نہ کی جا سکے۔ البتہ فقہائے احناف نے اس کے لئے بڑی کڑی شرائط لگائی ہیں۔

ایک شرط تو یہ ہے کہ حکمرانوں کی طرف سے کھلم کھلا اور برملا کسی ایسی بات کا ظہور ہو رہا ہو جو خلافِ اسلام ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنے گھر میں بیٹھ کر شراب پی رہا ہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن اگر وہ شراب نوشی کی ترویج کر رہا ہو' لوگوں کو اس کے استعمال کی ترغیب و تشویق دے رہا ہو تو معاملہ مختلف ہو جائے گا۔ ایسے حکمران کو معزول کرنے کے لئے قوّت فراہم کرنا اور خروج کرنا بالکل جائز اقدام ہو گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لئے جو لوگ اُٹھیں ان کی طاقت اور ان کے اثرات اتنے زیادہ ہو چکے ہوں کہ وہ یقین رکھتے ہوں کہ ہم تبدیلی برپا کر دیں گے۔ یہ نہیں کہ تھوڑی سی طاقت کے ساتھ تصادم کا آغاز کر دیں' جس کا نتیجہ بدامنی کی صورت میں ظاہر ہو اور وہ لوگ ختم ہو کر رہ جائیں۔ بلکہ صورت یہ ہونی چاہئے کہ بحالات ظاہریہ امید واثق ہو کہ ہم نظام کو بدل سکتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ اپنی جانوں کا ہدیہ پیش کر دیں اور نظام جوں کا توں قائم رہے۔ تو یہ ہے اس مسئلہ کی خالص دینی اور شرعی حیثیت۔

ایک قابلِ لحاظ نکتہ

موجودہ دور میں بالفعل یہ صورت پیدا ہو چکی ہے کہ اب خروج و بغاوت کا امکان ہی موجود نہیں۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں باقاعدہ تنخواہ دار فوجیں (Standing Armies) نہیں ہوتی تھیں۔ اگر ہوتی بھی تھیں تو بہت کم۔ جبکہ آج کل قریباً ہر حکومت کے پاس لاکھوں کی تعداد میں تربیت یافتہ اور منظم فوجیں موجود ہوتی ہیں۔ ثانیاً اُس دَور میں جس نوع کا اسلحہ فوجوں کے پاس ہوتا تھا قریباً اسی نوع کا عوام کے پاس بھی ہوتا تھا۔ اس میں مقدار کا فرق تو ہو سکتا ہے' لیکن وہی تلواریں' وہی نیزے' وہی تیر' وہی ڈھالیں جو فوج کے پاس ہیں وہی عوام کے پاس بھی ہیں۔ تو اُس زمانہ میں نسبت و تناسب کا کوئی نہ کوئی معاملہ موجود تھا۔ لیکن اب جو تمدّن کا ارتقاء ہوا ہے تو یہ صورت باقی نہیں رہی ہے۔ حکومت کے وسائل' اس کی طاقت' اس کی فوجیں اور اسلحہ کے معاملہ کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے۔ چنانچہ اب سرے سے کوئی نسبت و تناسب موجود ہی نہیں ہے۔ حکومتی افواج نہ معلوم کس کس نوعیت کے اعلیٰ اور جدید ترین اسلحہ سے لیس ہیں اور اس طرح حکومت ایک قوی ترین ادارہ بن چکی ہیں' جبکہ عوام قریباً بالکل نہتے ہیں۔ تو یہ فرق و تفاوت اتنا عظیم ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا خروج اور بغاوت بحالاتِ موجودہ تقریباً خارج از بحث ہو چکی ہے ___ شرعی اعتبار سے نہیں' حالات کے اعتبار سے اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایک اہم سوال

ان تمام تنقیحات کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ بحالاتِ موجودہ اس چھٹے مرحلہ کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟ اس کا متبادل (alternate) کیا ہو گا۔؟ اس سوال کے براہِ راست جواب سے قبل ضروری ہے کہ دو اہم امور کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

تمدّنی ارتقاء سے پیدا شدہ دوؔ اہم تبدیلیاں

تمدنی ارتقاء نے یہ شکل پیدا کی ہے کہ حکومت کے پاس قوت اور طاقت بے انتہا ہوتی ہے۔ فوج اس کی پشت پناہ ہوتی ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی پیشِ نظر رکھئے کہ بات پاکستان کی نہیں ہو رہی بلکہ علمی اور اصولی نقطہ نظر سے ہو رہی ہے۔ آخر یہ مسئلہ شام میں بھی تو درپیش ہے' جہاں الاخوان المسلمون نے اسلام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے' لیکن مقابلہ کس سے ہے؟ حافظ الاسد کی حکومت سے' جس کے پاس جدید ترین اسلحہ سے لیس فوج موجود ہے' جس کے پاس ہر طرح کے ذرائع و وسائل موجود ہیں اور جس کی پشت پر روس جیسی سپرپاور موجود ہے۔ للہٰذا الاخوان المسلمون کچلے جا رہے ہیں اور ان کی مسلح جِدّوجُہد دم توڑ چکی ہے۔ پھر سوچئے کہ اسی طرح کا مسئلہ افغانستان میں ہو رہا ہے یا نہیں؟[1] کارمل بظاہر مسلمان ہے۔ آج تک تو نہیں سنا گیا کہ اس کی تکفیر کی گئی ہو۔ اس کے ساتھ جو افغانی فوج ہے' وہ سب کے سب بہرحال مسلمان ہیں' مسلمان ماؤں کا دودھ پیئے ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ فوج کا جدید تصور یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ اقتدار میں ہو یا کسی طرح اقتدار میں آجائے تو فوج اس کا حکم مانے' اس کو تحفظ فراہم کرے۔ کتنا دکھ ہوتا ہے جب خبریں آتی ہیں کہ اتنے کارمل فوجی مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجاہدین' اسلام کے لئے' حریت کے لئے اور خدا ناآشنا بلکہ خدا دشمن روسی جارحیت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی کامیابی پر خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں دکھ کا یہ پہلو موجود ہے کہ ہلاک ہونے والے بھی تو مسلمان ہیں۔ وہ ایک حکومت کے حکم کے تحت جنگ کر رہے ہیں۔ دونوں طرف سے مسلمانوں ہی کا خون بہہ رہا ہے۔ روسی فوج کے لوگ تو کارمل فوج کی نسبت کم ہی مرے ہوں گے۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کے ہاتھوں مسلمان ہی ہلاک

---

(۱) واضح رہے کہ یہ خطاب دسمبر ۸۴ء کا ہے۔

ہو رہے ہیں۔ اس طرح ہر ملک کے علیحدہ علیحدہ مسائل ہیں۔ چنانچہ ہمیں پاکستان کے حالات کو ایک طرف رکھ کر اصولی طور پر بات سمجھنی ہو گی۔

جہاں تمدنی ارتقاء نے حکومت کے ہاتھ میں بے پناہ قوت فوج کی شکل میں دے دی ہے وہاں اس تمدنی ارتقاء کی بدولت دو اہم تبدیلیاں اور بھی آئی ہیں۔ دینی مزاج کے ہمارے اکثر لوگ ان تبدیلیوں سے واقف نہیں ہیں۔ چنانچہ راقم جب اسلامی انقلاب کے چھٹے مرحلہ کے طور پر مسلح تصادم کی بات کرتا ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں اور میری تنظیم پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کوشاں ہے تو وہ چونک جاتے ہیں کہ یہ لوگ تو مسلح بغاوت کی بات کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑوانا چاہتے ہیں' حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ جب سیرتِ مطہّرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام سے فلسفۂ انقلاب اخذ کیا جائے گا اور حضور ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کے معروضی مطالعہ سے انقلابِ محمّدی ؐ کے مراحل و مدارج کے تعین کی کوشش کی جائے گی تو لامحالہ چھٹے اور آخری مرحلہ کے طور پر مسلح تصادم کا ذکر آئے گا۔ البتہ راقم نے اس موضوع پر جب بھی اظہارِ خیال کیا ہے تو ان متبادل طریقوں کا بھی ذکر کیا ہے جو تمدن کے موجودہ ارتقاء نے دُنیا کو دیئے ہیں۔

ریاست اور حکومت کا فرق

انسانی تمدن کے بتدریج ارتقاء کے نتیجہ میں دوسری اہم تبدیلی یہ رونما ہوئی ہے کہ آج کے دور میں "ریاست" اور "حکومت" دو علیحدہ علیحدہ چیزیں تسلیم کی جاتی ہیں جبکہ آج سے دو سو سال قبل یہ صورت حال موجود نہیں تھی۔ صرف "حکومت" ہی کا وجود تھا' "ریاست" کا کوئی تصور نہ تھا۔ چنانچہ اِدھر کوئی شخص حکومت کے خلاف کھڑا ہوا اُدھر اسے فوراً باغی گردان کر گردن زدنی قرار دے دیا گیا۔ لیکن یہ صورت حال اس دور میں بدل چکی ہے۔ انسانی فکر اور انسانی تمدن کا جو ارتقاء ہوا ہے اس کے تحت اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ "ریاست" ایک بالکل

علیحدہ شے ہے اور حکومت صرف ریاست کے معاملات کو چلانے والا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ کسی ملک کے رہنے والے دستوری اور آئینی طور پر درحقیقت "ریاست" کے وفادار ہوتے ہیں' حکومت کے نہیں۔ حکومت کی اطاعت تو وہ کرتے ہیں' لیکن دراصل جس شے کو وفاداری کہا جاتا ہے وہ "ریاست" کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ پاکستان ایک ریاست ہے۔ اس ریاست کو چلانے والی ایک حکومت ہے جو اس ریاست کا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ یہ حکومت بدلتی رہتی ہے' آج کسی کی ہے تو کل اور کسی کی۔ کبھی سول حکومت ہے تو کبھی فوجی' کبھی ایوب صاحب کی تھی' کبھی یحییٰ صاحب کی' پھر بھٹو صاحب آئے اور ان کے بعد مسندِ اقتدار پر جنرل ضیاء الحق صاحب متمکن ہوئے۔ پس حکومت تو آنی جانی شے ہے۔ جس شے کو دوام ہے' جو چیز تسلسل کی حامل ہے' وہ تو درحقیقت ریاست ہے' لہٰذا کسی بھی ملک کے رہنے والوں کی اصل وفاداری ریاست سے ہوتی ہے' حکومت سے نہیں۔

تمدن کے ارتقاء اور فکرِ انسانی کی وسعت کے نتیجہ میں آج پوری دُنیا میں یہ بات مسلم سمجھی جاتی ہے کہ کسی حکومت کو بدلنے کا حق اس ملک کے رہنے والوں کو حاصل ہے۔ کوئی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی حکومت مستقل قسم کی حکومت ہے۔ جو بھی کہے گا یہی کہے گا کہ یہ وقتی اور عارضی انتظام ہے' حالات خراب ہو گئے تھے' انتشار ہو گیا تھا' خانہ جنگی کا اندیشہ لاحق تھا' لہٰذا فساد کو روکنے کے لئے یہ فوری نوع کا اقدام بطور فوری علاج کیا گیا ہے' وقتی طور پر حکومت کے انتظام کو فوج نے سنبھالا ہے' ہمارا اس کو مستقل قائم رکھنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی بھی ایسا حکمران جو جمہوری طریقہ سے برسرِاقتدار آیا ہو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اب اس کی یا اس کے خاندان کی اس ملک پر مستقل حکومت رہے گی۔ البتہ جہاں ملوکیت اور بادشاہت (Monarchy) قائم ہے وہاں معاملہ تاحال سابق انداز پر چل رہا ہے کہ وہاں خاندانی حکومتیں قائم ہیں۔ وہاں ریاست و حکومت کا کوئی علیحدہ تصور موجود نہیں ہے۔ وہاں کوئی سیاسی جماعت بنانے کی قطعی اجازت نہیں

ہے۔ جہاں جماعت بنی اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ بادشاہ صاحب کو ہٹانے کی کوئی کوشش پیشِ نظر ہے۔ تو وہ نظام چند ممالک میں تاہنوز چل رہا ہے۔ "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو" کے مصداق فی الحال ان کا معاملہ ایک طرف رکھیئے۔ البتہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ زیادہ دیر چلنے والا نظام نہیں ہے۔ اس کے گرد جو دیواریں ہیں وہ بہت بوسیدہ ہو چکی ہیں اور گرا ہی چاہتی ہیں۔ اب کوئی دیر کی بات ہے کہ اس کو ختم ہونا ہی ہے اور وہ بات ہو کر رہے گی جو اپنے زوال کے وقت شاہ فاروق نے کہی تھی کہ "دُنیا میں صرف پانچ بادشاہ رہ جائیں گے' چار تاش کے ہوں گے اور ایک انگلستان کا"۔ اس لئے کہ انگریزوں نے بادشاہت کو ایک نمائشی اور آرائشی علامت (Decoration Piece) کی حیثیت سے اپنے یہاں سجا کر رکھا ہوا ہے۔ اس کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیونکہ روایت پرستی اس قوم کے مزاج میں رچی بسی ہے لہٰذا وہ روایتی طور پر اس کو نباہ رہے ہیں' ورنہ ساری دُنیا جانتی ہے کہ وہاں اصل اقتدار و اختیار پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہے۔

اس نقطہ نظر سے یہ بات جان لیجئے کہ ساری دُنیا مانتی ہے کہ ایک ملک کے رہنے والوں کا یہ مسلّم حق ہے کہ وہ آئینی و دستوری طور پر حکومت بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ مدّت سے قبل (mid-term) نئے انتخابات کا مطالبہ لے کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بالکل استثنائی صورت ہے کہ ہنگامی حالات سے فائدہ اُٹھا کر کوئی جنرل بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اقتدار پر قبضہ کر لے اور رائے دہندگی کے حق کو معطل کر دے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ دُنیا میں اس وقت سب سے زیادہ قابل تسلیم بات یہی سمجھی جاتی ہے کہ ملک کے رہنے والوں کو سیاسی جماعتیں بنانے کا حق حاصل ہے اور ہر پارٹی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ موجودالوقت حکومت کو ہٹانے کے لئے اپنی انتخابی مہم چلائے' اس پر دل کھول کر اور تلخ و تند تنقید کرے' رائے عامّہ کو اپنی پارٹی کے حق میں ہموار کرے تاکہ حکومت اس پارٹی کی قائم ہو سکے۔ زیادہ سے

زیادہ پابندی یہ لگائی جاتی ہے کہ سرکاری ملازم کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہو کر اس کی انتخابی جِدّوجُہد میں شرکت نہیں کرسکتے اور انتخاب میں بھی کھڑے نہیں ہوسکتے۔ اس لئے کہ وہ ریاست کے ملازم اور کارکن ہیں اور ریاست کی طرف سے ان کو کچھ اختیارات ملے ہوئے ہیں۔ اگر وہ کسی سیاسی پارٹی سے عملاً وابستہ ہوں گے تو ان کے ہاتھ میں جو اختیارات ہیں ان کے غلط استعمال کا اندیشہ ہے۔ باقی رہا ووٹ دینے کا معاملہ 'تو ان کا یہ حق برقرار رہے گا' اس پر کہیں کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔ عوام کی رائے سے حکومت میں تبدیلی ہوگی اور اس معاملہ میں سرکاری ملازمین ہی نہیں بلکہ فوجیوں کو بھی حق ہوگا کہ اپنی پسندیدہ پارٹی کو ووٹ دیں۔ تمدن کے ارتقاء نے یہ متبادل طریقے عطا کئے ہیں' جبکہ اس سے پہلے یہ صورت نہیں تھی۔ ریاست اور حکومت کا تصور گڈمڈ تھا اور حکومت کو ہی ریاست کا مقام بھی حاصل تھا۔ نیز حکومت کو بدلنے کی کوشش کو بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ ریاست اور حکومت دو مختلف تصورات ہیں اور کسی بھی ملک کے باشندوں کو آئینی طور پر یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکومت کو بدل دیں۔

خلافتِ راشدہ کے نظام کی نوعیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلافتِ راشدہ کا نظامِ حکومت ہمارے نزدیک سب سے زیادہ محترم ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے مشن کو آگے بڑھانے والا نظامِ حکومت خلافتِ راشدہ ہی کا تو ہے۔ لیکن اس احترام و توقیر کے باوصف ایک بات جان لیجئے کہ اس کے ساتھ دو limitations (محدودیتیں) موجود تھیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ اس وقت بنیادی طور پر عرب میں ایک قبائلی معاشرہ قائم تھا۔ لہٰذا جہاں ایک قبائلی نظام پہلے سے موجود ہو اس میں اگر صرف سردارانِ قبائل سے مشورہ کرلیا جائے 'ان کی آراء کو معلوم کرلیا جائے تو گویا ہر قبیلہ کے افراد سے مشورہ کا حق ادا ہوگیا۔ دوسری یہ کہ سرداران کی حیثیت اپنے قبیلہ کے نمائندہ

کی ہوتی تھی۔ لہٰذا وہاں رائے دہندگان کی فہرستوں کی تیاری' بیلٹ پیپر اور انتخابات کے کھکھیڑ مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں قبائل کے سردار اور بڑے بڑے خاندانوں کے سربراہ اربابِ حل و عقد کہلاتے تھے۔ کسی معاملہ میں ان سے مشورہ ہو گیا تو گویا ﴿ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ کا تقاضا پورا ہو گیا۔ جبکہ موجودہ دور میں یہ بات نہیں چل سکتی۔ آپ نے دیکھا کہ اِس دور کے تقاضے کے تحت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جیسے مطلق العنان حاکم کو بھی ریفرنڈم کا ڈرامہ رچانا پڑا۔ اس قسم کی کسی صورتِ حال کا ثبوت آپ کو خلفائے راشدین ؓ کے دور میں تو نہیں ملے گا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اس طرز کا سیاسی نظام جو خلافتِ راشدہ میں قائم تھا' جوں کا توں اس دور میں چل سکتا ہے' ایک مغالطہ ہے۔ اس دور میں حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر ایک ایسا نظام بنانے پر غور کرنا ہو گا جس میں اصول تو وہی رہیں' لیکن طریقِ کار کو تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔

ایک قابلِ غور بات

حضرت عثمان غنی ؓ کے خلاف جو تحریک اُٹھی وہ یقیناً ایک یہودی سازش تھی۔ شروع ہی سے اس کے عزائم مجرمانہ تھے' اس کے اندر نیک نیتی کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی نظامِ حکومت میں جہاں بدنیتی کے ساتھ یہ معاملہ ہو گیا' وہاں نیک نیتی کے ساتھ بھی تو یہ معاملہ ہو سکتا ہے۔ اس امکان کو خارج از بحث نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل نیک نیتی کے ساتھ بھی کسی ملک میں ایسی تحریک اُٹھ سکتی ہے کہ موجودہ حکمران ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہیں' انہیں معزول ہونا چاہئے اور ان کی جگہ نئی قیادت کا انتخاب ہونا چاہئے۔ اُس وقت تک ہمارے یہاں اس مقصد کے لئے کوئی ذرائع (Channels) موجود نہیں تھے۔ کوئی راستہ نہیں تھا کہ جس کے ذریعہ سے ایسا اختلافِ رائے سامنے آ سکتا۔ درحقیقت تمدنی ارتقاء نے جو متبادل راستے دیئے ہیں انہی کے ذریعہ اختلافِ رائے بھی سامنے آتا ہے اور وہ

اختلاف صحت مند انداز میں حل (resolve) بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تمدنی اور فکری ارتقاء نے اختلاف کے اظہار اور ان کو حل کرنے کے جو طریقے اور راستے (Channels) کھول دیئے ہیں اب ہمیں انہی کو سامنے رکھ کر اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے لئے کوئی راہ معین کرنی ہوگی۔

بنیادی انسانی حقوق

تمدنی ارتقاء نے اس بات کو بنیادی انسانی حقوق میں سے ایک حق قرار دیا ہے کہ ایک شخص اپنی جماعت بنائے اور لوگوں کو اپنی بات کا قائل کرے' زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائے اور وہ یہ کام کھلم کھلا اور برملا کرے۔ یہ اس کا آئینی حق ہے' اسے زیر زمین جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پُرامن طریقہ سے ہر پارٹی کو برسرِ اقتدار پارٹی کے خلاف مہم اور تحریک چلانے کا حق پوری دُنیا میں اب تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہمارے سوچنے کا کام

ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم تمدنی ارتقاء اور اس انقلاب کو سامنے رکھیں جس نے یہ متبادل طریقے دُنیا کو دیئے ہیں کہ آج یہ امکان موجود ہے کہ حزبِ اختلاف قائم ہو۔ جب تک وہ پارٹی بغاوت نہیں کرتی اور پُرامن طور طریقے اختیار کرتی ہے' کوئی قانون اس کے خلاف نہیں جائے گا۔ وہ پارٹی تبلیغ کا حق رکھتی ہے' اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کا حق رکھتی ہے' جو لوگ اس کے خیالات کو قبول کریں' انہیں جمع کرنے اور منظم کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اسے اپنے طریق تنظیم کو اپنی صوابدید کے مطابق اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ اپنے سربراہ کو صدر رکھے' امیر کہے' یا کوئی اور اصطلاح اختیار کرے اسے حق ہے۔ جب تک یہ پارٹی بدامنی اور فساد کی کوئی صورت پیدا نہ کرے' خانہ جنگی کی صورت پیدا نہ کرے اس وقت تک اس کے وہ تمام حقوق مسلّمہ ہیں جو ابھی بیان ہوئے۔ ان میں سے کوئی حق بھی

سلب نہیں کیا جا سکتا۔

حالات کا دیانت دارانہ تجزیہ

ہمارے معاشرہ میں اسلامی شعائر مثلاً نماز' روزہ' زکوٰۃ حج کی اجازت ہے' اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ بھٹو صاحب کے دور میں بھی ان شعائر سے روکتا تو کوئی نہیں تھا۔ البتہ یہ فضا بڑی حد تک پیدا ہو گئی تھی کہ بھٹو صاحب کی پارٹی کے اکثر کارکن ان چیزوں کا مذاق اڑانے لگے تھے۔ ضیاء الحق صاحب کے دور میں وہ بات نہیں رہی کہ کسی نمازی پر فقرے چُست کئے جائیں یا کوئی سرکاری افسر اس بات پر شرمائے کہ وہ اگر کسی فنکشن یا مجلس سے نماز کے لئے اُٹھ کر جائے گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ ماحول میں کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہی سب کچھ ہے؟ ایک شخص کی رائے ہو سکتی ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے' بلکہ ہم نے صرف اوپر سے غازہ مل دیا ہے' حقیقت کے اعتبار سے تو یہ کچھ بھی نہیں بدلا۔ یہ محض تصنع ہے جس کے باعث عوام کے اندر اسلام سے بد دلی پیدا ہو رہی ہے کہ ہمارے شب و روز تو وہی ہیں جو پہلے تھے' بلکہ بگاڑ میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہی سرمایہ دار' جاگیردار اور زمیندار کی حکومت ہے' وہی رشوت کا لین دین دھڑلّے سے ہو رہا ہے بلکہ خود سربراہِ مملکت کے بقول اس کے نرخ بہت بڑھ گئے ہیں۔ اسمگلنگ کا کاروبار کھلے بندوں ہو رہا ہے۔ سود کا لین دین جاری ہے۔ منشیات کی اندرونی و بیرونی تجارت کھلے عام ہو رہی ہے۔ بلیک مارکیٹنگ کا دھندا زوروں پر ہے۔ ڈاکہ' چوری' لوٹ مار' قتل و غارت کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اغوا اور عصمت دری کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں۔ علاقائی قومیتوں کا احساس مزید اُبھر رہا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں جلد ہی یہ بہت سے خوفناک عفریتوں کا روپ نہ دھار لے۔ استحصالی اور جابرانہ نظام مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرف حالات کی صحیح تصویر یہ ہے' دوسری طرف اسلام آ رہا ہے' اسلام آ رہا ہے کے فلک شگاف نعرے لگائے جا

رہے ہیں' بلند بانگ دعوے کئے جارہے ہیں۔ حالانکہ آج کے اور دس بارہ سال قبل کے معاشرہ کا تقابل کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ سرِ مُو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ بحیثیتِ مجموعی حالات روز بروز بد تر سے بد ترین ہوتے چلے جارہے ہیں' بلکہ ہم نے اس معاشرے پر اوپر کا کچھ غازہ مل کر اور کچھ ظاہری ٹیپ ٹاپ کر کے اسے اسلامی معاشرہ کہہ دیا ہے اور ساری دُنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

ان حالات میں ضروری ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ کھڑا ہو اور وہ برملا یہ حق بات کہے کہ ہمیں اس دھوکے کا پردہ چاک کرنا ہے اور انقلابی طریق کار پر عمل کرتے ہوئے اس نظام کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ کر اس کی جگہ صحیح و کامل اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ ایسے شخص کا دینی فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس کی دعوت دے' اس کے لئے لوگوں کو جمع کرے' انہیں منظم کرے' ان کی تربیت کا انتظام کرے۔ جب تک وہ امنِ عامّہ کی موجودہ صورتحال کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرتا' جب تک وہ زبان سے بغاوت کا اعلان نہیں کرتا' اسے یہ کام کرنے کا آئینی و قانونی حق ہے۔ بلکہ یہ اس کے اپنے ایمان کا تقاضا ہے کہ ابتدائی مراحل کو طے کرنے کی سعی و جُہد کرے اور انقلاب لانے کے لئے اقدام کرے۔ ان مراحل میں اولاً دعوت کا مرحلہ ہے۔ پھر لوگوں کی تنظیم ہے' پھر ان کی تربیت ہے۔ پھر اس دوران اس پر جو تکلیف آئے اسے جھیلنا ہے۔ اس لئے کہ اسے خود اپنے اوپر اسلام قائم کرنا ہے۔ مثلاً ایک شخص کے کاروبار کی کافی وسیع و عریض بساط بچھی ہوئی تھی' لیکن وہ اگر آج اسے سود کی آمیزش اور آلودگی سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہے تو اس کے کاروبار کی بساط لپٹنی شروع ہو جائے گی۔ اگر کسی شخص کے گھر میں رشوت کے ذریعے سے اللے تللے ہو رہے تھے' آج وہ طے کرتا ہے کہ میں اب رشوت نہیں لوں گا تو اس کے خاندان کو دونوں وقت سادہ ترین غذا بھی شاید بمشکل ملے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنے ہی گھر میں صحیح صحیح شرعی پردہ نافذ کر دے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی میں نکّو بن کر رہ جائے گا اور اس کے اپنے اعزّہ و اقارب اسے دیوانہ اور مجنون کہنے لگیں گے اور

اس کا مقاطعہ کر دیں گے۔ وہ یہ سب تکلیفیں جھیلے' انہیں برداشت کرے' ان میں سے کسی بھی مصیبت پر جوابی کارروائی کے متعلق نہ سوچے' retaliate نہ کرے۔ کہیں جذبات سے مغلوب ہو کر مشتعل نہ ہو' کسی کو گالی نہ دے' کوئی ایسا اقدام نہ کرے کہ جس سے امن کا معاملہ درہم برہم ہو۔ یہ ہے اس دور میں ایک سچے مسلمان کی حقیقی تربیت کی کسوٹی۔ آج کلمۂ توحید و رسالت پڑھنے پر مار نہیں پڑے گی' مقاطعہ نہیں ہو گا' گھروں سے نکالا نہیں جائے گا' مجنون اور دیوانہ نہیں کہا جائے گا' تمسخر اور استہزاء نہیں ہو گا' بلکہ اِس دور میں اگر کوئی شخص ہزار دانے کی تسبیح لے کر سڑک پر کہیں بیٹھ جائے اور بلند آواز سے کلمہ کا ورد کرے یا "حق ہُو' حق ہُو" کے نعرے لگائے تو موجودہ معاشرہ ایسے شخص کی بڑی عزّت و توقیر کرے گا' اسے پہنچا ہوا بزرگ سمجھے گا' اس کی خدمت اپنے لئے سعادت سمجھے گا۔ لیکن کوئی شخص کاروبار کو سود سے پاک رکھے' انکم ٹیکس کی چوری نہ کرے' رشوت نہ دے' گھر میں صحیح اسلامی پردہ کو نافذ کرے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ اپنے ہی بیگانے بن جائیں گے اور وہ اپنے ہی گھر اور اپنی ہی قریبی سوسائٹی میں نکو بن کر رہ جائے گا۔ اس کا وہ مذاق اڑے گا کہ توبہ ہی بھلی۔

موجودہ دَور میں اقدام کی نوعیت

اگر کسی معاشرہ میں انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے مرحلہ وار کام ہو رہا ہے' دعوت و تبلیغ کا مرحلہ درپیش ہے' تنظیم کا مرحلہ چل رہا ہے' تربیت کا مرحلہ طے ہو رہا ہے' اس سلسلہ میں جن تکالیف و مصائب سے سابقہ پیش آ رہا ہے انہیں جھیلا جا رہا ہے اور آئندہ بھی جھیلنے کا عزم ہے تو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک جماعت بنائی جائے گی۔ اب فرض کیجئے کہ یہ جماعت اتنی مضبوط اور مؤثر ہو گئی ہے کہ اقدام کیا جا سکتا ہے تو اس اقدام اور تصادم کے مراحل کے موقع پر وہ جماعت کیا کرے گی۔؟ اس کے اقدام کی نوعیت کیا ہو گی؟ اسی مسئلہ سے بات شروع

ہوئی تھی۔ جان لیجئے کہ اس کے لئے ہمیں تمدن کی موجودہ ارتقائی صورت حال نے کچھ متبادل طریقے دیئے ہیں۔

اب اسلامی انقلاب کے لئے اقدام کا واحد راستہ یہ ہے کہ اگر ایک ایسی تنظیم وجود میں آجائے جو پہلے چار مراحل یعنی دعوت' تنظیم' تربیت' اور صبرِ محض سے گزر چکی ہو تو وہ رائج الوقت نظام اور اس کو چلانے والے انتظامی ادارے (یعنی حکومت) کے مقابلہ میں امربالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے کمر کس لے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر کھڑی ہو جائے اور صرف زبانی و کلامی بات کرنے کے بجائے علی الاعلان یہ کہے کہ اب فلاں فلاں منکرات ہم ہرگز نہیں ہونے دیں گے' یہ کام اب ہماری لاشوں پر ہو گا۔ پھر اس پر ڈٹ جائے اور ہر نوع کی مالی و جانی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہ کرے۔ البتہ اس اقدام میں اس بات کا التزام و لحاظ ضروری ہو گا کہ انہی منکرات کو چیلنج کیا جائے جو تمام مسالک کے ماننے والوں کے نزدیک مسلّم ہوں۔ کسی مسئلہ میں اگر کسی کی شاذ رائے ہو کہ وہ منکر ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس پر تمام مسالک کے لوگوں کو جمع نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس پر کوئی تحریک ہی برپا کی جاسکتی ہے۔ ہدف اس کام کو بنانا ہو گا جو سب مسلمانوں کے نزدیک منکر ہو' جو سب کے نزدیک حرام ہو۔ مثال کے طور پر بے حیائی' عریانی' تبرّجِ جاہلیہ' مرد و عورت کے مخلوط اجتماعات' عورت کی بطورِ اشتہار تشہیر اور یومِ پاکستان اور یومِ استقلال کے مواقع پر افواجِ پاکستان کے ساتھ اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی معنوی نوجوان بیٹیوں کی سڑکوں پر مَردوں کے سامنے سینہ تان کر پریڈ۔ یہ سب وہ خلافِ شریعت امور ہیں جن کے منکر ہونے کے بارے میں تمام مذہبی مکاتب فکر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ الغرض موجودہ دور میں اسلامی انقلابی جماعت منکرات یعنی خلاف شریعت کاموں کے خلاف مظاہروں کے ذریعے اقدام کا آغاز کرے گی۔ تمدنی ارتقاء نے ان مظاہروں کی بہت سی صورتوں سے دُنیا کو روشناس کرایا ہے جن میں پکٹنگ (Picketing) یعنی دھرنا مار کر بیٹھنا' احتجاجی طور پر حکومت کو یا عوام

کو کسی کام سے روکنے کے لئے گھیراؤ وغیرہ کرنا بھی شامل ہے۔

اِقدام کی لازمی شرائط

البتہ اس موقع پر ان شرائط کا اعادہ ضروری ہے جن کو اس اقدام یعنی مظاہروں اور دیگر احتجاجی طور طریقوں کو اختیار کرنے کی صورت میں ملحوظ رکھنا لازم ہے ـــــ یعنی اپنی طرف سے ہاتھ بالکل نہیں اُٹھانا ہے' کسی قسم کی توڑ پھوڑ نہیں کرنی ہے' قریباً بارہ تیرہ برس تک مکّہ مکرمہ میں صبرِ محض (Passive Resistance) کا جو معاملہ رہا ہے کہ ہر قسم کے جور و ستم اور ظلم و تشدّد کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جس پامردی سے برداشت کیا ہے' اپنی طرف سے جوابی کارروائی تو درکنار مدافعت تک نہیں کی' وہی طرز عمل اس اقدام یعنی مظاہروں' گھیراؤ وغیرہ کے معاملہ میں اس انقلابی جماعت کو اختیار کرنا ہو گا۔ ان کا یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہو گا کہ احتجاجی جلوس تو ہم نے نکالا تھا لیکن توڑ پھوڑ کوئی اور کر گیا۔ اگر ایسی انقلابی جماعت کے اثرات اتنے نہیں ہیں کہ وہ عوام کو پُرامن رکھ سکے اور نہ اس کے پاس ایسے کارکن ہیں جو عوام کو کنٹرول کر سکیں اور ہر نوع کی بدامنی کو قابو میں رکھ سکیں تو ایسی صورت میں اس تنظیم کو مظاہروں کا حق نہیں ہے۔ اس اقدام کا مرحلہ اسی وقت آئے گا کہ جب اس انقلابی جماعت کو اپنی امکانی حد تک یہ اندازہ ہو جائے اور یہ معلومات حاصل ہوں کہ ہمارے اپنے زیر اثر اور ہمارے تربیت یافتہ لوگ اتنے ہیں کہ وہ پُرامن طریق پر سڑکوں پر آ کر مظاہرے کر سکتے ہیں اور ان کی اخلاقی ساکھ اتنی مضبوط ہے کہ ان کے مظاہروں کے دوران بدامنی کا کوئی حادثہ نہیں ہو گا۔ اور اگر چند شرپسند لوگ بدامنی پر اتر ہی آئیں تو ان کی تنظیمی طاقت اتنی مضبوط ہو کہ وہ ان اشرار کی گردنیں خود دبوچیں اور ان پر قابو پا کر انہیں حکومت کے حوالے کریں کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں' یہ تخریب کار عناصر ہیں' جو اس پُرامن اور عدم تشدد کی اسلامی تحریک کو سبوتاژ کرنے کے لئے آ گئے ہیں۔ اس انقلابی تنظیم کے تربیت یافتہ

جلوس نہ بسوں کو جلائیں گے' نہ نیون سائن اور ٹریفک سگنلز توڑیں گے' نہ ہی وہ نجی یا سرکاری املاک کو نقصان پہنچائیں گے۔ ان جلوسوں اور مظاہروں کا مطالبہ یہ ہو گا کہ فلاں فلاں کام شریعت کی رو سے منکر ہیں' حرام ہیں' ہم ان کو کسی حال میں نہیں ہونے دیں گے۔ حکومت گرفتار کرے تو مظاہرین کوئی مزاحمت نہیں کریں گے۔ لاٹھی چارج کرے تو اسے جھیلیں گے۔ آنسو گیس کے شیل برسائے تو برداشت کریں گے۔ حتیٰ کہ گولیاں برسائے تو خوشی خوشی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں گے۔ لیکن نہ پیچھے ہٹیں گے اور نہ اپنے موقف کو چھوڑیں گے۔

یہاں بعض حضرات کو یہ غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے اور بعض حضرات دانستہ یہ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ یہ تو حکومت وقت کے خلاف بغاوت اور مسلح تصادم کی بات ہے' حالانکہ انقلابی طریق کار کا مطلب لازمی طور پر مسلح بغاوت اور تصادم نہیں ہے' بلکہ موجودہ دور میں یہ بات قریباً خارج از بحث ہے۔ اسلئے کہ اولاً تو سابقہ ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسی حکومت سے ہے جو قانوناً مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ثانیاً یہ کہ حکومت کے پاس باقاعدہ تربیت یافتہ اور جدید اسلحہ سے لیس فوج موجود ہے' جبکہ عوام الناس نہتے ہیں' لہٰذا ان دونوں اعتبارات سے فی زمانہ مسلح تصادم اور بغاوت کے راستے معدوم کے درجے میں آتے ہیں۔ چنانچہ اب سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں وہ طریقہ اختیار کرنا ہو گا جس سے دورِ جدید کے تمدنی ارتقاء نے لوگوں کو واقف کرایا ہے۔ آج عوام عدم تشدد کے اصول پر پُرامن اور منظم مظاہروں کے ذریعے اپنے عزم اور قوت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کیلئے ہمیں قرآن و حدیث سے جو رہنمائی ملتی ہے اسے میں "نہی عن المنکر بالید" سے تعبیر کرتا ہوں۔

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

قرآن سے رہنمائی

نبی اکرم ﷺ نے قرآن حکیم کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ یعنی ہر دور میں اس سے انسان کو ہدایت ملتی رہے گی۔ تاریخ کے

مختلف ادوار میں' جیسے جیسے انسانی ذہن اور تمدن کا ارتقاء ہو گا' یہی قرآن انسان کی انگلی پکڑ کر لے چلے گا اور ہر ہر مرحلہ پر ہدایت دے گا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ قرآن مجید میں نہی عن المنکر پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے۔ جبکہ دعوت کا حکم اتنے زور شور کے ساتھ قرآن مجید میں نہیں ملے گا۔ آپ کو ﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ..... ﴾ یا ﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ..... ﴾ والی آیات مل جائیں گی۔ قرآن مجید میں عام مسلمانوں کے لئے تبلیغ کا حکم ملے گا ہی نہیں۔ وہاں تو تبلیغ کا حکم صرف رسول اللہ ﷺ کے لئے آیا ہے : ﴿ یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ﴾ وہ تو نبی اکرم ﷺ نے اسے تمام اہل ایمان کے لئے عام کیا ہے کہ ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) "پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت"۔ البتہ قران مجید میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر بہت سی آیات ہیں۔ بلکہ بعض آیات میں نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت سامنے آتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے :

۱) سورۃ النحل کی وہ آیت جو اکثر خطباتِ جمعہ کے آخر میں پڑھی جاتی ہے' اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے کہ وہ خود یہ کام کرتا ہے :

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ ۚ ﴾ (النحل : ۹۰)

"اللہ عدل' احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے"۔

۲) حضرت لقمان کی نصیحتوں میں اس کا بڑے شد و مد سے بیان آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کی نصائح کا قرآن مجید میں ذکر فرما کر ان کو دوام عطا فرما دیا ہے۔ ان نصائح میں یہ بھی ہے :

﴿ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾ ﴾

"اے میرے پیارے بچے! نماز قائم رکھ' نیکی کا حکم دے اور بدی سے

روک۔ اور اس کام کی انجام دہی میں جو بھی تکلیف و مصیبت آئے اسے برداشت کر۔ یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے"۔

۳) سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ میں نبی اکرم ﷺ کی جہاں بہت سی شانیں بیان ہوئی ہیں وہاں یہ بھی ہے ﴿ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ یعنی خود رسول اللہ ﷺ کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ آپ معروف کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

۴) بنی اسرائیل پر ایک فردِ قراردادِ جرم تو وہ ہے جو سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع سے شروع ہو کر دسویں رکوع پر ختم ہوتی ہے۔ مزید برآں مختلف مقامات پر ان پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں ان میں بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق اس لئے بھی بنے کہ انہوں نے یہ کام چھوڑ دیا۔ ان آیات میں یہ بات غور طلب بات ہے کہ پورا زور نہی عن المنکر پر ہے۔ یعنی بدی کو نہ روکنا اور اس فریضہ کو ترک کر دینا امر بالمعروف کو چھوڑ دینے کے مقابلہ میں زیادہ بڑا جرم ہے۔ اس لئے کہ منکرات کا فروغ ہی وہ شے ہے جس سے معاشرے میں گندگی اور فساد پھیلتا چلا جاتا ہے اور ماحول اتنا خراب ہو جاتا ہے کہ اس میں امر بالمعروف بے اثر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۳ میں فرمایا:

﴿ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ ﴾

"کیوں نہیں منع کرتے ان کے درویش (صوفیاء) اور علماء ان کو گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے۔ بہت ہی برے عمل ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔"

۵) اسی سورہ کی آیت ۷۹ میں فرمایا:

﴿ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾

"(یہ رہبان و احبار وہ لوگ ہیں کہ) جب ان کے یہاں منکر پر عمل ہو رہا تھا تو وہ اس سے منع نہیں کرتے تھے۔ کیا ہی بری روش تھی جس پر وہ چل

رہے تھے"۔

لہٰذا یہ بھی برابر کے مجرم ہیں اور پاداش میں بھی برابر کے شریک ہوں گے۔

۶) سورۃ الاعراف میں (آیت ۱۶۳ سے لے کر ۱۶۶ تک) یہود کے اس قبیلہ کا ذکر ہے جس کا پیشہ ماہی گیری تھا۔ سبت (ہفتہ) کا دن ان کے ہاں صرف اللہ کی عبادت کے لئے مختص تھا اور اس دن ان پر مچھلی کا شکار کرنا حرام تھا۔ ان لوگوں کو حکم عدولی اور نافرمانی کی عادت تھی۔ لہٰذا اللہ کی طرف سے یہ آزمائش آئی کہ ہفتہ کے دن مچھلیاں کنارے پر آ کر سطح آب پر خوب اٹھکیلیاں کرتی تھیں اور باقی دنوں میں غائب رہتی تھیں۔ ان لوگوں سے صبر نہ ہو سکا۔ چنانچہ صریح حکم الٰہی کے خلاف حیلے کرنے لگے۔ ہفتہ سے ایک دن پہلے (جمعہ کے دن) کناروں پر دریا کا پانی کاٹ کر حوض بنا لیتے اور جب مچھلیاں ہفتہ کے دن ان کے بنائے ہوئے حوضوں میں آ جاتیں تو نکاسی کا راستہ بند کر دیتے اور اگلے دن اتوار کو جا کر پکڑ لاتے۔ تاکہ اس حیلہ کی بناء پر ہفتہ کو شکار کرنے کا الزام ان پر نہ آئے۔ اس حیلہ سازی اور مکاری کے ضمن میں اس قبیلہ کے لوگ تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو یہی حیلہ ساز لوگ تھے جو دھڑلے کے ساتھ اس گناہ میں ملوث تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو اگرچہ اس حیلہ سازی اور نافرمانی میں شریک نہیں تھے لیکن ان کو اس سے روکتے بھی نہیں تھے۔ جبکہ تیسرے وہ لوگ تھے جو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے سے اور اس حیلہ سازی سے منع کرتے تھے۔ یعنی نہی عن المنکر کا فریضہ مسلسل ادا کرتے رہتے تھے۔ درمیانی قسم کے لوگ اس مؤخر الذکر گروہ سے کہتے کہ تم ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ چاہتا ہے کہ ہلاک کرے یا ان کو عذاب دے، تو وہ جواب میں کہتے : ﴿ مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ "(ہم انہیں اس لئے نصیحت کرتے ہیں کہ) تمہارے رب کے حضور میں معذرت پیش کر سکیں اور اس لئے بھی کہ شاید وہ لوگ تقویٰ کی روش پر آ جائیں (نافرمانی اور سرکشی سے باز آ جائیں)" ان تینوں گروہوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ ﴿ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ ﴾ "ہم نے عذاب سے بچایا ان کو جو روکتے تھے اس بُرے کام سے" ___ یعنی درحقیقت نجات کے مستحق وہی لوگ بنتے ہیں جو لوگوں کو بدی

سے روکنے کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ بدی سے صرف خود رُکے رہنا نجات کے لئے کفایت نہیں کرے گا۔ جو لوگوں کو بدی سے روکتے نہیں ہیں وہ بھی ان لوگوں کے مانند گردانے جاتے ہیں جو بدی میں ملوث ہیں۔

۷) اب قرآن مجید میں دیکھیں کہ امربالمعروف ونہی عن المنکر کے ضمن میں اُمت مسلمہ کو کیا ہدایات اور احکام ملے ہیں۔ سورۂ آل عمران میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ (آیت ۱۱۰)

"تم وہ بہترین اُمت ہو جسے ہم نے نکالا ہے پوری نوعِ انسانی کے لئے۔ تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو اور تم اللہ پر اپنا ایمان پختہ رکھو"۔

بین الاقوامی سطح پر بحیثیت اُمت یہی تمہاری اجتماعی ڈیوٹی ہے۔

۸) دوسری آیت وہ ہے کہ جس میں اس صورت حال کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے کہ جب اُمت خود مریض ہو گئی ہو' جب خود اسے اصلاح کی ضرورت ہو تو ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے؟ اس کا حل آل عمران کی آیت ۱۰۴ میں پیش کیا گیا ہے:

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ٥ ﴾

"اور چاہئے کہ تم میں ایک جماعت ایسی موجود رہے جو نیکی کی طرف بلاتی رہے' اچھے کاموں کا حکم کرتی رہے اور برائی سے روکتی رہے۔ (جو لوگ یہ کام کریں گے) وہی فلاح پائیں گے"۔

اس آیت مبارکہ سے ہمیں یہ رہنمائی ملی کہ کچھ لوگ تو ایسے ہوں جو جاگیں' ہوش میں آجائیں۔ وہ مل جل کر ایک "اُمت" بنیں۔ یعنی اُمت کے اندر ایک اُمت بنائیں' جماعت کے اندر جماعت کی شکل اختیار کریں۔ بڑی پارٹی تو وہی ہے یعنی اُمت مسلمہ' چاہے اس کی عظیم ترین اکثریت بے عمل یا فاسق و فاجر ہو' جو بھی کلمہ گو ہے وہ قانوناً اُمت محمد ﷺ میں شامل ہے۔ لیکن یہاں ہدایت کی جارہی ہے کہ اس بڑی اُمت

میں سے ایک چھوٹی اُمت تشکیل پائے جو ان لوگوں پر مشتمل ہو جو خود حق پر چلیں اور معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے کے لئے حق کی دعوت دیں۔ اس آیت کے آخری حصے میں حصر کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کامیابی صرف ان لوگوں کے لئے ہے اور فلاح صرف وہی لوگ پائیں گے جو اِس سہ نکاتی پروگرام یعنی دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی انجام دہی میں تن' من دھن کی بازی لگا دیں گے۔ اگر ہر شخص کلمہ گو ہونے کے ناطے فلاح کا امیدوار بنا بیٹھا رہے تو اس کی قرآن مجید میں کوئی ضمانت موجود نہیں ہے۔ یہ ضمانت صرف ان کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ ان فرائض کی انجام دہی کے لئے کمر کس لیں اور تکلیفیں جھیلنے کے لئے تیار ہوں۔

۹) سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ اس سلسلے کی بڑی عظیم اور دلکش آیت ہے۔ اس آیت مبارکہ میں وہ ظاہری و باطنی اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو ایک بندۂ مومن کی سیرت و کردار میں درکار ہیں۔ ان میں تین تین اوصاف کے تین سیٹ (sets) ہیں۔ ایک طرف اُن چھ اوصاف کا بیان ہے جو ایک مؤمن صادق کی زندگی میں انفرادی سطح پر مطلوب ہیں۔ دوسری طرف ایک مسلم معاشرہ کا فرد ہونے کے اعتبار سے ایک بندۂ مومن پر جو اجتماعی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کی ادائیگی کے لئے جو تین اوصاف درکار ہیں وہ بیان ہو گئے۔ اس طرح ایک آیت میں نو اوصاف جمع کر دیئے گئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ .... ﴾

"(یہ مؤمنین جنہوں نے جنت کے عوض اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے) اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے ہیں' عبادت گزار ہیں' اس کا شکر ادا کرنے والے' اس کی ثناء کرنے والے ہیں' (اس کے دین کی خاطر) زمین میں گردش کرنے والے ہیں' اس کے حضور میں رکوع کرنے والے ہیں'

یہ چھ اوصاف وہ ہیں جو انفرادی طور پر ایک بندۂ مومن کے لئے مطلوب ہیں۔ یہ گویا تربیت و تزکیہ کے مراحل ہیں۔ یہ اوصاف ہیں جنہیں علامہ اقبال نے اپنے اس ایک مصرع میں سمو دیا ہے ؎ بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن! یہ چھ اوصاف اگر حاصل ہو گئے تو علامہ اقبال کے بقول اب تم پختہ ہو گئے۔ اب کیا کرنا ہے؟ ؎ چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

اور اس آیت مبارکہ کی رُو سے اگلا قدم یہ ہو گا :

﴿ ... الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

"...نیکی کا حکم دینے والے ہیں' بدی سے روکنے والے ہیں اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ پس (اے نبیؐ ان) مؤمنین کو بشارت سنا دیجئے۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے والے کہ ہم اللہ کی حدود کو توڑنے نہیں دیں گے' ہم منکرات کو کسی طور پر برداشت نہیں کریں گے۔ ان تین آخری اوصاف میں اس مسئلہ کی کلید ہے کہ ایک مسلمان حکومت میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے جو انقلابی جماعت میدان میں آئے گی وہ اسی بنیاد پر آئے گی کہ صرف امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور تحفظ حدود اللہ کے لئے پُرامن اور عدمِ تشدد پر مبنی مظاہرے کرے گی' گھیراؤ کرے گی' دھرنا مار کر بیٹھے گی اور ترکِ موالات کے تمام طور طریقے اختیار کرے گی۔

۱۰) اسی سورۃ التوبہ کی آیت ۶۷ اور آیت ۷۱ میں اہل نفاق اور اہل ایمان کی روش اور طرزِ عمل کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ آیت ۶۷ میں منافقین کے رویہ کے متعلق فرمایا :

﴿ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ..... ﴾

"منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے سے ہی ہیں' (سب کی ایک ہی

روش ہے۔ یہ معاشرہ میں) بُری باتوں اور بُرے کاموں کو ترویج دیتے ہیں'
اور خیر اور نیکی کے کاموں کے فروغ کو روکتے ہیں..."

اور آیت ۷۱ میں اہل ایمان کے طرزِ عمل کے لئے فرمایا کہ :

﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ... ﴾

"اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہوتے ہیں' نیک کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں . . . "

اب ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ اِس وقت تمام مسلم معاشروں میں جو لوگ مسند اقتدار پر براجمان ہیں اور جن کے قبضے میں ملک کا نظامِ تعلیم' ذرائع ابلاغ اور مملکت کے سارے وسائل ہیں وہ کن خصوصیات کے حامل ہیں۔ وہ فحاشی کے علمبردار ہیں' بے پردگی اور بے حیائی کے مبلغ ہیں۔ ہر نوع کی اباحیت کو ماننے والے اور اس کے پرچارک ہیں۔ یہی طبقہ ہے جو شریعت کی حدود اور پابندیوں کو توڑنے کے لئے نہایت منظم طور پر مسلم معاشروں میں مصروفِ عمل ہے۔ اجتماعی زندگی کے تمام شعبے ان کی ترک تازیوں کی جولان گاہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کون ہیں؟ قانوناً مسلمان ـــــ لیکن سورۃ التوبہ کی آیت ۶۷ میں انہیں منافقین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک مسلم معاشرہ کے لئے کھلے کافروں' منکروں اور غیر مسلموں سے کہیں زیادہ خطرناک عنصر ان منافقین کا ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ آستین کے سانپ کا رول ادا کرتے ہیں۔

۱۱) سورۃ الحج کی آیت ۴۱ میں تمکّن فی الارض یعنی اللہ کی طرف سے حکومت ملنے کے بعد اہل ایمان کے بنیادی فرائض بیان فرمائے گئے :

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ... ﴾

"وہ لوگ جنہیں ہم زمین میں تمکّن واقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے...."

یہ آیت مبارکہ ایک اسلامی حکومت کے بنیادی و اساسی فرائض کے تعین کے لئے نصِ قطعی کا درجہ رکھتی ہے۔

۱۲) نہی عن المنکر کے بارے میں سورۂ ہود کی آیت ۱۱۶ و ۱۱۷ پر بھی غور کر لیجئے:

﴿ فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ ﴾

"پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہل خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم، جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچالیا، ورنہ ظالم لوگ تو انہی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیئے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔"

اس آیت میں سابقہ رسولوں کی اُمتوں کا بیان ہے کہ جب رسولوں کی اُمتیں بگڑتی رہیں اور دین کی تعلیمات کو قبول کرنے سے انکار کرتی رہیں تو ایسی اُمتوں کو ہلاک کر دیا جاتا اور صرف ان تھوڑے سے لوگوں کو بچالیا جاتا جو نہی عن الفساد کا فریضہ انجام دیتے رہتے تھے۔

مندرجہ بالا متعدد قرآنی آیات سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ہمارے دین کے اندر کس قدر عظیم اہمیت کی حامل شے ہے۔ ان آیات پر غور و فکر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب اُمّتِ محمد ﷺ میں دین کے احیاء اور دین کو بتمام و کمال قائم کرنے کا مسئلہ آئے گا اور فاسد و استحصالی نظام کو بیخ و بن سے اُکھاڑ کر پورے نظام کو توحید کی بنیادوں پر استوار کرنے کا مرحلہ آئے گا تو درحقیقت اقدام کا یہی راستہ ہو گا کہ ایک منظم اور تربیت یافتہ اسلامی انقلابی جماعت امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور تحفّظِ حدود اللہ کے لئے پُرامن مظاہروں اور ان تمام

طریقوں سے حکومتِ وقت کو مجبور کر دے کہ وہ معروفات کی ترویج کرے' منکرات کا قلع قمع کرے اور حدود اللہ کو نافذ کرے۔ یہ بغاوت کا راستہ نہیں ہے۔ کسی حکومت کے خلاف کھڑے ہو کر اعلانِ بغاوت کرنے اور قوم کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ انقلابی جماعت حکومت کی طالب ہو گی ہی نہیں۔ حقیقی اسلامی جماعت کبھی بھی اقتدار کی طالب بن کر میدان میں نہیں آتی۔ اس کا تو صرف یہ مطالبہ ہو گا کہ جب مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور مسلمان ہی حکمران ہیں تو دین کو صحیح شکل میں قائم کرو اور اس کے خلاف جو کچھ ہے اسے ختم کرو۔ نہیں کرتے تو پھر ہم میدان میں موجود ہیں۔ پھر ہمارے سینے حاضر ہیں گولیاں چلاؤ.... پھر ہمارے سر حاضر ہیں' لاٹھیاں برساؤ.... پھر ہم حاضر ہیں کہ دار و رسن کے حربے ہم پر آزماؤ۔ اس ابتلاء اور امتحان میں ڈٹے رہنا ہے' پیچھے نہیں ہٹنا ہے' کھڑے رہنا ہے۔ اس موقع پر محمد رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کو یاد رکھنا ہے جو آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو دیا تھا کہ تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہو تو لیٹ جاؤ' مکہ کی گرم اور سنگلاخ زمین پر تمہیں جانور کی طرح گلے میں رسی ڈال کر پیٹھ کے بل گھسیٹا جا رہا ہو تو اُف نہ کرو' ہاتھ مت اُٹھاؤ' تمہیں ابھی جوابی کارروائی کی اجازت نہیں ہے ـــــ موجودہ دور میں اسلامی انقلاب کا یہی صحیح راستہ ہے اور یہی "صبر محض" اور "پُر تحمل مزاحمت" ہے۔

احادیثِ شریفہ اور فریضہ نہی عن المنکر

قرآن کی طرح احادیث رسول ﷺ میں بھی اس مسئلے پر راہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔ صحیح مسلم کی دو حدیثیں پیش ہیں۔ ان پر غور کریں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس ضمن میں ہمیں کامل رہنمائی دے گئے ہیں' ہمیں اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں چھوڑ گئے۔ مکان و زمان کے فرق کو ملحوظ رکھ کر حضور ﷺ کے ان ارشادات سے مختلف مراحل کے لئے ہدایت و رہنمائی اخذ کی جا سکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نیتیں خراب ہوں' عافیت مطلوب ہو' صرف کھانا کمانا پیش نظر ہو' بچوں کی پرورش اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلانا ہی زندگی کا مقصود بن گیا ہو تو محرومی ہے....

لیکن اگر وفاداری اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول محمد ﷺ کے ساتھ ہے' جیسے علامہ اقبال مرحوم نے کہا ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

تو واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی وفاداری اور اس کے رسول ﷺ کی وفاداری آسان کام نہیں ہے۔ اس کیلئے ارادہ پیدا ہو جائے تو جمود و تعطل توڑ کر میدان میں آنا پڑے گا۔

پہلی حدیث کے راوی حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس روایت میں اختصار وایجاز ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ ' فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ' فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ' وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ))

"تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے زورِ بازو سے بدل دے۔ اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (اسے بُرا کہے اور اسے بدلنے کی کوشش کرے) اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اسے بُرا جانے اور اس پر دلی کرب محسوس کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"

اس کی ہم مضمون دوسری روایت کے آخری ٹکڑے میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ ((وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) گویا ان تین حالتوں میں سے اگر کوئی بھی نہیں ہے تو ایسا شخص جان لے کہ اس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان موجود نہیں ہے۔

اب خاص طور پر دیکھئے کہ اس حدیث میں امربالمعروف کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ وہ حکم اپنی جگہ قرآن مجید میں ہے' اس کی نفی مقصود نہیں ہے۔ البتہ اس حدیث میں سارا زور نہی عن المنکر پر ہے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد مبارک کا اسلوب دیکھئے' فرمایا کہ ((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ)) جو شخص بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے اس پر لازم ہے کہ اسے ہاتھ سے روکے۔ اس لئے کہ یہ صیغہ امر ہے' جو وجوب کیلئے آتا ہے۔ فرمایا ((فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ)) اگر طاقت سے روکنے کی

استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے۔ کہے تو سہی کہ اللہ کے بندو! باز آ جاؤ' اس راستہ پر مت جاؤ' یہ حرام کا راستہ ہے' یہ اللہ کی نافرمانی کا راستہ ہے' یہ شیطان کا راستہ ہے' یہ طاغوت کا راستہ ہے۔ زبان سے کہے۔ ((فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ)) اگر یہ بھی نہیں کر سکتا' اتنا بھی دم نہیں' اتنی بھی استطاعت نہیں ہے یا زبانوں پر تالے ڈال دیئے گئے ہیں تو دل میں بدی کے خلاف شدید نفرت تو رکھے۔ اس پر دل میں گھٹن اور کڑھن تو محسوس کرے۔ فرمایا : ((وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) اور یہ یعنی صرف دل سے بُرا جاننا' دل میں برائیوں پر کرب محسوس کرنا ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ عربی زبان میں "اَضْعَفُ" "Superlative Degree" ہے۔ اس سے آگے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اگر دل میں نفرت بھی نہ رہے تو گویا ایمان ہی گیا۔ پھر وہی بات ہوگی جو اقبال نے کہی ہے کہ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جب یہ احساس بھی ختم ہو گیا تو جان لیجئے کہ دل والا حقیقی ایمان بالکل رخصت ہو گیا!

اس حدیث کے مفہوم کے ضمن میں البتہ ایک احتیاط پیش نظر رکھنی اشد ضروری ہے' لوگ عام طور پر غور نہیں کرتے۔ اس حدیث میں جو تین مدارج بیان کئے گئے ہیں وہ اس اعتبار سے نہیں ہیں کہ جو شخص نیچے کھڑا ہے وہ نیچے ہی کھڑا رہے' اور جو شخص درمیانی درجہ میں ہے وہ وہیں رہے۔ بلکہ ایسے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ مسلسل کوشش کرے کہ اگر آج طاقت حاصل نہیں ہے کہ منکر کو طاقت سے روک سکے تو طاقت حاصل کرے۔ وہ جو علامہ نے کہا ہے ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے!

اگر آپ نہی عن المنکر اعلیٰ اور بلند ترین سطح پر کرنا چاہتے ہیں تو وہ طاقت کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ چنانچہ اگر طاقت موجود نہیں ہے تو طاقت فراہم کیجئے۔ اس طاقت و قوت کو فراہم کرنے کی سعی و جہد کرنا بھی فرض کے درجہ میں ہو گا۔ لیکن اگر کوشش کے باوجود اتنی جمعیت فراہم نہیں ہو پا رہی کہ منکرات کے خلاف منظم اور پُرامن طور پر طاقت کا

مظاہرہ کیا جا سکے تو بہرحال اُس وقت تک زبان سے منکر کو منکر کہنا اور اس کے خلاف زبان سے جہاد کرنا لازم ہے۔ اگر اس کا بھی امکان نہیں ہے تو دل سے نفرت کرنا لازم ہے۔ لیکن یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ انسان نچلی منزل پر قانع ہو کر بیٹھ جائے۔ اس لئے کہ یہ وہ نازک ترین مقام ہے کہ اگر ذرا سی بھی چوک ہو گئی اور کسی منکر کے خلاف دل میں نفرت' کراہت اور کرب کے جذبات پیدا نہیں ہوئے تو ایمان کے لالے پڑ جائیں گے۔ یہ تو وہ آخری حد ہے کہ جس سے باہر قدم نکلتے ہی انسان ایمان کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔

اس حدیثِ مبارکہ کے اسلوب پر غور و تدبّر سے یہ لازمی تقاضا سامنے آتا ہے کہ منکر کو مٹانا' اسے بُرا کہنا اور اسے بُرا سمجھ کر اس سے نفرت کرنا ہر مسلمان پر واجب اور فرض ہے۔ سب سے نچلے درجے پر ہرگز قانع نہیں ہونا چاہیئے' بلکہ لازم ہے کہ طاقت حاصل کرنے اور جمعیت فراہم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشش کی جائے۔ لوگوں کو تیار کیا جائے کہ منکرات کو مٹانے اور بدلنے کیلئے اپنی جانیں تک دینے کیلئے آمادہ ہوں۔ جب تک طاقت حاصل نہ ہو زبان سے بھی منکر کو منکر کہنے کا عمل جاری رہے۔ صاحبانِ اقتدار کو نرم و گرم طور پر اس طرف متوجہ کیا جاتا رہے۔ اِس دوران دل میں منکرات کے خلاف نفرت پروان چڑھتی رہے تاکہ جب ان کو طاقت و قوت کے ساتھ بدلنے کا مرحلہ آئے تو جذبات میں منکرات کے خلاف جوش و خروش کا طوفان موجزن ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مسلمان ماحول کے رنگ میں رنگا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ دل کی نفرت کم ہو اور پھر ماحول اس پر چھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کل وہ جس کام کو بُرا کہہ رہا تھا اور بُرا سمجھ رہا تھا آج وہ خود اس میں ملوث ہو جائے۔

علماءِ بنی اسرائیل کی اس روش کا تذکرہ حدیث میں ملتا ہے۔ ارشاد رسالت مآب ﷺ کا مفہوم یہ ہے کہ یہود کے عالموں کا سب سے بڑا جرم ہی یہ تھا کہ جب ان کے اُمراء نے غلط کام کرنے شروع کئے تو ابتداء میں تو علماء نے ان کو ٹوکا کہ شریعت کی رو سے یہ بُرا اور غلط کام ہے' لیکن ان کے ساتھ مجلسی تعلق بھی قائم رکھا اور ان کے ساتھ کھانا پینا ترک نہیں کیا۔ ان امراء کے دستر خوان کی لذتیں ان کو کھینچ کھینچ کر بلاتی

رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ بھی اسی رنگ میں رنگے گئے۔ درحقیقت جب تک انسان ایسے لوگوں کے ساتھ مقاطعہ کی روش اختیار نہ کرے۔ اُس وقت تک نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں پاسکے گا۔ اس بات کا اقرار ہم روزانہ دعائے قنوت میں بایں الفاظ کرتے ہیں "نَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ" یعنی اے اللہ جو بھی تیرا نافرمان ہوگا اور فاجر و فاسق ہوگا ہم اس سے قطع تعلق کریں گے۔ اسے ہم چھوڑ دیں گے' اس کے ساتھ ہم دلی محبت کا کوئی رشتہ استوار نہیں کریں گے۔

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اگر کوئی شخص کسی فاسق کے ساتھ چلتا ہے تاکہ اسے تقویت پہنچائے تو اللہ کے غضب کی وجہ سے عرشِ الٰہی کانپنے لگتا ہے"۔

صحیح مسلم کی دوسری حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ فقہ جسے آج ہم فقہ حنفی کے نام سے جانتے ہیں سلف میں فقہ ابن مسعودؓ کہلاتی تھی۔ اس لئے کہ اس کے اصل بانی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے جن کا شمار کبار صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا۔ وہ کوفہ میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے شاگرد کے شاگرد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اس حدیث میں نہی المنکر کے فریضہ کی انجام دہی کے مسئلہ کو نہایت تشریح اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِي اُمَّةٍ قَبْلِي اِلاَّ كَانَ لَهُ مِنْ اُمَّتِهِ حَوَارِيُّونَ وَاَصْحَابٌ يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهِ ' ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوفٌ يَقُولُونَ مَا لاَ يَفْعَلُونَ' وَيَفْعَلُونَ مَا لاَ يُؤْمَرُوْنَ' فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ' وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی اُمت میں کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے بعد اس کی اُمت میں اس کے حواریوں

میں کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے بعد اس کی اُمت میں اس کے حواریوں اور اصحاب نے اس کی سنت کو قائم نہ کیا ہو اور اس کے احکام کی پیروی نہ کی ہو۔ پھر ان کے بعد ان کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے ہیں جن کے قول اور فعل میں تضاد ہوتا ہے اور وہ ایسے کام کرتے ہیں جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا۔ پس اور جو ان کے خلاف ہاتھ (قوت) سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں انہیں بُرا سمجھے) وہ مؤمن ہے۔ مگر اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے"۔

گویا ایسا ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ نبی اور اس کے حواریوں اور اصحاب کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ انحطاط، اضمحلال اور زوال شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں تین ادوار ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے خیر قرون سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ۔ تابعین کا زمانہ اور پھر تبع تابعین کا زمانہ۔ ایسے ادوار کے گزرنے کے بعد انحطاط و اضمحلال اور زوال کی صورت شروع ہوتی ہے۔ بعد میں آنے والوں کے قول و عمل میں تضاد ہوتا تھا۔ یعنی کہہ کچھ رہے ہیں، کر کچھ رہے ہیں۔ زبان پر اسلام کا اقرار ہے، اس کی مداح سرائی ہے، جبکہ عمل میں اسلام اور اس کے شعائر سے بغاوت ہے، سرکشی ہے، اعراض ہے، روگردانی ہے۔ پھر ان کے افعال و اعمال ایسے ہوتے تھے جن کا کوئی حکم، جن کی کوئی سند ان کے دین میں موجود نہیں ہوتی تھی۔

حدیث کے آخر میں ایمان کے جو درجات بیان کئے گئے ہیں ان سے ناخلف طبقہ کے خلاف اقدام سے، جو عموماً مسند اقتدار پر متمکن ہوتا ہے، نہایت گہرا تعلق ہے۔ اس حصہ سے ہمیں اقدام کے لئے ہدایت و رہنمائی ملتی ہے۔ دل سے جہاد کا مفہوم یہ ہے کہ منکرات اور ان کے فروغ کو دیکھ کر ایک بندۂ مومن دل کی بے کلی میں مبتلا ہو جائے، وہ ہر وقت کڑھے، اس کی نیندیں حرام ہو جائیں، وہ اپنی بے بسی پر بے قرار اور مضطرب رہے، اس کے دل میں نفرت پروان چڑھتی رہے اور اس کا دل اُس وقت کی جلد آمد کے لئے بے چین رہے کہ جس وقت وہ ایک منظم اسلامی انقلابی جماعت کے

ساتھ مل کر نہی عن المنکر کے لئے میدان میں آسکے اور اپنے جسم و جان اور مال و منال کی قربانی کا نذرانہ پیش کر سکے۔ یا اگر اس میں صلاحیت و اہلیت ہے تو وہ خود کھڑا ہو اور ایسی انقلابی جماعت قائم کرنے کی سعی و جہد کرے۔

اس حدیث کا آخری حصہ جس کا حوالہ اوپر حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ والی حدیث میں دیا گیا' نہایت لرزا دینے والا ہے۔ اس کو سن کر دن کا چین اور رات کا آرام حرام ہو جانا چاہیئے۔ اس لئے کہ ایسے شخص کے ایمان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفی فرما رہے ہیں جس کا دل بھی منکرات اور ان کے فروغ کو دیکھ کر بے قرار' مضطر اور بے کل نہیں ہوتا۔ ایسے شخص کے بارے میں کونین کے مفتی اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ آخرت میں وہ لوگ کس مقام پر کھڑے ہوں گے جو اس دنیا میں قانوناً مسلمان اور مدّعیٔ ایمان تھے اور مسندِ اقتدار پر بیٹھے منکرات کو فروغ دے رہے تھے۔ ان مدعیانِ ایمان کا کیا حال ہو گا جو ذرائع ابلاغ پر قابض تھے اور ان کو منکرات کی نشرواشاعت کے لئے استعمال کر رہے تھے؟ وہ لوگ کس حالت اور عالم میں ہوں گے جو حکمرانی کے بل بوتے پر منکرات کی سرپرستی کر رہے تھے اور ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کرنے کے باعث بن رہے تھے جس میں معروفات سسک رہے تھے اور منکرات کے فروغ کے باعث معاشرہ سنڈاس بن رہا تھا۔

سورۃ الاعراف میں مذکور اصحابِ سبت کے واقعہ سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ جب کسی قوم کی بداعمالیوں کے باعث ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے تو اس سے صرف وہ لوگ بچ پاتے ہیں جو دوسروں کو بداعمالیوں سے روکتے رہتے ہیں۔ اس حقیقت کو نبی اکرمؐ نے ایک تمثیل کے انداز میں بیان فرمایا ہے کہ ایک جہاز میں کچھ لوگ عرشہ پر سوار ہیں' کچھ لوگ نیچے ہیں یعنی نچلی منزل میں ہیں۔ نیچے والوں کو جب پانی لینا ہوتا ہے تب وہ اوپر آتے ہیں۔ اب جو لوگ عرشہ پر مقیم ہیں ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ پانی برتنوں سے چھلک بھی جاتا ہو گا۔ عرشہ والے ان لوگوں کے اوپر آنے جانے پر ناک بھوں چڑھاتے ہوں گے۔ نیچے والوں نے سوچا کہ اوپر سے پانی لانے کے کام کو چھوڑو' ہم ان

کو کیوں ناراض کریں، ہم نیچے جہاز کے پیندے میں سوراخ کر لیتے ہیں، یہیں سے پانی لے لیا کریں گے۔ اب اگر اوپر والے ان نیچے والوں کا ہاتھ نہیں پکڑ لیتے تو جہاز ڈوب جائے گا اور اس طرح صرف نیچے والے ہی نہیں، اُوپر والے بھی ڈوبیں گے۔ گویا جو لوگ غلط کام اور بدی سے روکتے نہیں ہیں انجام کار کے اعتبار سے وہ ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں جو بدی میں خود ملوث ہیں۔ اس مثال سے بھی واضح ہوا کہ اصل میں نہی عن المنکر ہی وہ شے ہے جو انسان کو نجات کا حق دار بناتی ہے۔

خلاصہ بحث

مسلم شریف کی متذکرہ بالا جو دو روایتیں تشریح و توضیح کے ساتھ بیان ہوئیں، ان کو سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ ان دونوں احادیث کو ہمارے پیشِ نظر مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کلید کی حیثیت حاصل ہے۔ اب راستہ یہ ہے کہ کسی مسلمان ملک میں دین کو اس کی کامل شکل میں قائم و نافذ کرنے کے لئے کوئی تحریک اُٹھے۔ اس تحریک کے وابستگان خود اپنی انفرادی زندگیوں پر دین کو نافذ کر چکے ہوں، تربیت اور تزکیہ کے مراحل طے کر چکے ہوں، انہوں نے حرام کو بالفعل ترک کیا ہو اور سُنّت کو انہوں نے عملاً اختیار کیا ہو۔ پھر یہ لوگ منظم ہوئے ہوں، بنیانِ مرصوص بن چکے ہوں، یہ کسی تنظیم کے ساتھ منسلک ہو کر اس کے امیر، کمانڈر اور قائد کے حکم پر ڈسپلن کے ساتھ حرکت کرنے کی صلاحیت پیدا کر چکے ہوں، سمع و طاعت کے عادی ہو چکے ہوں۔ تو اب یہ لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام طاقت کے ساتھ کریں گے۔ یہ کھڑے ہو جائیں گے اور اعلان کریں گے کہ ہم منکرات کے کام نہیں ہونے دیں گے۔ یہ بات جان لیجئے کہ اپنے مطالبات منوانے کے لئے پُرامن طور پر قوت کا مظاہرہ کرنا اب دنیا میں ہر ملک کے رہنے والوں کا تسلیم شدہ حق ہے۔ اگر سیاسی حقوق کے حصول اور بحالی کے لئے، مہنگائی کے خلاف یا کچھ دیگر قومی مسائل کے حل کے لئے مظاہرے کئے جا سکتے ہیں، پکٹنگ اور گھیراؤ کیا جا سکتا ہے تو دین نے جن کاموں کو منکرات قرار دیا ہے ان کے خلاف مظاہرے کیوں نہیں کئے جا سکتے؟ ان کو چیلنج کیوں نہیں کیا سکتا؟ لیکن یہ مظاہرے پُرامن ہوں گے۔ کہیں فساد نہیں ہو گا، کسی کو تکلیف نہیں ہو گی، قومی دولت

کا کوئی ضیاع نہیں ہو گا۔ اس تنظیم کے وابستگان ساری تکلیفیں اپنے اوپر جھیلنے کے لئے تیار ہوں گے' ساری مصیبتیں خود برداشت کریں گے' اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکلیں گے۔ اگر حکومت وقت گولیاں چلائے گی تو اپنے سینے پیش کریں گے۔

اگر یہ معاملہ ہو جائے اور یہ مرحلہ آجائے تو یہ بات جان لیجئے کہ آخر کب تک۔ اس مسلمان ملک کی مسلمان پولیس ان پر لاٹھیاں برسائے گی اور مسلمان فوج کب تک گولیاں چلا کر ان نہتے مظاہرین کو مارے گی جو صرف اللہ کے لئے منکرات کے خلاف نکلے ہوں؟ پھر یہ فوج کتنوں کو مارے گی....؟ یہ بات بھی اچھی طرح جان لیجئے کہ کوئی جابر سے جابر حکمران بھی ایک حد سے آگے نہیں جا سکتا۔

ایران کی مثال

اس کا سب سے بڑا نمونہ ہمارے سامنے شہنشاہِ ایران کا انجام ہے۔ وہ شاہِ ایران جس کے پاس ایشیا کا سب سے بڑا اسلحہ خانہ تھا' جس کے پاس ساوک جیسی سفاک پولیس تھی' جس کے مقابلہ کی سفاک پولیس کسی کمیونسٹ ملک میں تو شاید موجود ہو۔ باقی دنیا میں اس کے مقابلے کی کوئی پولیس موجود نہیں۔ جس طرح کے مظالم اس ایرانی پولیس نے ڈھائے ہیں اور جس خوفناک قسم کی اذیتیں اس نے انقلابیوں کو دی ہیں' اس کی مثال موجودہ دور کے کسی ملک میں مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن شہنشاہ ایران' جو خود کو "آریہ مہر" کہلواتا تھا اور جو سائرس ثانی بننے کے خواب دیکھ رہا تھا' اس کی ساری طاقت اور سارا دبدبہ ان سرفروشوں کی قربانیوں کے آگے خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رہ گیا جو اس کے خلاف مظاہروں کی صورت میں جان دینے کیلئے سڑکوں پر آ گئے تھے۔ بالآخر اس کی پولیس عاجز آ گئی اور فوج نے ان مظاہرین پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کو اپنا ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا اور حد تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد اسے اپنے وطن میں دفن ہونے کیلئے جگہ بھی نہ مل سکی۔ اس کے دوست ملک نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کسی مہلک متعدی مرض میں مبتلا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جب ایک منظم انقلابی جماعت راہِ حق میں جان دینے کے لئے آمادہ ہو جائے تو اسے ملک کے عوام کی اتنی اخلاقی اور عملی حمایت حاصل

ہو جاتی ہے کہ پھر اسے کچلنا اور ختم کر دینا آسان نہیں رہتا۔ ایسی جماعت کو بغاوت کا اعلان کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی' نہ اسے ہتھیار اُٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے' بلکہ اس کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ ؎

"جب وقت شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں"

کوئی طاقت ایسے جانبازوں اور سرفروشوں کا راستہ نہیں روک سکتی۔

تین ممکنہ نتائج

اس طریق کار کے تین ممکنہ نتائج نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت اگر ان مظاہروں کے نتیجہ میں پسپائی اختیار کرے' یعنی منکرات کو ختم کرنا شروع کر دے تو اور کیا چاہیئے؟ ایک منکر کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے منکر کے خلاف مظاہرے جاری رہیں گے۔ اس طرح اگر ہم ایک ایک کر کے منکرات کو ختم کراتے چلے جائیں تو اسلامی انقلاب آ جائے گا۔ تبدیلی برپا ہو جائے گی اور پورے کا پورا نظام صحیح ہو جائے گا۔ لیکن جب تک نظام مکمل طور پر اسلامی نہیں ہو گا یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

دوسرا ممکن نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ حکومت وقت اسے اپنی بقاء' اپنی انا اور اپنے مفادات کے تحفظ کا مسئلہ بنا لے اور طاقت سے اس اسلامی تحریک کو کچلنے کی کوشش کرے۔ اس موقع پر ذرا ٹھہر کر حکومت وقت کی ماہیت وہیئت کو سمجھ لیجئے کہ وہ کیا ہوتی ہے۔ ہر حکومت کسی نہ کسی طبقہ کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کے کسی طاقتور طبقہ کے مفادات کی محافظ بن کر بیٹھی ہوتی ہے۔ اسلام کا نظامِ عدل و قسط ان طبقات کے لئے پیغامِ موت لے کر آتا ہے۔ لہٰذا حکومت وقت کسی ایسی تحریک کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتی جس کے کامیاب ہونے کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ استحصالی نظام ختم ہو جائے اور اسلام کا عادلانہ و منصفانہ نظام قائم ہو جائے۔ لہٰذا وہ ریاست کی پولیس اور فوج کو اس تحریک کو کچلنے کے لئے بے دریغ استعمال کرے گی۔ چنانچہ لاٹھیاں برسیں گی' آنسو گیس کے شیل پھینکے جائیں گے' گولیوں کی بوچھاڑ آئے گی' گرفتاریاں ہوں گی' دارورسن کے مراحل آئیں گے۔ لیکن

اگر لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں حتیٰ کہ جان تک دینے پر تیار ہوں اور ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہیں تو پولیس کتنوں کو گرفتار کرے گی؟ فوج کتنوں کو اپنی گولیوں سے بھونے گی؟ اگر تحریک کے کارکنوں نے صبر و استقامت کا ثبوت دیا تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بالآخر پولیس اور فوج جواب دے دے گی کہ یہ مظاہرین ہمارے ہی ہم مذہب اور ہم وطن ہیں' ہمارے ہی اعزہ و اقرباء ہیں' یہ لوگ اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے میدان میں نہیں آئے ہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے قیام کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے نکلے ہیں' تو آخر ہم کب تک ان کو اپنی گولیوں سے بھونتے چلے جائیں؟ نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کا تختہ اُلٹ جائے گا اور تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو گی' جیسا کہ ایران میں ہوا کہ شہنشاہ ایران جیسے آمر مطلق کو بھی ایسی صورت حال میں باحسرت ویاس ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا ـــــ تو یہ دو ممکنہ صورتیں تو تحریک کی کامیابی کی ہیں۔

ایک تیسرا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ حکومت وقت اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس صورت میں جن لوگوں نے اس راہ میں جانیں دی ہوں گی' ان کی قربانیاں ہرگز ضائع نہیں ہوں گی۔ وہ' ان شاء اللہ العزیز' اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر عظیم اور فوز کبیر سے نوازے جائیں گے۔ یہ واضح رہنا چاہیئے کہ ہم نظام کو بالفعل بدلنے کے مُکلف اور ذمہ دار نہیں ہیں' البتہ اس کو بدلنے کی جدوجہد ہم پر فرض ہے۔ مزید برآں انہی جان نثاروں اور سرفروشوں کے خون اور ہڈیوں کی کھاد سے' ان شاء اللہ' جلد یا بدیر کوئی نئی انقلابی اسلامی تحریک ابھرے گی جو طاغوتی استحصالی اور جابرانہ نظام کو للکارے گی اور اس طرح وہ وقت آ کر رہے گا جس کی خبر الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین اسی طرح غالب ہو کر رہے گا جس طرح آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

تنظیمِ اسلامی کا پیغام　　　　　　　　نظام خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے

نہ معروف معنی میں کوئی سیاسی جماعت

بلکہ ایک

اصولی اسلامی انقلابی جماعت ہے

جو سب سے پہلے پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

اسلام کے عادلانہ نظام یعنی نظامِ خلافت کو

قائم اور غالب کرنا چاہتی ہے

امیر: **حافظ عاکف سعید**